ماہ و روز

روزنامچہ سفرِ روس

حکیم محمد سعید

ماہ و روز

روزنامچۂ سفرِ روس

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حکیم محمد سعید

ہمدرد اکیڈمی، پاکستان

مولف : حکیم محمد سعید

ناشر : ہمدرد اکیڈمی
ہمدرد فاؤنڈیشن، پاکستان
کراچی - ۱۸

طابع : ٹیکنیکل پرنٹرز-کراچی - ۱

سن اشاعت : اپریل ۱۹۸۰ء

پہلا ایڈیشن : دو ہزار

قیمت : مبلغ پینتیس روپے

ہمدرد اکیڈمی

نوجوانان اسلام کے نام

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد ہے کہ حکمت مومن کی متاع گم شدہ ہے، وہ جہاں بھی ملے اس کو لے لینا چاہئے۔ ہمارے عظیم اسلاف کا شعار بھی یہی رہا ہے کہ وہ ہر اچھی بات کو اخذ و قبول کر لیتے تھے اور ہر اس بات کو چھوڑ دیتے تھے، جو ہمارے اصولوں سے ٹکراتی ہو۔

"خذ ما صفا و دع ما کدر" ان کا اصول تھا۔

ہمارے نوجوانوں کو بھی پوری وسعت قلب اور کشادگی' ذہن مگر احتیاط کے ساتھ اپنے دور کا اور اس میں کارفرما مختلف و متضاد قوتوں کا مطالعہ و تجزیہ کرنا چاہئے اور اپنے ملک کے لیئے متوازن راہ نکالنی چاہئے۔

عالم اسلام کا مستقبل نوجوانان اسلام ہی سے وابستہ ہے ۔

حکیم محمد سعید

عنوانات

—:o:—

غلط نامه

صفحه نمبر	سطر	غلط	صحیح
۲۶۳	۲۰	''روس نامه''	''ماه و روز''
۲۷۲	۲	مسعود	مسرور
۲۹۶	۲۰	''روس نامه''	''ماه و روز''
۳۲۰	۸	زندکی	زندگی
۳۲۲	۵	طے	ته
۳۲۳	۱۷	تک	بهی

تاریخ و جغرافیۂ روس

روس کا سفر میں نے دو بار کیا هے - پهلا ۱۹۷۵ء میں که جب وهاں حضرت امیر خسرو دهلوی اور فارابی پر ماسکو اور الماعطا میں عالمی اجتماعات تهے - اس کا اجمالی ذکر اس سفر نامے میں آگیا هے - دوسرا سفر روس به سلسلهٔ ''کنگرس عالمی صدرالدین عینی،، ۱۴ اپریل ۱۹۷۸ء تا ۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء جاری رها - درحقیقت ''ماه و روز،، اسی سفر سے متعلق تاثرات پر مشتمل هے ، گو درمیان میں ضرورتاً اور اضطراراً ۱۹۷۵ء کے سفر کے تاثرات بهی آگئے هیں -

''ماه و روز،، پر جب میں نے طباعت کے بعد ایک نظر ڈالی تو ایک ضرورت یه محسوس هوئی که جس ملک کے سفر کے یه تاثرات هیں مختصراً اس کے تاریخی اور جغرافیائی حالات بهی شریک صفحات کردیئے جائیں تو مناسب هے -

روس کا نام لیتے هی ایک ایسی سرزمین کا نقشه ذهن میں آتا هے جو انیسویں صدی عیسوی سے یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک (مختصراً یو ایس ایس آر) اور پهر محض سوویت یونین کهلانے لگی هے - اس کی قدیم تاریخ دلچسپ هونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بهی هے کیونکه یه ایک مملکت نهیں ، کئی مملکتوں کا مجموعه هے - زمانهٔ تاریخ سے پهلے کی بات هے که هند یورپی اور کوه یورال الطائی کی قومیں نقل سکونت کرکے یهاں آئیں اور کچھ عرصے خانه بدوش ره کر مستقل طور پر آباد هوگئیں - یه دو هزار سال قبل مسیح؊ کا واقعه هے - ان کی نسلی حیثیت کا کوئی علم نهیں اور نه یه پته چلتا هے که ان کا شغل یا آبائی پیشه کیا تها - پهر ذرا بعد کے زمانے میں یونانی ، رومی اور ایرانی نسل کے کچھ باشندے اس علاقے میں آکر آباد هوئے جو اب یوکرین کهلاتا هے - اس وقت تجارت کرنے والی بعض سلطنتوں

نے اس علاقے کے شمالی جنگلات کا استحصال کیا ، خاص طور سے ان علاقوں کا جو دریائے وولگا سے ملحق تھے لیکن یہ تعلقات زیادہ عرصے تک اثر انداز نہ ھوسکے ۔

چوتھی اور نویں صدی عیسوی کے درمیان ھن ، آوار ، گوتھی اور میگیار نامی قومیں ان علاقوں سے گزریں لیکن ان کا تسلط بھی عارضی رہا ۔ مشرقی سلافی علاقے کے باشندے بھی کوئی دیرینہ اثر نہ ڈال سکے کیونکہ وہ بھی جم کر کسی ایک جگہ رھنا نہیں چاھتے تھے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ھے کہ ترک وطن کر کے آنے والوں میں سے سو فیصد افراد گزرتے چلے گئے ۔ ان میں سے کچھ نے وھیں ڈیرے ڈال دئے اور اس سرزمین کو اپنا ھی وطن سمجھنے لگے ۔ یہ بھی حقیقت ھے کہ ان سب کی آمد سے قبل کچھ لوگ یہاں آچکے تھے اور زیادہ تر مغربی علاقے میں آباد تھے ۔ انھوں نے نئے آبادکاروں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ آپس میں شیر و شکر ھوگئے ۔ باھمی میل جول نے جو نئی نسل پیدا کی ، اسی کو روسی کہا جانے لگا ۔ ماھرین لسانیات اس منزل میں خاموش ھیں کہ اس سرزمین کو روس اور یہاں کے باشندہ کو روسی کیوں کہا جاتا ھے ۔ محض روایتی طور پر قیاس آرائی کی گئی ھے کہ آنے والوں میں سے ایک گروہ کا سردار " رورک ،، کہلاتا تھا ۔ وہ ۸۶۲ء میں اس جگہ آباد ھوا جو اب " نووگورود ،، کہلاتا ھے ۔ شاید اسی کے نام کی رعایت سے اس سرزمین کا نام روس ھوا ھے ۔ لیکن یہ رائے بعید از قیاس کہی جاسکتی ھے ۔

ھر آبادی کا ایک سربراہ ھوتا تھا جسے سردار کہا جاسکتا ھے ۔ تاھم ساتویں صدی عیسوی میں ترکی سے آئے ھوئے خازار قبیلے کے افراد نے جنوبی حصۂ ملک میں ایک طاقتور سلطنت قائم کی اور پھر اگلی صدی میں مشرقی بلغاریہ سے آئے ھوئے لوگ اپنی الگ حکومت قائم کرکے رھنے لگے ۔ نویں صدی میں مشرقی حصے کے سلافی ، جنھیں بعض مورخین کے نزدیک روسیوں کے اجداد میں شمار کیا جاسکتا ھے ، یوکرین (چھوٹے روس) کے شمالی حصے میں اور بائیلورشیا (سفید روس) والے علاقوں میں قدم

جمانے کے ساتھ ساتھ سلطنت کی داغ بیل ڈال کر رھنے لگے ۔ تاھم عظیم سلطنت روس کا تصور اس وقت پیدا ھوا کہ جب اسی صدی کے دوران میں اسکنڈے نیویا کے تاجر اور سورما یہاں آئے اور منظم ھوکر حکومت کرنے لگے ۔

دسویں صدی عیسوی میں نصرانی مذھب کو فروغ حاصل ھوا ۔ فرمانروا آئیگور کی شریک حیات سنٹ اولگا اس تحریک کی روح رواں تھی ۔ پھر ۹۸۰ء سے ۱۰۱۵ء تک حکومت کرنے والے شاہ ولادیمر اول نے اسے سرکاری مذھب کی حیثیت سے اختیار کرلیا ۔ اس طرح بازنطینی ثقافت اپنا رنگ جمانے لگی ۔ اس کے بعد یاروسلاف عاقل کی حکومت ۱۰۱۸ء سے ۱۰۵۴ء تک قائم رھی جس نے خیوا کو اپنا صدر مقام بنایا ۔ تاھم اس علاقے کی خوشحالی ولادیمر دوم (۱۱۱۳ء تا ۱۱۲۵ء) اور مستی سلاف (۱۱۲۵ء تا ۱۱۳۲ء) کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ گئی ۔ بیشتر لوگ زراعت اور باغبانی میں مصروف رھے تاھم سمور ، چرم ، شہد اور موم کو بھی تجارتی اشیا میں شامل کرنا پڑا اور پھر یہ لوگ غلاموں کی تجارت بھی کرنے لگے ۔ وہ بہت ھی نفع بخش پیشہ بن گیا ۔

طویل جدوجہد کے بعد شہزادہ یوری ڈولگوروکی خیوا کا نواب بن گیا ۔ اس کا بیٹا آندرے گولیسکی ریاست کا وارث بنا جس نے ولادیمر نامی شہر کو اپنی ریاست کا صدر مقام بنا لیا ۔ بڑا حملہ ۱۲۳۷ء میں ھوا کہ جب منگولوں نے جن کو عام طور پر تاتاری کہا جاتا تھا ، اپنے سردار باتو خان کے زیر کمان یلغار کی اور ملک کے تمام شہروں کو برباد کر کے صرف نووگورود کو تباہ نہیں کیا ۔ جنوبی اور مشرقی روس میں انھوں نے اپنی سلطنت قائم کرلی جو ۱۴۸۰ء تک برقرار رھی ۔ مغربی حصۂ روس میں لتھوآنیا کے فرمانروا نے اپنا رنگ جمایا ۔ اس نے تمام بائیلورشیا اور یوکرین کا بڑا حصہ ھتھیا لیا ۔ آئیور اول کے عہد میں ماسکو کا علاقہ عروج پر آیا ۔ اگرچہ یہ فرمانروا تاتار کے تاجداروں کو خراج ادا کرتا تھا لیکن اپنے آپ کو خود مختار فرمانروا سمجھتا تھا ۔

بہت عرصے بعد ۱۵۳۳ء میں آئیوان چہارم سریر آرائے سلطنت

ہوا - اس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو زار روس کہلوایا - اس نے کازان اور استرا خان کی ریاستیں فتح کرلیں اور اپنی سلطنت کو پھیلا دیا - ۱۵۸۲ء میں قازق یرماک نے سبر کی ریاست روسی علاقے میں ملا لی اور پھر قازق بڑھ کر سائبیریا تک پہنچ گئے - اٹھارھویں صدی کے شروع میں قازق افواج بحرالکاہل کے ساحل تک پہنچ گئیں - اس طرح کریمیا کے تاتاریوں سے اپنی سرحدوں کو محفوظ کرلیا - اندرون ملک بعض سرداروں نے ھنگامہ آرائی کی تو ان کو کچل کر رکھ دیا - ۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہوگیا - اس وقت پولینڈ کے سگسمند سوم نے یہ علاقے فتح کرلینے کی کوشش کی بلکہ ماسکو پر قبضہ بھی کرلیا - تاھم ۱۶۱۲ء میں شہزادہ پوژارسکی کے زیر کمان عوامی فوج نے بیرونی حملہ آوروں کو مار بھگایا - اس نے مقبول عام اسمبلی کی بنیاد رکھی جس نے میکائیل رومانوف کو زار روس کے منصب پر فائز کردیا - اس طرح خانوادہ رومانوف کی داغ بیل پڑی - اس کی حکومت ۱۹۱۷ء تک قائم رہی -

روس میں ۱۶۴۵ء سے ۱۶۷۶ء تک زار الیکسی نامی فرمانروا کا عہد بڑی اھمیت رکھتا ہے - اس زمانے میں جدید وضع کی روسی حکومت قائم ہوئی - اس نے پولینڈ سے مشرقی یوکرین کا علاقہ واپس لے لیا - اگرچہ ثقافتی اور نظریاتی اعتبار سے لوگ عہد وسطیٰ کے علمبردار تھے تاھم یورپ کی جمعیت اقوام میں اسے ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا - اقتصادی حالت تو مغربی یورپ سے صدیوں پیچھے رہی لیکن سیاسی سطح پر اس کا درجہ بلند ہوگیا - پیٹر اول نے جسے پیٹر اعظم بھی کہا جاتا ہے ، سیاسی اعتبار سے روس میں ایک انقلاب رونما کردیا - بہت سی اصلاحات کے ذریعے اسے یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کے برابر کردیا - اس نے بحری افواج کی داغ بیل ڈالی اور بری فوج کو جدید سامان حرب سے لیس کردیا - لیکن اس کے ساتھ ھی مذھبی تصورات کو مٹانے کے لیے اس نے کلیسا کے نظام کو شہنشاہ کے زیرنگیں کردیا - اس نے انتظامی اور مالیاتی قاعدے بھی تبدیل کئے اور ملک میں مختلف صنعتوں کو اتنی ترقی دی کہ عوام کی مالی حالت سدھر گئی - تعلیمی

معیار بھی بلند ہوگیا - اس نے ایک نئے علاقے کو اپنا صدر مقام بنایا جس کا نام پیٹرز برگ رکھا جو اب لینن گراد کہلاتا ہے - اس نے بحیرۂ اسود تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنی فوج دھکیلنی شروع کی اور آزوف ھتھیا لیا - دوسری طرف اس نے آبنائے بیرنگ کے ذریعے ایلاسکا تک رسائی حاصل کی اور جلدی ھی اپنی نوآبادی وھاں قائم کردی -

دو صدیوں تک روسی اور ترکی فوجوں میں معرکہ آرائی رہی - زیادہ نقصان سلطنت عثمانیہ کو پہنچا - اس طرح روس کو یورپ کے معاملات کو سمجھنے اور ان میں دخل دینے کا موقع ملا اور وہ ایک عظیم طاقت بن گیا - پھر ھفت سالہ جنگ میں ملکہ الزبتھ نے بڑی کامیابی کے ساتھ پروشیا کے خلاف روس کی حمایت کی لیکن پیٹر سوم تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا دامن لڑائی سے چھڑا لیا - ۱۷۶۳ء میں اچانک اس کی وفات ہوگئی - اس کی ملکہ نے کیتھرین دوم کے نام سے سلطنت کے اختیارات سنبھال لیے - اس ملکہ کی انتظامی اصلاحات بھی بڑی معرکہ آرا رھیں - روس کو ترقی ہوتی گئی - تاھم ملک کی خود سری اور مطلق العنانی نے ادیبوں ، شاعروں اور سائنسدانوں کو ناراض کردیا - انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لوگوں نے باغیانہ سرکشی کے مظاھرے کئے جن کے باعث معاشرتی اصلاحات جن کا سلسلہ ھنوز جاری تھا ، خاک میں مل گئیں اور جب فرانسیسی انقلاب کے سلسلے میں لڑائی شروع ہوئی تو روس بھی اس میں ملوث ہوگیا جو غیردانش مندانہ قدم تھا - فرانس سے صلح تو ہوگئی مگر زبردست نقصان پہنچا - اس کے برعکس ترکی اور ایران سے لڑائی چھڑنے پر روس کو فائدہ ہوا - معاھدۂ بخارسٹ کے ذریعہ اس نے بیس اربیا اور معاھدۂ گلستان کے ذریعہ کاکیشیا (قاف) کے علاقے حاصل کرلئے -

۱۸۱۲ء میں نپولین نے روس کے خلاف معرکہ آرائی کی اور ماسکو تک اس کی فوجیں بڑھ گئیں - اس سال موسم سرما کی بے پناہ شدت نے اس کی فوج کا برا حال کردیا اور اسے سخت ھزیمت کے ساتھ پسپا ہونا پڑا - نپولین کے زوال نے روس اور آسٹریا کو نئی

سرے سے ابھرنے کا موقع دیا ۔ ایک بار پھر براعظم کی بڑی طاقتوں میں ان کا شمار ہونے لگا ۔ اب روس میں نکولس اول کی حکومت تھی ۔ اس نے یورپ کے لیے سراغرسانی کے فرائض انجام دینے شروع کئے ۔ یہ حکمت عملی مناسب نہیں تھی ۔ سلطنت عثمانیہ کے ضمن میں روس اور مغربی طاقتوں کے مفادات پر نزاع ہوگیا جس کے نتیجے میں جنگ کریمیا چھڑی ۔ اس وقت روس کی اندرونی طاقت کا بھرم جاتا رہا ، کیونکہ اس میں کھوکھلا پن شروع ہوگیا تھا ۔

۱۸۵۵ء میں فراخدل فرمانروا الیکزنڈر دوم برسراقتدار آیا ۔ اس نے مزدور طبقے کے افراد کو مراعات دینی چاہیں لیکن حزب اختلاف نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ الیکزنڈر سوم نے صلح جوئی کی حکمت عملی مناسب سمجھی لیکن اسے جلد معزول کردیا گیا ۔ اس کے بعد روس کا آخری شہنشاہ نکولس دوم تخت نشین ہوا ۔ بعض ہنگامہ آرا جماعتوں نے اس پر غلبہ حاصل کرلیا ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ بہت جلد ۱۹۰۵ء میں روسی انقلاب رونما ہوا جس نے ملک میں شہنشاہیت کو ہمیشہ کے لئے دفن کردیا ۔ اس انقلاب کے روح رواں لینن تھے جن کو ملک کے بیشتر افراد خدائے روس کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

روس پر ایک قابل اعتماد تصنیف جان گنتھر کی ہے جنہوں نے ۱۹۵٦ء میں روس کا سفر کیا تھا ۔ بہت سی پابندیوں کے باوجود انہوں نے دلچسپ حقائق اور اعداد و شمار جمع کئے ۔ ان کے بیان کے مطابق ۱۹۳۹ء کے بعد یکم اپریل ۱۹۵٦ء کو مردم شماری ہوئی تو ملک کی کل آبادی ۲۰ کروڑ ۲ لاکھ تھی۔ اس میں ۱۱ کروڑ ۷۰ لاکھ مزدور اور ۸ کروڑ ۳۰ لاکھ کاشتکار تھے۔ عقائد کے لحاظ سے مسلمانوں کی تعداد ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی اور یہودی بھی اتنے ہی تھے ۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کی طاقت وہاں دنیا بھر کے اسلامی ملکوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ استوار تھی ۔ وہاں کے مسلمان مصر ، دنیائے عرب اور مشرقی وسطیٰ سے شائع ہونے والی تمام ادبی اور مذہبی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کرلیتے تھے ۔ قرآن پاک کے متعدد ترجمے مل سکتے تھے۔

مسلمان شراب نوشی سے احتراز کرتے تھے ۔ عام مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں سے ثقافتی رشتے قائم کرنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے ۔ مسلمان خواتین برقع پوش ہوکر باہر نکلتی تھیں ۔ اس وقت تاشقند میں دس مسجدیں تھیں ۔ ایک مسجد میں ، جسے جان گنتھر نے طرز تعمیر اور آرائش کے اعتبار سے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا ، بڑی تعداد میں نمازی موجود تھے ۔ ضعیف امام کی عمر ۹٦ سال کے لگ بھگ تھی ۔ روس سے الحاق رکھنے والی ریاستوں میں بھی اکثریت مسلمانوں کی تھی ۔ اس وقت سوویت یونین دنیا کی چوتھی بڑی اسلامی طاقت تھا ۔ گنتھر نے ایک روسی افسر اعلا سے گفتگو کی تو انہوں نے کہا : ”ہم اس حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے ۔ اگر ہم کسی کو مذہبی آزادی نہ دیں تو یہ ہماری حماقت ہوگی،، ۔

سوویت یونین کا محل وقوع بڑا عجیب ہے ۔ کچھ حصہ یورپ میں اور بڑا حصہ ایشیا میں ہے ۔ اس کے جانب غرب فن لینڈ ، بحیرۂ بالٹک ، پولینڈ اور رومانیہ ، جانب جنوب بحیرۂ اسود ، ترکی ، ایران ، بحیرۂ کیسپیں ، افغانستان ، چین ، منگولیا ، مانچوریا ، جانب شرق بحیرۂ جاپان ، بحیرۂ اوخوتسک ، بحیرۂ بیرنگ اور جانب شمال بحر منجمد شمالی واقع ہے ۔ شمال میں سمندر کے قریب ٹنڈرا یعنی ارض اسود کا علاقہ نہایت زرخیز ہے اور شدید سردی کے باوجود اپنی پیداوار سے ملک کو فائدہ پہنچاتا ہے ۔ بڑا علاقہ چٹیل میدان ہے لیکن ایک سلسلۂ کوہ بھی اس کا نگہبان ہے ۔ اس میں کوہ قاف اور کوہ لوران قابل ذکر ہیں ۔ کئی دریا میدانوں کو سیراب کرتے ہیں جن میں سے وولگا ، دنیسپر ، اونیگا اور ڈون یورپی علاقے میں اور دریائے اوب ، لینا ، وینی سی ، سلینا ، آمور اور ارتائش ایشیائی علاقے میں بہتے ہیں ۔ معدنیات کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ مالا مال ہے ۔ مٹی کا تیل دنیا کی کل پیداوار کا ۳۸ فی صد ہے ۔ لوہا ، مگنیشیا ، تانبہ ، سیسہ ، جست ، سونا ، پلاٹینم ، قیمتی پتھر ، سنگ مرمر اور نمک کی کافی مقدار برآمد ہوتی ہے ۔ کھیتوں سے مکئی ، گیہوں ، باجرہ ، میٹھا چقندر ، ناریل ، افراط سے حاصل ہوتا ہے ۔ موسم گرما

قلیل مدت کے لیے لیکن خاصا گرم ہوتا ہے ۔ موسم سرما میں سردی خوب پڑتی ہے ۔ گھڑوں کا پانی تک جم جاتا ہے ۔

انتظامی اعتبار سے ملک کے کئی حصے ہیں ۔ وفاقی جمہوریہ کے علاوہ بہت سی ریاستوں کا اس سے الحاق ہے ۔ وفاق اور ریاستوں کی تفصیل حسب ذیل ہے جو جنوری ۱۹۷۷ء کے تخمینے کے مطابق ہے :

علاقہ	صدرمقام	رقبہ مربع کلو میٹر میں	آبادی
وفاقی جمہوریہ	ماسکو	۱,۷۰,۰۰,۰۰۰	۷۸,۰۰,۰۰۰
یوکرین	خیوا	۴,۴۵,۰۰۰	۴,۹۳,۰۰۰
بائیلو روس	منسک	۲,۰۷,۶۰۰	۹۴,۰۰,۰۰۰
ازبکستان	تاشقند	۴,۴۷,۴۰۰	۱,۴۴,۷۴,۰۰۰
کزاخستان	الماعطا	۲۷,۱۷,۳۰۰	۱,۴۵,۰۰۰
جارجیا	تبلیسی	۶۹,۷۰۰	۵۰,۰۰,۰۰۰
آذر بائجان	باکو	۸۶,۶۰۰	۵۷,۷۶,۰۰۰
لتھوآنیا	ولنا	۶۵,۲۰۰	۳۳,۰۰,۰۰۰
مولداویا	کشی نیف	۳۳,۷۰۰	۳۸,۸۰,۰۰۰
لت ویا	ریگا	۶۳,۷۰۰	۲۵,۰۰,۰۰۰
کرغزیہ	فرنزے	۱,۹۸,۵۰۰	۳۴,۰۰,۰۰۰
تاجکستان	دشنبہ	۱,۴۳,۱۰۰	۳۶,۰۰,۰۰۰
آرمینیا	یرے وان	۲۹,۸۰۰	۲۸,۹۳,۰۰۰
ترکمانیہ	اشک آباد	۴,۸۸,۱۰۰	۲۶,۵۰,۰۰۰
استونیا	تالن	۴۵,۱۰۰	۱۴,۴۷,۰۰۰

ابتدائیہ

اب سے تقریباً چوبیس سال پہلے یعنی جولائی سنہ ۱۹۵۴ء کے تیسرے ہفتے میں جب ریڈیائی لہروں کے ذریعہ سے نشر ہونے والی یہ خبر سننے میں آئی کہ تاجکستان کے نامور انقلابی شاعر، دانشور اور سیاسی رہنما صدرالدین عینی کا انتقال ہوگیا ہے تو دل و دماغ کو شدید صدمہ پہنچا ۔ مجھے ان سے ملنے کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا تھا لیکن ان کی چند سیاسی تحریریں میرے مطالعے میں آئی تھیں اور بعض انقلاب انگیز اشعار ہے، جو فارسی زبان میں تھے ، میں نے گھرا اثر لیا تھا اور اس اعتبار سے ان کے بارے میں ایک عمدہ رائے قائم کی تھی ۔ لیکن افسوس ہے کہ انہیں دیکھنے اور ان سے تبادل خیال کرنے کی تمنا پوری نہ ہوسکی تھی کہ اچانک سانحۂ ارتحال کی خبر سنی ۔ تاجکستان میں اور ان کے وطن مالوف دوشنبہ سے پانچ دس ہزار میل پرے پاکستان اور دوسرے ملکوں میں بھی یہ خبر افسوسناک ثابت ہوئی کیونکہ یہ مثل مشہور ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے ۔

میرے جیسے تمام پاکستانیوں کے لئے یہ خبر اس لحاظ سے بھی افسوسناک تھی کہ اس وقت سے چھ سال پہلے ہم اپنے وطن کے اس مجاہد آزادی کے وجود ظاہری سے محروم ہو گئے تھے جس کی مساعئی جمیل نے پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ایک نمایاں جگہ دی تھی ۔ ان سے جدا ہونے کا غم چھ سال گزرنے کے باوجود ابھی تازہ زخم کی طرح تکلیف دہ تھا ۔ تاہم عینی کی وفات پر دل

ھی دل میں تعزیتی الفاظ ادا کرتے وقت یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ چوبیس سال بعد ایک روسی ریاست کے اس بطل عظیم کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات میں حصہ لینے کے لئے مجھے مدعو کیا جائیگا ' اور مجھے اپنی مصروفیات کے باوجود اس دعوت نامے کو قبول کرلینا پڑیگا ۔

تقریبات میں شرکت کا دعوت نامہ

اس سال ۱٦ مارچ کو کراچی میں متعین روس کے قونصل جناب آر ' اے ' بکالو کا مراسلہ ملا جسے وہ خود لے کر میرے دفتر میں تشریف لائے ۔ مراسلے کے ساتھ تاجک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر جناب محمد عاصموف کی طرف سے بھیجا ھوا دعوت نامہ منسلک تھا ۔ دعوت نامے میں مختصراً یہ بتاتے ھوئے کہ تاجک سوویت ادب کے بانی صدر الدین عینی تاجک اکیڈمی آف سائنسز کے سب سے پہلے صدر بھی تھے، اس میں ان کی قلمی کاوشوں کو سراہا گیا تھا جن کو تاجک فارسی ادب میں ایک قیمتی ورثہ سمجھا جاتا ھے ۔

یہ بھی پتہ چلا کہ اقوام متحدہ کے تعلیمی ، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے اپنی آنیسویں جنرل کانفرنس میں جو نومبر سنہ ۱۹۷٦ء کو منعقد ھوئی تھی، ۱۹۷۸ء کے کیلنڈر میں عینی کی صد سالہ جوبلی کو ایک اھم تاریخی واقعہ کی حیثیت دینے کا فیصلہ کیا تھا ۔ دعوت نامے میں دی ھوئی تفصیلات سے معلوم ھوا کہ عینی کی نگارشات کو مختلف ذرائع سے جمع کرکے ان کے اصل روپ میں اور متعدد زبانوں میں ان کے ترجمے کرنے کا اھتمام صد سالہ

جوبلی کی مجلس انتظامیہ نے مناسب صورت میں کیا ھے ۔ نیز یہ کہ ھفت روزہ تقریبات ماسکو اور دوشنبہ میں منعقد ھونے والی تھیں ۔

دعوت نامے کے ساتھ دانشور بزرگ جناب محمد عاصموف کا ایک ذاتی دستخط شدہ خط بھی میرے نام موصول ھوا تھا جس میں یہ یقین ظاھر کیا گیا تھا کہ میں اس دعوت نامے کو قبول کرکے جوبلی میں ضرور شریک ھونگا اور مقالہ بھی پڑھونگا ۔ گویا اس طرح کئی سال پہلے دیکھے ھوئے ایک سہانے خواب کی تعبیر بہ انداز دگر برآمد ھو رھی تھی ۔ یعنی عینی سے ملاقات کا شرف نصیب نہ ھوا تو انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت مل رھی تھی ۔ بھلا میں اس زرین موقع کو کس طرح ھاتھ سے جانے دیتا ۔ میں نے غیر رسمی طور پر دعوت نامہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور رسمی طور پر حکومت کے ارباب اقتدار سے سلسلہ جنبانی شروع کی تاکہ وھاں جانے، تقریبات میں شریک ھونے اور مقالہ پڑھنے کی باقاعدہ اجازت مل جائے ۔ جن لوگوں کو ایسے اجازت نامے لینے کی ضرورت پڑتی ھے ، وہ بخوبی جانتے ھیں کہ یہ بظاھر آسان کام حقیقتاً کس درجہ مشکل اور صبرآزما ھوتا ھے ۔ لیکن انسان خلوص نیت اور جذبۂ صادق کے ساتھ کوئی قدم اٹھائے تو ھر مشکل آسان ھوجاتی ھے ۔ اس مشکل کو آسان کرنے میں میری مستعد سکریٹری مسز ایل، اے ، ڈی، سلوا کا بڑا ھاتھ تھا ۔ انھوں نے کئی بار وزارت تعلیمات کے سکریٹری سے ٹرنک کال کے ذریعہ سے بات کی اور زبانی اجازت نامہ حاصل کرلیا ۔ یہ غنیمت تھا ۔ تحریری اجازت نامہ میری روانگی کے چند دن بعد وصول ھوا ۔ اس کے ساتھ ساتھ باقی سوئیاں بھی نکال دی گئیں ۔ چنانچہ ۹ اپریل کو میں نے خط میں

دئے ہوئے ماسکو کے پتے پر عینی کانفرنس کے منتظمین کو حتمی طور پر مطلع کردیا کہ میں ۱۱ اپریل کو وہاں پہنچ رہا ہوں۔

ایک تلخ تجربہ

حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ میرا پہلا تلخ تجربہ نہیں تھا۔ اس ضمن میں اس سے پہلے بھی بارہا پریشانیاں اٹھا چکا ہوں۔ مثلاً حضرت امیر خسرو کے جشن ہزار سالہ میں شرکت کرنے کے لئے جب اگست ۱۹۷۵ء میں اجازت مانگی گئی تو سرکاری دفاتر کے سرخ فیتوں نے اتنے چکر دئے کہ میرا سر برابر چکراتا رہا۔ غیر معمولی تاخیر کے باعث میرے ذہن نے یہ تاثر قبول کیا کہ میرے سفر روس میں اب کوئی رخنہ پڑنا لازمی ہوگیا ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ مجھے اس سفر سے روکنا تو کسی کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ البتہ پروگرام کو زیرو زبر کردینے کے امکانات تو موجود تھے۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ کوتاہی بلکہ بد نظمی صرف میرے لئے ہی نہیں، سب کے لئے تکلیف دہ ہوسکتی ہے۔ اس سے دوسرے ملکوں میں اپنے قومی وقار کو صدمہ پہنچتا ہے جسے کسی عنوان کوئی بھی گوارا نہیں کرتا بلکہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

۱۳ ستمبر کو دن کے دس بجے ٹیلی فون پر میری بیٹی سعدیہ کو یہ پیغام ملا:

''حکیم صاحب سے کہہ دیجے کہ کل صبح ان کو روس جانا ہے۔ تمام انتظامات کردئے گئے ہیں۔ بنک کو تار بھجوا دیا ہے تاکہ آپ کا ٹکٹ وغیرہ بن جائے''۔

مگر دوسرے روز شام کے چار بجے تک اسٹیٹ بنک میں کوئی ہدایت نہیں آئی۔ اگر عزیز من جمیل الدین عالی صاحب اپنے اثرات سے کام نہ لیتے تو ٹکٹ بن ہی نہیں سکتا تھا اور ہم دوسرے روز صبح کو روس کے لئے روانہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس جشن میں شرکت کے لئے عالی صاحب ہی میرے ہم سفر تھے۔ لہذا ان کی وجہ سے ٹکٹ خریدنے کی اجازت ملی اور تیس ڈالر ساتھ لے جانے کی منظوری بھی عطا ہوگئی۔

روس سے موصولہ دعوت نامے کی بنیاد پر سفیر روس نے مجھے داخلۂ روس کا اجازت نامہ دیدیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ویزے کا مسئلہ بھی کھڑا ہوتا اور معاملہ قابو سے باہر ہوجاتا۔ میری پریشانی کا اندازہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ جب سرکاری طور پر اجازت ملنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی تو ۱۲ ستمبر کو میں نے قطعاً فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اب سفر روس نہیں کرونگا اور سامان کھول کر بھی رکھ دیا تھا۔ کیونکہ جشن امیر خسرو کے پروگرام کے مطابق کئی اہم تاریخیں نکل چکی تھیں اور اندیشہ تھا کہ اب وہاں جانا بے سود نہ ہوجائے۔ ادھر تین دن سے بڑا تیز بخار بھی تھا جس سے سخت کمزوری لاحق ہوگئی تھی۔ درجۂ حرارت مسلسل ۱۰۳ تھا مگر میں اس سفر سے دو وجہ سے بچ نہیں سکتا تھا:

۱— وزیر اعظم پاکستان نے بطور خاص میرے سفر کی منظوری دی تھی اور اس طرح میری حیثیت سفر روس میں ذاتی نہیں، سرکاری ہوگئی تھی۔

۲— حکومت روس کا دعوت نامہ میرے نام شخصی تھا

اور دعوت نامہ جاری کرنے سے قبل روس نے ۹ جون ہی کو اطلاع کردی تھی کہ مجھے تیار رہنا چاہئے ۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں تھا کہ میں اس سفر سے کسی طرح بھی گریز کرتا ۔

البتہ اس ذہنی پریشانی کا یہ اثر ضرور ہوا کہ پہلے سے خریدا ہوا ٹکٹ گھر پر ہی رہ گیا اور میں ہوائی میدان کی طرف روانہ ہوگیا ۔ راستے میں اس بھول کا احساس ہوا ۔ صرف چند منٹ کا راستہ باقی رہ گیا تھا ۔ بہت ہی نازک مرحلہ تھا لیکن فوراً ہی فیصلہ کیا کہ گھر واپس چلوں ۔ چنانچہ گاڑی کے پہیے موڑ دئے گئے ۔ اس کا رخ بدل گیا ۔ ٹکٹ لے کر بڑی کشمکش کے بعد دو بجے ہوائی اڈے پر پہنچا ۔ وہاں سوویت قونصلیت کے خلیلل صاحب موجود تھے جو مجھے رخصت کرنے اور خدا حافظ کہنے کے لئے آئے تھے ۔ حال آں کہ میں نے شب گزشتہ ایک تقریب میں منع بھی کردیا تھا کہ وہ زحمت نہ فرمائیں ۔ لیکن انہیں یہ ہدایت روس سے ملی تھی اور مجھ سے دیرینہ تعلقات بھی قائم تھے ۔ اندر گیا تو دیکھا کہ جمیل الدین عالی صاحب ہوائی اڈے کے عملے سے الجھے ہوئے تھے ۔ ان کا سامان ذرا زیادہ تھا اور روسی ہوا پیما ایرو فلوٹ کے جنرل منیجر صاحب مصر تھے کہ زائد سامان کا کرایہ ادا کیا جائے ۔ میں آیا تو میرا سامان بھی کچھ کم نہ تھا، قاعدے کے عین مطابق تھا ۔ درحقیقت ہم دونوں کے پاس روس کے لئے کتابوں کے تحائف تھے ۔ میرے پاس اپنی اس تقریر کے کتابچے کی پانچ سو کاپیاں بھی تھیں جو مجھے تقریر کے بعد وہاں تقسیم کرنی تھیں ۔ ان کا وزن خاصہ زیادہ تھا ۔ ان کے علاوہ بہت کم

سامان تھا ۔ جہاز کی روانگی کے تنگ وقت نے منیجر صاحب کو تنگ کردیا ۔ لہٰذا جناب خلیل صاحب کی مداخلت سے طے پایا کہ صرف پندرہ کلو کا کرایہ ادا کردیا جائے ۔ باقی معاف ۔ یہ میں نے ادا کردیا اور جمیل الدین عالی صاحب صاف بچ گئے ۔

روسی قونصلیت کی ہدایت کے مطابق مجھے جہاز والوں نے فرسٹ کلاس میں جگہ دیدی جہاں کراچی سے ماسکو تک چار ہزار کچھ سو کلو میٹر کا پانچ گھنٹے چالیس منٹ کا سفر بڑے آرام سے طے ہوگیا ۔ زائد سامان کے کرائے کا بدل اس طرح مل گیا اور عالی صاحب مفت میں اس رعایت سے بھی مستفیض ہوئے ۔

سخت مایوسی کا سامنا

جب جہاز ماسکو کے ائیر پورٹ پر پہنچا تو وہ اندیشہ صحیح نکلا جس کی توقع تھی ۔ یعنی کوئی بھی ہمیں لینے نہیں آیا تھا ۔ حالانکہ روسی قونصلیت نے کراچی سے جہاز کی روانگی سے قبل ماسکو اطلاع کردی تھی مگر اس روز ہفتہ تھا اور وہاں پہنچنے والے دن اتوار ۔ ماسکو میں یہ دونوں دن چھٹی کے ہوتے ہیں ۔ میں نے ماسکو میں پاکستانی سفارت کو بھی کوئی اطلاع نہیں دی تھی ۔ خیال تھا کہ یہ کام سرکاری طور پر ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اب ہمیں لینے کوئی کیوں آتا ۔ تاہم اس آڑے وقت میں جمیل الدین عالی صاحب کام آگئے ۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں سفارت خانے ہی چلنا چاہئے ۔ میری رائے تھی کہ ہمیں ہوائی جہاز میں سوار ہوکر الماعطا روانہ ہوجانا چاہئے جو پروگرام میں شامل تھا ۔ مگر مجھے پہلی بار معلوم ہوا

کہ روس میں :

(۱) ایک شہر سے دوسرے شہر بغیر اجازت کے نہیں جایا جاسکتا۔ یعنی ہمیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ مل ہی نہیں سکتا تھا جب تک کہ ماسکو کے ایک خاص دفتر سے اجازت نامہ حاصل نہ کرلیا جاتا۔

(ب) ہم ماسکو کے کسی ہوٹل میں جاکر ٹھیر نہیں سکتے تھے جب تک کہ اس کی بھی خصوصی اجازت دفتر خاص سے حاصل نہ کرلی جاتی۔

یہ دونوں شدید پابندیاں تھیں اور ان کا کوئی حل اس وقت تک نہیں نکل سکتا تھا جب تک کہ ہم اپنے سفارت خانے نہ جائے۔ میرے ذہن پر اس کا بڑا ہی بار تھا مگر اس وقت یہ ایک ایسی مشکل تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

ہوائی میدان میں جہاز اترنے کے کوئی ۸۰ منٹ بعد سامان آنا شروع ہوا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اپنا سامان ہم نے خود تلاش کرکے نکال لیا۔ ٹرالیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ قلی گنتی کے چند تھے۔ ٹرالیاں انہی کے قبضے میں تھیں۔ انہوں نے موقع نہیں دیا کہ ہم کوئی ایک ہی ٹرالی لے لیں۔ دنیا میں ہر جگہ ہوائی اڈے پر سامان کے لئے ٹرالی مفت مل جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسی سال ۳ مارچ کو جب میں فرینکفرٹ گیا تھا تو ٹرالی کا کرایہ ایک مارک ادا کرنا پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہاں بھی ٹرالی کا کرایہ اتنا ہی ہوگا۔ مگر ایسا نہ تھا۔ یہاں قلی مختار کل تھے۔ ہم دونوں نے ایک قلی کرلیا۔ میں نے باہر نکل کر فوراً اپنے تیس ڈالر بھنائے جو زرمبادلہ کے طور پر ہمیں اس

سفر کے لئے ملے تھے۔ تیس امریکی ڈالر کے مجھے ۲۱،۹۸ روبل ملے۔ یعنی پورے بائیس بھی نہیں۔ اتنے زیادہ ڈالر دے کر جو روبل ہاتھ میں آئے، وہ ذرا بھی نہ جچے۔ روبل کی قیمت روسیوں نے ضرورت سے زیادہ بڑھا رکھی تھی۔ اس لئے کالے بازار میں امریکی ڈالر کے عوض زیادہ روبل مل جاتے تھے مگر میں کالے بازار کا سودا کرنے کا عادی نہیں تھا۔ میں ہر کام ضابطے میں کرتا ہوں۔ اب ایک روبل تقریباً سواتیرہ روپے کے برابر ہوا۔ آدھا روبل قلی کے لئے دل خوش کن ثابت ہوا۔

ماسکو کے ہوائی میدان پر ایک طالب علم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ وہ اسی جہاز سے اترے اور لاڑکانہ سے آئے تھے۔ ماسکو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ تھا۔ وہی مزاج تھا جو اکثر طالب علموں کا ہوا کرتا ہے۔ ان کے ایک دوسرے سندھی دوست لینے آئے تھے۔ ہم نے ان دونوں کو اپنی ٹیکسی میں بٹھالیا تاکہ ان کو فائدہ پہنچ جائے۔ راستہ ہم سب کا ایک ہی تھا۔ راستے بھر وہ دونوں آپس ہی میں باتیں کرتے رہے۔ ہماری طرف بہت کم رخ دیا۔ وہ دونوں طالب علم پاکستان کے باشندے حکیم محمد سعید اور جمیل الدین عالی سے نا واقف تھے۔ انہوں نے حکیم سعید کا نام کبھی نہیں سنا تھا اور عالی صاحب کی غزلیں، نظمیں اور دوہے بھی نہیں پڑھے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے پر آکر میں نے میٹر کے مطابق تین روبل ادا کردئے۔ وہ دونوں طلبہ اسی ٹیکسی میں روانہ ہوگئے۔ اخلاقاً انہوں نے ہمارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ ان کے نزدیک یہ ہمارا فرض ہی تھا کہ ہم ان کو لفٹ دیتے۔

سفیر پاکستان سے ملاقات

اتوار کی وجہ سے سفارت خانہ' پاکستان بھی بند تھا ۔ یہ غنیمت تھا کہ جناب سفیر اسی عمارت میں رہتے تھے اور اس وقت موجود بھی تھے ۔ ان دنوں ماسکو میں ہمارے سفیر جناب سجاد حیدر صاحب متعین تھے ۔ ان سے غائبانہ تعارف تو حاصل تھا مگر ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ بے تکلفی کا تو سوال ہی نہیں تھا ۔ زبردستی ان کا مہمان بنا جو محض مجبوری پر محمول کیا جاسکتا تھا ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ بھی نہیں تھی ۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر عالی صاحب نے سفارت خانے کے سیکوریٹی افسر صاحب کو دعوت نامہ دکھایا ۔ اس کے بعد دروازے کھلنے شروع ہوئے اور ہم عمارت کے اندر پہنچ گئے ۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا دئے گئے ۔ ذراسی دیر میں جناب محترم سجاد حیدر صاحب تشریف لے آئے ۔ ایک دم ان کی زبان سے نکلا :

''ارے حکیم صاحب ، ہم تو آپ کے پرانے دوست ہیں ۔
میری اہلیہ سعید الزماں صاحب کی ہمشیرہ ہیں'' ۔

اب مجھے بھی یاد آگیا کہ جب سجاد حیدر صاحب دھلی میں تھے تو سعید الزماں صاحب مرحوم کے ارشاد پر میں نے اپنے بھائی جان محترم کو لکھا تھا کہ ان کے معاملے میں خاص توجہ فرمائیں ۔ اس تعارف اور حوالے کے بعد دل کو ڈھارس ملی اور پھر بے تکلفی کی باتیں شروع ہوگئیں ۔ ان کو ہمارے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ۔ یعنی پاکستانی وفد ماسکو پہنچ گیا مگر حکومت نے اپنے سفیر تک کو کوئی اطلاع نہیں کی تھی ۔ اس غفلت شعاری

کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا ۔ دوران گفتگو جناب سجاد حیدر صاحب نے بتایا کہ روسی اکیڈمی آف سائنسز نے ان سے رابطہ قائم کر کے درخواست کی تھی کہ چونکہ پاکستان سے کسی مندوب کے آنے کی اطلاع نہیں ملی ہے، اسلئے سفارت خانے سے کسی کو بھیج دیا جائے ۔ چنانچہ اہلیہ' سفیر صاحب جانے کے لئے تیار ہوگئیں ۔ وہ اچھا علمی ذوق رکھتی ہیں ۔ چنانچہ بابا جان غفوروف صاحب کی جانب سے ان کو دعوت نامہ بھی مل گیا تھا ۔ مگر اس کے باوجود جناب سفیر کی اہلیہ صاحبہ کو دوشنبہ جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور اس وقت تک وہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی نہیں خرید سکتی تھیں ۔ حیرت ہوئی کہ جہاں یہ جکڑ بندیاں ہوں کہ خود ہمارا سفیر ماسکو کی مقررہ حدود سے باہر سرکاری اجازت کے بغیر قدم نہ اٹھا سکتا ہو، ہمارا کیا مقام تھا ۔ جناب سفیر صاحب نے فون کرکے اپنے سیکنڈ سکریٹری کو بلایا اور ان سے کہا کہ ہمارے ٹھیرنے کا مناسب انتظام کردیا جائے ۔ وہاں دو بڑے ہوٹل پیکنگ اور روسیہ ہیں لیکن وہ اجازت کے بغیر کمرہ نہیں دیتے ۔ اسلئے انٹورسٹ سے ایک رات کے لئے ہوٹل نیشنل میں اہتمام ہوگیا جو عموماً ایسے سیاحوں کے لئے ہے جنہیں آگے جانا ہوتا ہے ۔ ہمیں تشویش یہ تھی کہ ہوٹل نیشنل میں ایک رات کے اٹھاون امریکی ڈالر ہوتے تھے یعنی تقریباً چھ سو روپے ۔ میرے اور عالی صاحب کے پاس مشترکہ طور پر صرف ساڑھے چھپن ڈالر کے برابر روبل باقی تھے کیونکہ ساڑھے تین ڈالر خرچ ہوچکے تھے ۔ ہم نے سوچا کہ کل کیا ہوگا اور ہم کھانا کیسے کھائیں گے ۔ جناب سفیر صاحب نے اکیڈمی آف سائنسز کو فوراً تار روانہ کیا کہ پاکستانی وفد ماسکو

پہنچ گیا ہے اور ہوٹل میں ٹھہرا دیا گیا ہے۔ انہوں نے از راہ کرم ہم سے تار کا خرچ نہیں لیا۔ ہم جس کنگرس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے، وہ ۸ ستمبر سے شروع ہوچکی تھی۔ ماسکو، الما عطا اور دوشنبہ میں اس کے اجلاس ہوچکے تھے۔ اب اختتامی جلسہ باقی تھا۔ اس تمام تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اگر سرکاری طور پر ہم کو بر وقت اجازت مل جاتی تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی اور ہم اجلاس میں ابتدا ہی سے شریک ہوتے۔ خیر چھوڑئے اس قصہ ماضی کو!

میرے مقالے کا موضوع

عینی کنگرس میں شرکت کے لئے روانہ ہونے سے قبل ہی میں نے مقالے کی تیاری شروع کردی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ "صدر الدین عینی کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے پیغام" کو موضوع بناکر اپنے خیالات کا اظہار کرونگا۔ میرے ذاتی کتب خانے میں اس عظیم انسان پر کافی مواد موجود تھا۔ اس کے علاوہ کراچی میں قائم "فرینڈ شپ ہاؤس" کے ڈائرکٹر جناب تلا گانوف نے اس ضمن میں میری اعانت کی جو قابل قدر تھی۔ ان کے بھیجے ہوئے اشاریے بڑے کام آئے۔ مقالہ تیار کرکے ایک کتابچے کی صورت میں طبع کرالیا تاکہ ماسکو اور دوشنبہ کے شرکائے اجلاس میں تقسیم کیا جاسکے۔ اس پمفلٹ مں دو تصویریں بھی تھیں۔ ایک عینی کی شبیہ اور دوسری اسٹالن آباد کی اس شاہراہ کی جو عینی کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔

کانفرنس کے منتظمین نے شریک ہونے والوں کے لئے جو

پروگرام مرتب کیا تھا، میں نے اپنے ذوق اور مشاغل کے اعتبار سے اس میں کچھ اضافہ اپنے لئے کرلیا۔ میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ میں کسی دوسرے ملک میں جاؤں اور وہاں کے طبی ادارے، طبی درسگاہیں اور شفاخانے نہ دیکھوں۔ میں نے چند ماہ پہلے اپنے ملک میں سرطان سے متعلق ایک مطالعی، تحقیقاتی اور انسدادی مہم شروع کی تھی، جس کے سلسلے میں اجلاس طلب کئے تھے اور ان کارناموں پر حکومت نے مہر توثیق ثبت کردی تھی۔ لہذا بطور خاص اپنے پروگرام میں ماسکو کے ادارہ سرطان میں جاکر معالعے کے لئے کچھ گنجائش رکھ لی گئی اور اپنے اس ارادے سے کانفرنس کے منتظمین کو مطلع کردیا گیا تاکہ وہ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے لئے مناسب وقت کا اہتمام کردیں۔

علاوہ ازیں میں نے روس اور تاجکستان کے بیشتر سرکاری اور چند غیر سرکاری کرم فرماؤں کو، جن سے ذاتی طور پر مجھے شرف نیاز حاصل تھا یا میں ان سے خط وکتابت کرچکا تھا، مجموعی طور پر ۲۳ خطوط انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں میں حسب ضرورت لکھ دئے تاکہ ان کو میری روانگی اور وہاں پہنچنے کی اطلاع پہلے سے ہوجائے اور قند مکرر کے طور پر ان سے ایک بار پھر ملنے کا موقع مل جائے۔ ان میں پاکستانی سفیر متعینہ ماسکو، عزت مآب سجاد حیدر بھی شامل تھے جو میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ سجاد حیدر صاحب نے ماسکو میں رہتے ہوئے اپنے ملک کے عظیم راہنماؤں کو یاد رکھنے اور حسب ضرورت غیر ملکیوں سے ان کو مناسب صورت میں متعارف کرانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے دسمبر ۱۹۷۶ء میں اپنے محبوب

قائد اعظم کے صد سالہ جشن پیدائش کی تقریب ماسکو میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ منانے کا انتظام کیا تھا جس میں نہ صرف روسی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے پاکستانی طلبہ اور سفارت خانے کے عملے نے شرکت کی بلکہ خود روسی نژاد مفکروں نے مسلمان قوم کے اس مجاہد اعظم کو اپنے پندار کے مطابق خراج عقیدت پیش کیا۔

قائد اعظمؒ کا جشن پیدائش

اس موقع پر میرے دوست پروفیسر ی۔ و۔ گانکو فسکی نے اپنے پاکستان کے اس دورے کے تاثرات بیان کئے جو انہوں نے قائد اعظم کے سو سالہ جشن پیدائش کے سلسلے میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کنگرس میں شرکت کے لئے کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بڑا نمائندہ اجتماع تھا۔ اس کا نظم و نسق بہت عمدہ تھا اور اس میں جو تقریریں ہوئیں یا مقالات پیش کئے گئے، ان کا معیار انتہائی بلند تھا۔ انہوں نے اس بات کی حمایت کی کہ قائد اعظم محمد علی جناح کی زندگی اور سرگرمیوں کا مطالعہ کرنے والے سوویت اور پاکستانی اسکالروں کے مابین روابط کو مزید توسیع دی جائے۔

سوویت یونین کی اکیڈمی آف سائنسز کے شعبۂ علوم شرقیہ کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ج۔ ک۔ شیروکوف نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

" قائد اعظم محمد علی جناح اپنے ملک کی تاریخ میں محض اس لئے زندہ نہیں ہیں کہ وہ قومی آزادی کی تحریک کے سربراہ

تھے، جس کے نتیجے میں ایک خود مختار پاکستان کا قیام عمل میں آیا بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایک وسیع النظر دانشور اور مفکر تھے اور انہوں نے پاکستان کی آئندہ ترقی کے لئے ایک لائحۂ عمل بھی مرتب کردیا تھا۔"

علوم تاریخ کےایک روسی طالب علم و۔ ن۔ موسکالنکونے اپنے مقالے میں کہا کہ قائد اعظم پاکستان کے معاشی ڈھانچے کو یکسر بدل دینا اور اسے جدید صنعتوں کی بنیاد پر تشکیل دینا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں فروغ صنعت کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف بےروزگاری ختم ہو اور دوسری طرف حکومت کو دوسرے ترقیاتی منصوبے عمل میں لانے کے لئے کافی رقم مل جائے۔ علوم تاریخ ہی کے ایک اور طالب علم ا۔ م کمپانتسیو نے قائد اعظم کی خارجہ پالیسی کو سراہتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ وہ تمام ممالک اور قوموں پر زور دیتے رہے کہ وہ امن و عافیت اور باہمی دوستی کی بنیاد پر زندگی بسر کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سوویت یونین سمیت تمام پڑوسی ملکوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات ضروری ہیں۔ طالب علم نے یاد دلایا کہ پاکستان اور سوویت یونین کے مابین اچھے سفارتی تعلقات اسی وقت قائم ہوگئے تھے کہ جب وہ ملک کے پہلے گورنر جنرل تھے۔

جناب سجاد حیدر صاحب نےخود بھی قائد اعظم کے سیاسی ورثے کے بارے میں مختصر روئداد پیش کی اور کہا کہ وہ آزاد پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے لئے اس وجہ سے علمبردار ہوئے تھے کہ وہ غریب عوام کے مفادات پورے کرکے انہیں خوشحالی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے قائد اعظم کی خارجہ پالیسی پر

روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ساری دنیا میں قیام امن کے حامی تھے۔

علامہ اقبال کا جشن پیدائش

اسی طرح پاکستان میں ۱۹۷۶ء علامہ اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کے لئے مخصوص کیا گیا تو جناب سجاد حیدر نے ماسکو میں ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں اقبال کی اصل مطبوعات کے علاوہ ان ترجموں کی نمائش بھی کی گئی جو روسی، ازبکی، تاجکی، تاتاری اور دوسری زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ روسی مصنفین کی طبعزاد کتابیں، جو علامہ اقبال پر لکھی گئیں، ان کے علاوہ تھیں۔ سوویت ماہرین شرقیہ نے اس موقع پر عمدہ الفاظ میں شاعر مشرق کو خراج تحسین بھی ادا کیا۔ اپنے فرائض منصبی کی ادائی کے علاوہ محترم سجاد صاحب کی یہ کارگزاریاں ادبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔

علامہ اقبال پر ایک اور جلسے کا اہتمام تاجکستان کی اکیڈمی آف سائنسز کے صدر اور میرے عزیز دوست جناب ڈاکٹر محمد عاصموف کی سربراہی میں بمقام دوشنبہ منعقد ہوا۔ خود انہوں نے اس موقع پر کہا :

”ہم اس آدمی کی سالگرہ منارہے ہیں جو ہم تاجکوں کو خاص طور پر عزیز ہے۔ وہ اردو اور فارسی زبانوں میں شعر کہتے تھے جو ہم سے قریب اور ہمارے لئے قابل فہم زبانیں ہیں۔ ان کی نظمیں ایسے لوگوں کو بے حد پسند ہیں جو شاعری کو سراہتے اور اس سے گرمجوشی کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔“

محمد عاصموف صاحب نے زور دے کر یہ بات کہی کہ برصغیر جنوبی ایشیا کے شاعروں اور ادیبوں کے ادبی ورثے کا مطالعہ کرتے ہوئے تاجک اسکالروں نے محمد اقبال پر خصوصی توجہ دی ہے۔ تاجک رسالوں میں اقبال کی نظمیں، ان کی زندگی اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اکیڈمی کے علوم شرقیہ کے ادارے نے جناب عبداللہ جان غفاروف کا لکھا ہوا ایک کتابچہ ”علامہ اقبال“ بھی شائع کیا۔ اقبال کی نظموں کا ایک مجموعہ ”صدائے مشرق“ بھی مرتب کیا گیا۔ تاجکستان بلکہ تمام روس میں علامہ کی شاعری کو مقبول بنانے میں میرے دوست میر سعید میر شاکر کافی اہم حصہ لیتے رہے ہیں۔ وہ ایک عوامی شاعر ہیں۔ انہوں نے اقبال کی نظموں کا تاجک زبان میں ترجمہ کر کے پہلا مجموعہ ۱۹۵۸ میں شائع کیا تھا۔ اس جلسے میں بھی سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر نے شرکت کی تھی۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا :

”ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ علامہ اقبال نے روس میں ۱۹۱۷ میں برپا ہونے والے انقلاب اکتوبر کی فتح کی پذیرائی کی تھی۔ شاعر نے اس انقلاب کو مشرق کے سیاہ بادلوں میں سے آزادی کا طلوع ہوتا ہوا سورج قرار دیا تھا جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا جس میں تمام لوگ اپنی زندگیوں کے مالک ہیں“۔

یہ تقریب تاجک اکیڈمی کے ڈرامہ تھیٹر میں منعقد ہوئی تھی جو وہاں کے عظیم شاعر ابوالقاسم لاھوتی کے نام سے موسوم ہے۔

ماسکو روانگی سے قبل میں نے یہ بھی مناسب سمجھا تھا

کہ صدرالدین عینی کانفرنس میں پڑھے جانے والے اپنے مقالے کے خاص خاص حصے اردو زبان میں ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر پاکستان کے چند اخبارات کو بھیج دئے اس تاکید کے ساتھ کہ مضمون ۱۰ اپریل سے قبل شائع نہ کیا جائے ۔ ایک دو اخبارات نے پورا مقالہ عینی کی تصویر کے ساتھ شائع کیا ۔ باقی نے اقتباسات پر اکتفا کیا ۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح ابنائے وطن کو یہ معلوم ہوجائے کہ عینی کی صد سالہ جوبلی کس اہتمام سے منائی جارہی ہے ۔

ہوا کے دوش پر

بعض لوگ جب کسی دور دراز ملک کے لئے آمادۂ سفر ہوتے ہیں تو انہیں بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ رخت سفر باندھنے اور خاص لباس کا اہتمام کرنے میں بڑا وقت گنواتے ہیں لیکن میں پچھلے اٹھارہ بیس سال میں متعدد غیر ملکوں کا سفر کرنے اور دنیا کے چپے چپے میں گھوم لینے کے باعث اس کا اس درجہ عادی ہوگیا ہوں کہ اب وطن سے باہر جانا میرے معمولات میں اس حد تک شامل ہوگیا ہے ، بلکہ میری فطرت کا ایسا جزو بن گیا ہے ، کہ اگر صرف دو گھنٹے پہلے مجھے کسی سفر پر جانے کی فرمائش ملے تو میں کسی پریشانی یا گھبراہٹ کے بغیر اپنی روانگی کی تیاری کرلونگا بشرطیکہ سرکاری پابندیاں بھی آسان کردی جائیں ۔ پچھلے چند سال سے میری زندگی کا ایک مخصوص حصہ ہوا کے دوش پر گزرنے لگا ہے ۔ اسی لئے رخت سفر میرے ساتھ بہت ہی مختصر ہوتا ہے ۔ ایک چھوٹا اٹیچی کیس ، ایک ہینڈبیگ ، انگریزی اردو کی چند

کتابیں اور رسالے ۔ میں سردی گرمی کی مختلف النوع کیفیات سے بھی خالی الذہن رہتا ہوں ۔ میری شریک حیات نے زور دیا کہ روس کی سردی کے پیش نظر میں اپنا چسٹر ، جسے بہت ہی کم استعمال کیا ہے ، اپنے ساتھ رکھ لوں تاکہ وقت ضرورت کام آجائے لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پندرہ سال پہلے جب میں ایک طبی وفد لے کر چین گیا تھا ، سردی کا زمانہ تھا اور وہاں کی سردی بھی مشہور ہے تو کون سا چسٹر یا گرم پل اوور لے کر گیا تھا ۔ اگر انسان اپنے اندر قوت مدافعت پیدا کرلے تو بیرونی اثرات شکست کھا جاتے ہیں ۔ حتیٰ کہ کوئی وبائی بیماری پھیلے تو جسم اپنی قوت سے کام لے کر جراثیم کو مات دے سکتا ہے ۔ میں سخت سے سخت سردی میں بھی کوئی گرم مشروب نہیں پیتا ۔ لوگ ایسے دنوں میں مجھے ٹھنڈا مشروب پیتے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں ۔

کراچی سے روسی ہوائی جہاز ایئرو فلوٹ کی روانگی کا وقت کسی قدر غیر مناسب تھا ، میرے لئے نہیں کیونکہ میں آدھی رات گزرنے کے بعد اٹھ جانے کا عادی ہوں لیکن مجھے رخصت کرنے والے کیوں پریشان ہوں ۔ چنانچہ میں نے ہمدرد کے ایگزیکٹیو افسروں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ مجھے ”فی امان اللہ“ کہنے کے لئے ہوائی اڈے پر نہ آئیں ، اس لئے بھی کہ اب تو میری زندگی سفروں ہی میں بسر ہوتی ہے ۔ آخر وہ لوگ کب تک اس طرح مجھے روانہ کرتے رہینگے اور لینے آتے رہیں گے ۔ پھر بھی برادر عزیز ڈاکٹر محمد الیاس ، مسز ایل ، اے ، ڈی ، سلوا اور حکیم محمد یٰسین آہی گئے ۔ نیز میری بیٹی سعدیہ اور ان کی نورچشم ماہم سے گھر پر نہ رہا گیا ۔ میں ان سب کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکا

کیونکہ ایک مختصر سا لفظ اس زحمت کا بدل نہیں بن سکتا ۔ ان عزیزوں کے علاوہ ''فرینڈ شپ ہاؤس'' کے ڈائرکٹر مسٹر تلاگانوف بھی مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے ہوائی اڈے پر آگئے ۔ انہیں سفارتی مراعات حاصل ھیں ، اس لئے وہ مجھے ہوائی جہاز تک بٹھانے کے لئے میدان میں چلے گئے ۔ ان کی اس حد تک زحمت کا میں نے خلوص قلب کے ساتھ شکریہ ادا کیا ۔ یہ ان کے بلند اخلاق کا ایک نمونہ تھا ۔

ایئرو فلوٹ

روسی ہوائی کمپنی ''ایئرو فلوٹ'' کے قیام اور اس کے پھیلاؤ کی تاریخ خاصی پرانی اور دلچسپ ہے ۔ اب سے تقریباً نصف صدی پہلے ۱۹۲۶ء کے موسم سرما میں یہ کمپنی قائم ہوئی اور محکمۂ شہری پرواز کا پہلا ہوائی جہاز ماسکو سے اڑ کر الن باٹور کے ہوائی اڈے پر اترا جو منگولی عوامی جمہوریہ کا صدر مقام ہے ۔ اس سے اگلے سال مسافر بردار روسی جہازوں نے ایران اور افغانستان کے ساتھ فضائی رشتہ قائم کرلیا ۔ پھر رفتہ رفتہ ایشیا ، افریقہ اور یورپ کے متعدد ملکوں سے ، جن کی مجموعی تعداد اب پیاسی کے قریب ہے ، اس کا ناطہ جڑتا چلا گیا ۔ اس کے چار ٹربائن انجنوں والے آئی ایل ۶۲ نامی جہازوں کی رفتار نوسو کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور ایک پرواز میں وہ دس ہزار کلو میٹر تک جانے کی طاقت رکھتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک سو چھیاسی تک مسافر بیک وقت سوار ہوسکتے ہیں ۔ جہازوں کی دوسری قسم ٹی یو ۱۵۴ کہلاتی ہے ۔ جن میں نہایت طاقتور تین ٹربو جٹ انجن لگتے ہیں ۔

ان کی رفتار ۹۵۰ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور ایک پرواز میں پانچ ہزار کلومیٹر تک جاسکتے ہیں ۔ ان میں نشستوں کی تعداد ایکسو چونسٹھ تک ہوتی ہے ۔ فضائی کمپنی کے ارباب اقتدار کا نصب العین یہ بتایا جاتا ہے کہ تیز رفتاری ، آرام اور مہمان نوازی میں کوئی دوسری کمپنی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ مجھے ان الفاظ کو سچ ماننے میں تامل ہے ۔ صرف یہ ماننا پڑیگا کہ اس کے جہاز ماسکو سے اڑکر کہیں رکے بغیر ٹوکیو ، پیکنگ ، دہلی ، کراچی اور بمبئی اور صرف ایک جگہ رک کر کوالالمپور ، سنگاپور اور کولمبو پہنچ سکتے ہیں ۔ لیکن اس قسم کا افتخار اور کمپنیوں کو بھی حاصل ہے ۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جہاز میں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے کھانے مسافروں کی مرضی کے مطابق مل سکتے ہیں ۔

میں نے متعدد ہوائی کمپنیوں کے جہازوں میں سینکڑوں بار سفر کیا ہے اور شکایت کی نوبت کبھی نہیں آئی ہے اور نہ کسی اعتراض کی صورت پیدا ہوئی ہے ۔ لیکن اس جہاز کے انجنوں میں لگے ہوئے پنکھوں کا شور کانوں کے پردے متاثر کردینے کے لئے کافی ہے ۔ دوسرے جہازوں میں شور کی شدت اتنی زیادہ نہیں ہوتی ۔ پھر اس جہاز کی کرسیاں آرام دہ نہیں تھیں ۔ قطاروں کے درمیان اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ ٹانگیں اطمینان سے پھیلائی جاسکیں ۔ ایسی صورت میں سب سے اچھی نشست آگے کی ہوتی ہے ۔ میں ہمیشہ اسے ترجیح دیتا اور اپنے لئے بک کرانے کی کوشش کرتا ہوں ۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سامنے کے کاؤنٹر پر کاغذ رکھ کر اپنا کام کرتے رہو اور جب منزل آئے تو اسے لپیٹ کر بریف کیس میں رکھ لو ۔ مگر اس جہاز کی میزبان بد مزاج خاتون

نے اس جگہ غیر روسیوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی اور کراچی اسٹیل ملز کے تین آدمیوں کو، جو اس کے ہم وطن تھے اور کسی کام سے اپنے ملک جارہے تھے، وہاں بٹھادیا۔ مجھے یہ بات اچھی معلوم نہ ہوئی۔

پپری میں مشینی کمپلیکس

اب سے چار سال پہلے بھلا کون تصور کرسکتا تھا کہ کراچی جیسے گنجان آباد شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر پپری جیسے ویران علاقے میں ایک بھاری مشینی کمپلیکس وجود میں آجائیگا جس میں تکمیل کے بعد تقریباً پندرہ ہزار افراد کام کرینگے؟ لیکن ناقابل تصور ایک پرانا سہانا خواب اس وقت حقیقت میں تبدیل ہوگیا جب ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء کو کراچی اسٹیل ملز کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ یہ اسٹیل ملز پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان گہری دوستی کا ثبوت اور سنگ میل ثابت ہوگا۔ اب ہوائی جہاز سے کوئی دشمن نیچے کی طرف نظر ڈالے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیگا کہ وہ جگہ جہاں پہلے صرف گرد آلود ہوائیں چلتی تھیں اور ہر آن یہاں کے نقشے کو بدلتی رہتی تھیں، ایک جدید ترین وسیع کارخانے کی داغ بیل پڑچکی ہے، ساری فضا خوشگوار ہوگئی ہے۔ یہاں کے 'لوگ' جو خانہ بدوشوں کی طرح بکھرے پڑے رہتے تھے اور ماہی گیری کے سوا کسی دوسرے کام سے واقف نہیں تھے، آج دیوہیکل مشینیں چلا رہے ہیں۔ سیکڑوں مقامی اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے افراد نے یہاں تربیت حاصل کرلی ہے اور بعض آئندہ کی توسیع کے

لئے تربیت پارہے ہیں۔ چار سال کے عرصے میں بہت کچھ ہوچکا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس دیو پیکر پروجکٹ میں سوویت پاکستان شراکت مستحکم تر اور بہت زیادہ قریب ہوتی جارہی ہے۔ ملز کے چیرمین کی نگرانی میں ملز سے متصل ایک نئے شہر کی تعمیر بھی جاری ہے جس میں یہاں کے کام کرنے والے آباد ہوتے جارہے ہیں۔ اب تک ڈھائی سو خاندانوں کو رہائش کی سہولتیں مل گئی ہیں۔ چند ماہ ہوئے سوویت یونین کی بیرونی معاشی تعلقات کی ریاستی کمیٹی کے ڈپٹی چیرمین جناب و۔ ا۔ سرگی ئیف کام کا جائزہ لینے یہاں آئے تھے۔ وہ منصوبے کے تعمیری مراحل سے بہت خوش تھے۔ کراچی میں ایک بڑی پریس کانفرنس میں انہوں نے اپنے دورے کے تاثرات پیش کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا اور کام کرنے والوں کو مبارک باد دی۔ مبتدیوں کو تربیت دے کر ماہر فن بنانے والے ادارے کے پرنسپل جناب وھاب صدیقی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے کام کی رفتار پر روشنی ڈالتے ہوئے آئندہ کے لائحہ عمل کی ایک جھلک دکھائی تھی۔ اس کارخانے میں ہر سال تقریباً گیارہ لاکھ ٹن وزنی لوہے اور فولاد کی مشینیں تیار ہوسکینگی۔ اس مقصد کے لئے سوویت حکومت پاکستان کو نرم شرائط پر قرضے اور امداد دے رہی ہے۔

جنوری ۱۹۷۸ء میں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے ہنوز زیر تعمیر اس اسٹیل ملز کے متعدد حصوں کے تفصیلی دورے کے دوران سوویت ماہروں، انجینئروں اور مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''آج کی دنیا میں قومیں ایک دوسرے کو ان کی ترقی

میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ ہمارا دوست ملک سوویت یونین پچھلے چار سال سے اس ملز کی تعمیر کے لئے فنی امداد کی فراہمی میں ہماری اعانت کر رہا ہے، جس کے لئے ہم اس حکومت کے شکرگزار ہیں۔ جب کراچی اسٹیل ملز مزدوروں کی محنت سے بن کر تیار ہوجائیگا تو پاکستان ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہوگا۔ اس وقت یہ ملز پاکستان کی معیشت کا مضبوط ستون ثابت ہوگا"۔

انہوں نے اسٹیل ملز میں کام کی رفتار تیز تر کرنے کی غرض سے تعمیر گاہ پر افرادی قوت میں اضافہ کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے پاکستان میں روس کے سفیر جناب ایس۔ اے عظیموف سے درخواست کی کہ وہ ان کا شکریہ سوویت یونین کے رہنماؤں تک پہنچادیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے زور دے کر یہ بات کہی کہ مزدوروں کو چاہیے کہ اس اہم پروجکٹ کی تعمیر کو جس قدر جلد ممکن ہوسکے پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ انہوں نے کہا اس پلانٹ کا فولاد پاکستان کی قومی معیشت کی ترقی کی بنیاد بن جائیگا۔ اس موقع پر سوویت چیف انجینئر اے، آئی یومارنیکو نے انہیں کنورٹر پلانٹ کا ماڈل اور تعمیراتی کام سے متعلق تصویروں کا ایک البم پیش کیا جسے انہوں نے بخوشی قبول کرلیا۔

پلانٹ کے فنی ڈیزائن اور پاکستانی ماہرین کے تیار کردہ تخمینوں کے مطابق پلانٹ کے چالو ہونے کے ابتدائی دور ہی میں

ملک کی پگ آئرن اور اسٹیل بلٹ کی ضروریات کافی حد تک پوری ہونے لگیں گی جس کی وجہ سے پاکستان کو ان کی برآمدات پر خرچ کی جانے والی رقم میں کمی کرنے کا اچھا موقع ملیگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس وقت ملز کے مختلف شعبوں میں کوئی پندرہ ہزار سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں۔ ایک معاشی سروے کے مطابق ۱۹۷۸-۷۹ء میں یہ اسٹیل ملز جزوی طور پر پیداوار شروع کردیگا اور پھر ۱۹۸۳-۸۴ء میں جب مکمل پیداوار حاصل ہونے لگیگی تو مال کی فروخت سے ایک اندازے کے بموجب کوئی پانچ ارب سولہ کروڑ اسی لاکھ روپے کی رقم حاصل ہوگی۔ نیز اس کی وجہ سے دو ارب، پچیس کروڑ، پچاس لاکھ روپے کے زرمبادلہ کی سالانہ بچت ہوگی۔ ملز کی بستی آٹھ ہزار، ایک سو، چھبیس ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ پہلے مرحلے کے طور پر کوئی پانچ سو خاندان اس بستی میں منتقل ہوچکے ہیں۔

ان تمام مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں حکومت اور عوام کی جانب سے سوویت یونین کی حکومت پر خلوص شکریہ کی مستحق ہے۔

میزبان خاتون کا برتاؤ

لیکن اس احسان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے جہاز میں بیٹھنے کے لئے اگلی سیٹ نہ دی جائے اور میرے نام بک ہونے کے باوجود کسی روسی افسر کو دیدی جائے۔ میں نے احتجاج کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اور معاملات میں میزبان خاتون کا برتاؤ کس نوعیت کا رہتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۵ء میں جب میں امیر خسرو اور فارابی کے جشن میں شرکت

کرنے کے لئے ماسکو جارہا تھا تو وہ رمضان المبارک کے دن تھے۔ میں نے گھڑی دیکھ کر اور وقت کے فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے سحری کرنے کا اندازہ لگایا اور ایئرو فلوٹ پر میزبان خاتون سے آب سنگترہ یا کوئی اور جوس مانگا تو اس نے کسی قدر بے رخی سے کہا کہ جہاز پر جوس نہیں ملتا۔ میں نے مجبوراً پانی کا گلاس نوش جان کر کے روزہ رکھ لیا - پھر جب ماسکو سے دوشنبہ گیا تو میں نے دیکھا کہ سخت سردی کی وجہ سے دو بچے ٹھٹھر رہے ھیں۔ بچوں کے باپ نے اپنا کوٹ اتار کر بچوں پر ڈال دیا اور خود اکڑتا رہا۔ جہاز پر کمبل نہیں تھے۔ ھوسکتا ھے کہ دن کے وقت پرواز کی صورت میں ان کی فراھمی ممکن نہ ھوتی ھو لیکن ھنگامی حالات میں ھر چیز کا اھتمام ضروری ھوتا ھے۔ تاھم اس بار ایئرو فلوٹ نے دوپہر کے وقت بڑی خاطر داری کی۔ عمدہ قسم کا لنچ دیا گیا لیکن میں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ عرصۂ دراز سے میری عادت ھے کہ میں دن کو ھلکا ناشتہ کرتا ھوں اور کچھ نہیں کھاتا - صرف رات کا کھانا میرے لئے کافی ھے۔ میں زندہ رھنے کے لئے کھاتا ھوں، کھانا کھانے کے لئے زندہ نہیں ھوں - زیادہ کھانے سے میری مصروفیات میں اور میرے مشاغل میں خلل پڑتا تھا، اس لئے میں نے اس میں خاطر خواہ کمی کردی۔ میں دوپہر کو کچھ نہ کھانے سے زیادہ چاق و چوبند رھتا ھوں۔ صبح میں آب فواکہ اس لئے پیتا ھوں کہ علی الصبح ٹینس کے دو سیٹ کھیل لینے کے بعد پیٹ میں کچھ نہ کچھ چلا جانا چاھئے - لہذا جب میزبان خاتون میرے لئے لنچ لائیں تو میں نے شکریہ کے ساتھ اسے واپس کردیا۔ انہوں نے پوچھا کہ پینے کے لئے

کچھ لاؤں؟ میں نے جواب دیا کہ ھاں کوئی ٹھنڈا مشروب اور ممکن ھو تو دودھ۔ انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

تہران میں عارضی قیام

تین گھنٹے کی اڑان کے بعد روسی جہاز ایران کے صدر مقام تہران پر اترا۔ آج سے چند سال قبل ایران پہنچ کر دل بہت خوش ھوتا تھا۔ یہ حافظ و سعدی، خیام اور نظامی کی سر زمین ھے۔ فردوسی کا شاھنامہ یہیں لکھا گیا تھا۔ بوعلی سینا نے اپنے طبی تجربات اسی جگہ رھنے والوں پر کئے تھے۔ قرۃ العین کے نغمے اب بھی یہاں کی فضا میں گونجتے ھیں۔ ایران علاقائی تعاون کے ادارے میں پاکستان اور ترکی کا شریک رکن ھے۔ لیکن یہ تعاون اب صرف زیب داستان بن گیا ھے۔ ایران کو صرف اپنی سر زمین سے محبت ھے۔ پڑوسی ملکوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رھی۔ یہ شاید اس لئے ھے کہ اس ملک کی بے اندازہ دولت نے اور شاہ کے ذاتی مزاج نے ان کو احساس برتری میں مبتلا کردیا ھے۔ پاکستان کے ساتھ شاہ کا برتاؤ اس خلوص پر مبنی نہیں ھے جو صدر پاکستان ایوب خاں کے زمانے میں وافر تھا۔ وہ صدر ایوب سے درخواست کیا کرتے تھے کہ ھوائی جہاز میں ذرا تہران سے ھوکر گزر جائیے۔ اس سے میرے ملک کو استحکام نصیب ھوا کرتا ھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب بھٹو ایران گئے تو ان کی آمد کی خبر اخبار کیہان نے آخری صفحے پر دی اور لکھا کہ بھٹو بھو کے پاکستانیوں کے لئے کھانا لینے آئے ھیں - اخبار نویس ھوا کے رخ کے ساتھ ساتھ سربراہ مملکت کے مزاج کا رنگ دیکھتے ھیں اور اسی انداز کی

باتیں کرتے ہیں۔ پاکستانیوں کے ساتھ شاہ کا سلوک اہانت آمیز ہے ، جب ہی تو ایک اخبار نویس کو یہ الفاظ لکھنے کی جراٴت ہوئی۔ تہران کا ہوائی اڈا اور میدان زرد دولت کی کرشمہ سازیوں کا مظہر ہے ۔ یہ دولت کا غلط استعمال ہے ۔ لیکن سب فرمانروا ایسا نہیں کرتے ۔ سعودی عرب کے فرمانرواؤں نے بھی تیل سے بڑی دولت کمائی لیکن حاجیوں کے آرام و سہولت اور خانہٴ خدا کی آرائش و تزئین کے لئے جو کچھ کیا وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے ۔ ایران کا خیال ہے کہ وہ پانچ چھ سال میں مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی طاقت ہوگا ۔ رستم و سہراب اور افراسیاب کی داستانیں اب طاق نسیاں کی زینت بن چکی ہیں۔ سر زمین ایران نے کوئی دوسرا فردوسی پیدا نہیں کیا ہے ۔ اس لئے شاہ کے خواب کی تعبیر کوئی نیا طلسم سامری ہی برلاسکتا ہے ۔ ان تاثرات کے ہوتے ہوئے تہران کے ہوائی اڈے پر اترتے وقت اس دفعہ مجھے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی ۔

تھوڑی سی کوفت اس لئے بھی ہوئی کہ آدھی رات بلکہ صبح کاذب کے وقت تمام مسافروں کو جہاز سے اتار کر ٹرانزٹ لاؤنج میں لے جانا بڑی زیادتی تھی ۔ دوسری بین‌الاقوامی کمپنیاں ایسا نہیں کرتیں ۔ سوچنے کی بات ہے ۔ عارضی قیام صرف پینتالیس منٹ کے لئے تھا ۔ جہاز سے اترنے اور کمرہٴ انتظار تک جانے میں دس منٹ صرف ہوگئے اور اتنا ہی وقت واپس آنے اور جہاز پر دوبارہ سوار ہونے میں لگ گیا ۔ اس طرح لاؤنج میں بیٹھنے کا عرصہ بیس یا پچیس منٹ کے برابر تھا ۔ یہ زحمت آخر کیوں دی گئی ۔ سب مسافر جہاز ہی میں بیٹھے رہتے تو کیا حرج تھا ۔ اندر کسی جھاڑ

پونچھ یا صفائی کی ضرورت بھی نہیں تھی ۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں کیا گیا ۔ کیا مقصد یہ تھا کہ مسافر تہران میں ہوائی اڈے کی انتظار گاہ دیکھ لیں ۔ وہاں جو آرائشی سامان تھا اس پر کسی نے اچٹتی ہوئی نظر بھی نہیں ڈالی ہوگی ۔

ماسکو میں

پون گھنٹے بعد سفر دوبارہ شروع ہوگیا اور چند ساعت گزرنے پر منزل مقصود آگئی ۔ جب پاکستان میں صبح کے پونے دس بجے تھے ماسکو میں پونے آٹھ بجے کا عمل تھا ۔ ایک دم اعلان ہوا کہ ہوائی جہاز ماسکو کے ہوائی میدان پر اترنے والا ہے ۔ میں حیران تھا کہ بڑی طویل مسافت بہت جلد طے کرلی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایئروفلوٹ کے طیارے نسبتاً زیادہ تیز رفتار ہوتے ہیں ۔ عرصہٴ دراز سے سوویٹ یونین کی طیارہ سازی کی صنعت میں ترقی کا رجحان اس طور پر ہے کہ زیادہ مسافر اور زیادہ سامان کو لے جایا جائے اور فضائی حمل و نقل کی رفتار بڑھتی رہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان کو آواز سے زیادہ تیز رفتار طیاروں کی ضرورت ہے ؟ کیا اس تیز رفتاری سے اس کی صحت پر کوئی برا اثر پڑسکتا ہے ؟ ماسکو سے الما عطا یعنی کزاخستان کے دارالحکومت کے راستے پر ٹی ۔ یو ۱۴۴ نامی طیارہ باقاعدہ اڑا یا گیا ۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ آواز سے کم رفتار کے ہوائی جہازوں کے مقابلے میں اس پر سفر کرنا زیادہ خوشگوار ہے ۔ اس میں جھٹکے نہیں لگتے اور پرواز کے وقت میں ۶۶ تا ۷۰ فیصد تک بچت ہوجاتی ہے ۔ اس طیارے کی رفتار ڈھائی ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور ایک ہوائی جہاز اپنی

زندگی میں تیس ہزار گھنٹے پرواز کر سکتا ہے ۔ بالفاظ دیگر اس مدت میں ٹی ۔ یو ۱۴۴ زمین سے چاند تک کے فاصلے کو تقریباً دو سو اسی بار عبور کرلیگا ۔ اس کے بعد سپر سونک پروازوں کا سلسلہ شروع ہوگا ۔ آخری منزل نہ جانے کہاں ہوگی !

ماسکو میں کئی ہوائی مستقر ہیں لیکن یہ چار سب سے زیادہ مصروف رہتے ہیں :

(۱) شیریمت یے وو ۔ (۲) ونو کووو ۔ (۳) بائی کووو ۔ (۴) ڈوموڈی ڈووو ۔ ان میں سے موخر الذکر دو دوسری جنگ عظیم کے دوران تعمیر ہوئے تھے کہ جب ہوائی نقل و حمل کی رفتار تیز تر ہو گئی تھی ۔ فوجیوں کو اور فوجی ساز و سامان کو ان ہوائی اڈوں سے لیجانا اور لانا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا جو شہری پروازوں کے کام آتے تھے ۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد ان کو قائم رکھا گیا ۔ البتہ وہ سامان کی بار برداری کے لئے مخصوص کردئے گئے ۔ ان پر مسافر بردار جہاز بھی اترتے ہیں ۔ لیکن مسافروں کی زیادہ آمد و رفت اول الذکر دو ہوائی اڈوں پر رہتی ہے ۔ ان دونوں پر روزانہ تقریباً دو لاکھ مسافر اترتے چڑھتے ہیں ۔ اس ضمن میں اوسطاً ڈیڑھ ہزار چھوٹے بڑے جہاز ، جن میں غیر ملکی ہوائی جہاز بھی شامل ہیں ، یہاں اترتے یا پرواز کرتے ہیں ۔ ان سب اڈوں پر فضائی پرواز سے متعلق ہر قسم کی سہولتیں میسر آسکتی ہیں ۔ ان اڈوں سے وسیع شہر کے مختلف حصوں میں پہنچنے کے لئے سڑکوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن کی دیکھ بھال خاطر خواہ انداز میں کی جاتی ہے ۔

میں جہاز سے باہر آیا تو سفارت خانہ پاکستان کے دو

نمائندوں کو وہاں موجود پایا ۔ ایک اقبال صاحب تھے جو مجھے لینے آئے تھے ۔ دوسرے منظر شفیق صاحب تھے جو نائب سفیر احمد کمال صاحب کو لینے آئے تھے ۔ میں نے احمد کمال صاحب کو جہاز پر پرواز کے دوران نہیں دیکھا تھا ، حالانکہ میں ان سے واقف ضرور تھا ۔ خیر وہ اترے تو میں ان سے ملا ۔ کچھ عرصے پہلے وہ پیرس میں تھے ۔ وہ یونیسکو سے متعلق نیشنل کمیشن اور خود یونیسکو سے تعلق رکھتے تھے ۔ میں کئی بار پیرس گیا لیکن وہاں ان سے کبھی شرف ملاقات حاصل نہ ہوا تھا ۔ اب وہ ماسکو میں سفارت خانہ پاکستان میں نائب سفیر (ناظم الامور) ہیں ۔ ان کی طرف سے میرا ذہن صاف نہیں تھا کیونکہ وہ پیرس میں ایک بار مجھے وقت دے کر بھی نہیں ملے تھے ۔ خصوصاً اس وقت کہ جب میں یونیسکو کے افسران سے ان کے ماہنامہ کوریئر کا اردو ایڈیشن پاکستان سے نکالنے کے سلسلے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا ، ان کو موجود ہونا چاہئے تھا ۔ وہ اس موقع پر نہیں آئے ۔ البتہ ان کے سکریٹری جناب آفریدی نے مذاکرات میں شرکت کی تھی ۔ خیر آج ان سے ملاقات ہوگئی ۔ میں نے اخلاقاً ان کی بیگم صاحبہ کو بھی سلام کرلیا مگر انہوں نے جواب عطا نہیں کیا جو اسلامی معاشرے میں ضروری ہوجاتا ہے ۔ منظر شفیق صاحب نے فرمایا :

''حکیم صاحب ! آپ کی تشریف آوری کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں تھی ۔ نہ آپ کے پروگرام کا ہمیں کوئی علم ہے ''۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دل ہی دل میں کچھ پریشان سے تھے کہ اب ان کو میرے لئے کوئی زحمت اٹھانی پڑیگی ۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ ذرا بھی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے

کیونکہ وزارت خارجہ روس کا کوئی نہ کوئی نمائندہ میری پذیرائی کے لئے یہاں موجود ہوگا اور ان ہی کو میرا انتظام کرنا ہے۔ انہیں اس وقت تک بے چینی رہی جب تک کہ مس مارگریٹا وی آئی پی روم میں نہ آگئیں۔ وہ مجھے لینے آئی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملیں۔ وہ اردو خوب بولتی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے لئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے شاگردوں مں شامل تھیں۔ مجھے یہ سن کر تھوڑی سی مایوسی ہوئی کہ سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر صاحب ، جن کو میں نے اپنی روانگی سے قبل مطلع کردیا تھا ، اپنی اہلیہ محترمہ روح افزا بیگم صاحبہ کو ساتھ لے کر فن لینڈ کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اقبال صاحب نے بتایا کہ سفیر صاحب نے آپ کی پذیرائی کے لئے مجھے پوری طرح ہدایات دی ہیں۔ آپ ان کے گھر بھی قیام کرسکتے ہیں۔ ان کی موٹر بھی حاضر ہے۔ جناب محترم اقبال صاحب نے یہ بات اس وقت بتائی کہ جب مس مارگریٹا آگئیں اور انہیں پتہ چل گیا کہ اب ان کی کوئی ذمہ‌داری نہیں ہے۔ کام سے ہمارے سفارتی نمائندے عموماً گھبرایا ہی کرتے ہیں۔

ہوٹل یوکرائن میں

ہوائی میدان کی روایتی کارروائیاں جلد ہی ختم ہوگئیں اور میں باہر نکل آیا۔ میرا سامان بھی لاکر موٹر میں رکھ دیا گیا جو روسی وزارت خارجہ نے بھیجی تھی۔ احمد کمال صاحب اپنے سفارت خانے کی موٹر میں روانہ ہوگئے۔ اقبال صاحب مجھے چھوڑنے

کے لئے ہوٹل تک آئے۔ میرا قیام سرکاری طور پر ہوٹل یوکرائن میں کیا گیا تھا۔ بڑی پر شکوہ عمارت ہے۔ ماسکو میں بہ شمول ماسکو یونیورسٹی ایسی شاندار دس عمارتیں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد جرمن قیدیوں نے ان دس عمارات کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ مس مارگریٹا نے سچ کہا کہ جو لوگ ہماری آزادی کو تاخت و تاراج کرنے آئے تھے کیا ان کو اتنی سزا بھی نہ دی جاتی کہ وہ ان عمارتوں کی تعمیر میں ہاتھ بٹائیں۔

شروع میں روس بہت بڑا ملک نہیں تھا۔ قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے علاقے، جن کو ریاستوں کی حیثیت حاصل تھی ، رفتہ رفتہ اس ملک سے الحاق کرتے رہے اور اس طرح سوویت یونین وجود میں آگئی۔ اس وقت پندرہ ریاستی جمہوریتیں سوویت وفاق میں شامل ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

روسی سوویت وفاقی اشترا کی جمہوریہ (روس) یوکرین سوویت اشترا کی جمہوریہ (یوکرین) بائلو روسی سوویت اشتراکی جمہوریہ (بائلوروس یعنی سفید روس) ازبک سوویت اشتراکی جمہوریہ (ازبکستان) کزاخ سوویت اشتراکی جمہوریہ (کزاخستان) جارجیائی سوویت اشتراکی جمہوریہ (جارجیا) آذربائجان سوویت اشتراکی جمہوریہ (آذربائجان) لتھونیائی سوویت اشتراکی جمہوریہ (لتھونیا) مولداویائی سویت اشتراکی جمہوریہ (مولداویا) لت ویائی سوویت اشتراکی جمہوریہ (لت ویا) کرغز سوویت اشتراکی جمہوریہ (کرغزیہ) تاجک سویت اشتراکی جمہوریہ (تاجکستان) آرمینی سوویت اشتراکی جمہوریہ (آرمینیا) ترکمانی سوویت اشتراکی جمہوریہ (ترکمانیہ) استونیائی سوویت اشتراکی

جمہوریہ (استونیا)۔ ان کے علاوہ بیس خود مختار جمہوریتیں، آٹھ خود مختار علاقے اور دس قومی علاقے بھی شامل ہیں۔ سوویت یونین میں سو سے زیادہ قومیں اور قومیتیں آباد ہیں۔ بے دین لوگوں کے علاوہ تقریباً پانچ مذاہب کے ماننے والے بھی یہاں رہتے ہیں جن کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائی میں شخصی آزادی حاصل ہے۔ سوویت یونین میں ریاستی اقتدار کا اعلیٰ ترین ادارہ سوویت یونین کی سپریم کونسل ہے۔ تمام جمہوریتوں اور علاقوں کو اس کونسل میں براہ راست نمائندگی ملتی ہے۔ انتظامیہ کا اعلیٰ ترین ادارہ یونین کی مجلس وزراء ہے۔ اس کی تشکیل یونین کی سپریم کونسل کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے۔

اس سلسلۂ خیال کی کڑیاں ہوٹل یوکرائن سے ملتی ہیں جہاں میرے قیام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل درحقیقت مغربی سیلانیوں اور سیاحوں کی رہائش کا مرکز بنتا ہے۔ لیکن ان دنوں اور بھی غیر معمولی گہما گہمی تھی کیونکہ وہاں سوشلسٹ پارٹی کا سالانہ جلسہ ہورہا تھا۔ اس لئے اس سیاسی جماعت کے سبھی اراکین جو یقیناً اہم مراتب کے حامل کہے جاسکتے ہیں، وہاں مقیم تھے۔ یوں بھی ماسکو میں سیاحوں کا موسم تھا۔ مغرب کے لوگ جوق در جوق آرہے تھے۔ ہوٹل میں بالکل گنجائش نہیں رہی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو استقبالیہ پر خاص دیر لگی کیونکہ عین اس وقت ڈیوٹی بدلنے والی تھی۔ موجودہ خاتون نے مجھ سے کہا:

”ذرا توقف فرمائیے۔ اگلی ڈیوٹی پر آنے والی خاتون آپ کو کمرہ الاٹ کردینگی۔ اصولی طور پر آپ کی بکنگ ہوگئی ہے“۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ وہ خاتون مجھ سے اردو

اور دوسروں سے روسی زبان بول رہی تھیں۔ ان میں شائستگی کے ساتھ ساتھ انتہائی سادگی تھی۔ اقبال صاحب نے چپکے سے بتایا کہ یہاں تنخواہ سب کے لئے یکساں ہے، یعنی نقد صرف آسی روبل ملتے ہیں۔ باورچی اور خانساماں کو بھی، استقبالیہ خاتون کو بھی اور منیجر کو بھی۔ یہ بات میرے لئے بالکل نئی تھی، اس لئے کسی قدر تعجب خیز تھی۔ اس میں اچھائی تھی اور برائی بھی۔

چند منٹ بعد دوسری خاتون نے چارج لے کر مجھے اوپر کی ایک منزل پر کمرہ نمبر ۵۶۱ الاٹ کردیا۔ میں لفٹ کے ذریعہ سے اوپر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ ابھی خالی ہوا ہے، اس لئے صفائی نہیں ہوئی اور پوری طرح آراستہ نہیں ہے۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ چند منٹ برآمدے میں انتظار کروں، جہاں صوفے بچھے ہوئے تھے۔ مس مارگریٹا کچھ بے چین سی نظر آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرہ صاف اور آراستہ ہوگیا اور میں اس میں سما گیا۔

گاہے گاہے بازخواں....

یادش بخیر ۱۹۷۵ء میں جب میں امیر خسرو دہلوی کے جشن میں شرکت کے لئے اس سر زمین پر پہنچا تھا اور جمیل الدین عالی صاحب میرے ساتھ تھے تو ہمارے قیام کا اہتمام ”ہوٹل نیشنل“ میں کیا گیا تھا جیسا کہ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ عالی صاحب اچھی رنگین طبیعت کے مالک ہیں، اور کیوں نہ ہوں، شاعر جو ٹھیرے۔ پائے کے شاعر اور ہندی انداز کے دوہے لکھنے والے شاعر۔ اس دوران قیام میں ہم ایک روز ہوٹل کے رستوران میں چلے گئے۔ یہ امریکی انداز کا میخانہ بھی تھا۔ عالی صاحب کی رگ

میخواری تڑپی مگر انہوں نے ہوٹل کی میزبان کو بلاکر اپنے لئے مشروب سادہ کا آرڈر دیدیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں اس شغل سے اپنے آپ کو محروم رکھتا ہوں۔ میں نے اسے امریکی انداز کا میخانہ اس لئے کہا کہ وہاں بل امریکی ڈالر میں ادا کیا جاتا ہے۔ روسی روبل قبول نہیں کئے جاتے۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ میں نے اپنے لئے ایک گلاس جوس منگا لیا تھا۔ یہ جوس شاید گریپ فروٹ کا تھا۔ تلخی بہت تھی مگر میرے لئے اس میخانے کے ماحول کی تلخی کیا کم تھی۔ اس تلخی میں ایک اور اضافہ اس لئے ہوا تھا کہ عالی صاحب کے پہلو میں ایک روسی جوان خاتون آکر بیٹھ گئی اور اس نے بلا تکلف عالی صاحب کی بانھ میں اپنی بانھ ڈال دی اور بڑے انداز میں کہا کہ مجھے بھی ایک جام عطا ہو سرکار! عالی صاحب نے مجھے دیکھا۔ میں نے اردو زبان میں ان کو اشارہ کردیا۔ میں نے کہا کہ وہ تنہا نہیں تھی۔ ایک اور فاحشہ اسکے ساتھ تھی اور دور بیٹھی ہمارے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جوس کی تلخی نے مجھے ماحول کا جائزہ لینے میں مدد دی تھی۔ عالی صاحب نے میری بات مان لی تھی، مگر وہاں سے ہمیں اٹھ جانا پڑا کہ وہ عورت ہر لمحہ عالی صاحب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اور کوئی حادثہ، فاجعہ پیش آجانے کا خطرہ غالب آچلا تھا۔ میں نے وہاں سے اٹھنے سے پہلے منہ کا مزا ٹھیک کرنے کے لئے آئس کریم منگالی تھی اور عالی صاحب نے ''بیضہ، مچھلی'' (کے ویر) جو بڑی قیمتی چیز ہے، ٹوسٹوں پر لگا کر نگلنے شروع کردئے تھے۔ عالی صاحب نے مجھے گواہ بنانا چاہا کہ فیض احمد فیض صاحب جیسے روسی المزاج پاکستانی دعوا کرتے ہیں کہ

روس میں فحاشی ختم کردی گئی ہے، عصمت فروشی بالکل نہیں ہوتی۔ اب بتائیے کہ یہ عورتیں کون تھیں۔ میں انکی گواہی دینے کے لئے تیار ہوگیا کہ وہ طوائفیں تھیں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ شادی نہیں ہوئی تو کیا، باراتیں تو بہت سی دیکھی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ عیاشی کرنے کے بعد ہی عیاش مزاج لوگوں کو سمجھا جائے۔

اقبال صاحب کی رائے ہوئی کہ میں مس مارگریٹا کو ایک بجے تک کے لئے رخصت کردوں تاکہ یہ ''رپورٹنگ'' وغیرہ کرلیں۔ میں نے ان کی بات مناسب سمجھی۔ اندازہ یہ ہوا کہ خود مارگریٹا بھی یہی چاہتی تھیں۔ گو رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میں ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنا چاہتا تھا مگر اقبال صاحب کا مشورہ تھا کہ میں ان کے ساتھ چل کر ''پانوراما'' کی سیر کرلوں۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔ ریاست ہائے متحدہ کی حکومت پاکستانی قارئین کے لئے انگریزی زبان میں ایک ماہنامہ ''پانوراما'' اور اردو زبان میں ''سیر بین'' شائع کرتی ہے۔ لیکن یہاں مطلب دوسرا تھا۔ لہذا میں آمادہ ہوگیا۔ البتہ غسل کر کے تازہ دم ہوجانا ضروری تھا۔ میں بارہ مہینے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کا عادی ہوں، خواہ اپنے وطن میں رہوں یا چین، روس، جاپان میں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ لوگوں کو میرے اس معمول پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن میری بچپن سے یہی عادت رہی ہے۔

پانوراما کی سیر

سفارت خانے کی موٹر موجود تھی۔ اقبال صاحب مجھے

پانوراما لے گئے۔ ایک وسیع عمارت کو تاریخی واقعات سے سجایا گیا تھا۔ فرانس کے مرد آهن نپولین بونا پارٹ نے ۱۸۱۲ء میں روس پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ایک روسی جرنیل نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بیٹھ کر دوسرے جرنیلوں اور کمانڈروں کو ہدایت کی تھی کہ نپولین کی فوجوں کو ماسکو میں بے روک ٹوک داخل ہونے دیا جائے اور اپنی فوجیں احتیاط کے ساتھ شہر کے چاروں طرف پھیلادی جائیں۔ اس طرح محاصرہ کر لینے کے بعد دائرہ رفتہ رفتہ تنگ کیا جائے اور فرانسیسی فوجوں پر قابو پالیا جائے یا انہیں شکست خوردہ حالت میں مراجعت کے لئے مجبور کیا جائے۔ چنانچہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور نپولین کی فوجیں بہت سی توپوں، فوجی گاڑیوں اور جنگی ساز و سامان کو چھوڑ کر فرار ہوگئیں۔ پانوراما میں وہ سامان محفوظ کر کے نمائش کے لئے رکھا گیا ہے اور میدان جنگ کی نقشہ کشی اس طرح کی گئی ہے کہ سارے مناظر کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ میدان جنگ کو حقیقت سے قریب تر دکھایا گیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ کی لڑائی ہورہی ہے۔ فوجیوں کے پتلے بر سر پیکار ہیں۔ کہیں کہیں مصوروں نے بھی اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ یہ سیر بہت دلچسپ اور معلومات افزا رہی۔

ساڑھے بارہ بجے اقبال صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کی اہلیہ اور دو بچے بڑے تپاک سے ملے۔ ان کا ایک بچہ اسپتال میں داخل ہے۔ اس کی ایک آنکھ میں قرنیہ پر زخم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی تجویز پر بچے کی ماں کا خون نکال کر زخم کے قریب اس کے دو انجکشن لگائے گئے۔ یہ طریق علاج نہ جانے کیا ہے۔

میں نے زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ روس میں علاج اور جراحی کے طریقے بہت ترقی کر گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی نئی دریافت ہو۔

ماسکو کے جس مکان میں سفارتی ارکان رہتے ہیں وہاں باہر پولس کی چوکی لازماً ہوتی ہے۔ وہ یہاں ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ذرا سا شبہ ہوجائے تو پوچھ گچھ شروع کردیتے ہیں۔ سفارتی نمائندوں پر بھی پابندیاں ہیں۔ وہ وزارت داخلہ کی اجازت کے بغیر ماسکو کی مقررہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ اس اعتبار سے روس بڑا مشکل ملک ہے۔ سفیروں سے وہاں کے لوگ کوئی ربط ضبط رکھ ہی نہیں سکتے۔ میں ۱۹۷۵ء میں یہاں آیا تو بابا جان غفوروف میرے ساتھ ساتھ پاکستانی سفارت خانے میں آ گئے تھے۔ ان کی ہمت قابل داد ہے۔ ایسی جرات کوئی نہیں کرسکتا۔ یا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ اور با اثر شخصیت کی وجہ سے مستثنیٰ سمجھے گئے ہوں۔

آدھ گھنٹے بعد یعنی تقریباً ایک بجے اقبال صاحب نے مجھے واپس لاکر ہوٹل یوکرائن چھوڑ دیا۔ یہاں مس مارگریٹا مری منتظر تھیں۔ میں نے اقبال صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انہیں رخصت کردیا۔ پھر میں مس مارگریٹا کے اصرار پر ان کے ساتھ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں چلا گیا، جہاں میں نے ناشتے کے انداز میں کچھ کھا پی لیا، کیونکہ میں دوپہر کو ناشتے کا عادی ہوں۔ مس صاحبہ نے کھانا نوش جان کیا۔ بل انہوں نے ادا کردیا۔ ان کو سرکاری طور پر ہدایت تھی کہ میرا سارا خرچ وہ برداشت کریں۔

مصنفین کی انجمن

اس کے بعد پتہ چلا کہ چار بجے میری ملاقات دفتر متعلقہ میں ہے۔

شعبۂ تعلقات عامہ کے ماتحت روسی مصنفین اور غیر ملکی مصنفین کی ایک انجمن قائم ہے۔ ماسکو میں اس کا صدر دفتر ہے اور دوسرے شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ اسی شعبے کے ماتحت دوسرے ملکوں میں روسی دوستی کی انجمنیں قائم ہیں۔ روس کے شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور صحافی ان انجمنوں میں برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ دفتر میں قائم شدہ لائبریریوں سے استفادہ کرتے اور آپس میں تبادل خیال کرتے ہیں۔ ماسکو میں انجمن کے دفتر کی نگراں مادام مریم سلگانک لےووناہیں۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتی ہیں۔ ذرا کوشش کر کے اردو بھی بول لیتی ہیں - کچھ عرصے پاکستان میں رہ چکی ہیں۔ مگر زیادہ عرصہ انہوں نے ہندوستان میں گزارا ہے۔ ہم وہاں وقت سے ذرا پہلے پہنچ گئے تھے - اس لئے چند منٹ انتظار کرنا پڑا - لیکن ٹھیک چار بجے ملاقات ہوگئی - کمرۂ ملاقات مصنفین کی بڑی عمارت میں ہے جہاں اس وقت بڑی چہل پہل تھی لیکن بہت سے لوگ مشکل سے اہل قلم لگتے تھے - مادام مریم سلگانک سے اور ان کے رفقائے کار سے بات چیت شروع ہوئی جو دلچسپ اور معلومات افزا تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کے پاس میرا بایو ڈیٹا (حالات زندگی) نہیں ہے - میرے بریف کیس میں چھپی ہوئی چند کاپیاں موجود تھیں۔ میں نے فوراً ایک کاپی ان کو دیدی - وہ بہت خوش ہوئیں - وہ

میرے بارے میں اخبارات میں تعارفی نوٹ چھپوانا چاہتی تھیں۔ اس سے سہولت ہوگئی - صدرالدین عینی سے متعلق میرے مقالے کا ذکر آیا تو میں نے ان کو بتادیا کہ میں کراچی سے چھپوا کر اپنے ساتھ لایا ہوں - اس سے ان کو بڑا اطمینان ہوا - ان کا خیال تھا کہ میرے پاس ایک مسودہ ہوگا اور تقسیم کرنے کے لئے انہیں ٹائپ کرانا ہوگا - انہوں نے بتایا کہ وہ اس کا ترجمہ روسی زبان میں فوراً کر کے طبع کرائینگی - اس لئے تقاضہ کیا کہ میں اس کی ایک کاپی وقت سے پہلے انہیں پہنچادوں - میں نے وعدہ کرلیا - مس مارگریٹا نے اشارتاً کہا کہ وہ اس کا اہتمام کردینگی -

مادام کام میں بڑی مستعد اور ہر چیز سے باخبر رہتی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ روسی مصنفین کا ایک وفد پاکستان جانے والا تھا - وہ اسی مہینے کسی تاریخ تک وہاں پہنچیگا - انہوں نے بتایا کہ اس وفد کے قائد پر حملۂ قلب ہوگیا ہے اور معالجین نے ان کے لئے طویل بیرونی سفر غیرموزوں قرار دیدیا ہے - اس لئے اب وفد اس ماہ کی بجائے اکتوبر یا نومبر میں جائیگا - وفد کے پروگرام کے لئے پاکستان کی وزارت تعلیم نے مجھ سے مشورہ کیا تھا - چنانچہ کراچی کا پروگرام میں نے تیار کر کے ان کے حوالے کردیا تھا -

ایوان دوستی کے تحت ماسکو میں سوویت پاکستان ثقافتی انجمن کی داغ بیل ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو ڈالی گئی تھی - اس تاریخ کو انجمن اپنی سالگرہ مناتی ہے - اس موقع پر پاکستان کے ادب کے بارے میں مقالے پڑھے جاتے ہیں - روسی زبان میں بعض منتخب چیزوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے - چنانچہ اب تک علامہ اقبال

اور غالب کے کلام میں سے متعدد چیزوں کے ترجمے سامنے آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کہانیوں اور ڈراموں پر بھی طبع آزمائی ہوئی ہے۔ حال کے شاعروں اور ادیبوں میں سے فیض احمد فیض، ادا جعفری اور احمد ندیم قاسمی روس میں مقبول ہیں۔ اسی انجمن کے تحت کبھی کبھی پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کو ماسکو آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ چنانچہ انجمن کی پہلی سالگرہ پر ۱۹۶۷ء میں جناب ابراہیم جلیس کو دعوت دی گئی تھی۔ ان کی چند کہانیوں کے ترجمے روسی زبان میں ہوچکے ہیں۔ اس موقع پر جلیس صاحب نے اپنی ایک کہانی اردو زبان میں سنائی جس کا ترجمہ روسی زبان میں سامعین کو سنایا گیا۔

ڈاکٹر قریشی کے تجربات

اس انجمن کا دائرہ ادب اور شعر تک ھی محدود نہیں رہتا، بلکہ ثقافتی روابط کے دوسرے پہلوؤں تک پھیل جاتا ہے۔ اس کے دائرے میں تاریخ، سیاست اور تجارت تک کو سمولیا جاتا ہے۔ چنانچہ کراچی یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس انجمن کے زیر اہتمام بلائے گئے تھے۔ چونکہ ان کی پہلو دار شخصیت بڑی ہمہ گیر ہے، اس لیے وہ ماسکو کے علاوہ لینن گراڈ، جارجیا، آذر بائیجان، تاجکستان اور ازبکستان بھی گئے اور ہر جگہ ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ، فلسفیوں اور سائنسدانوں سے نیز اپنے مشاغل حیات کے اعتبار سے ماہرین تعلیمات سے بھی ملاقاتیں کی۔ کچھ اپنے تجربات بیان کئے، کچھ ان کے تجربات سے استفادہ کیا۔ انہوں نے ہر جگہ طلبہ کی

تعلیمی ترقیوں اور سرگرمیوں کے اعداد و شمار بھی جمع کئے۔ جب ڈاکٹر صاحب سے ان کی واپسیٔ وطن سے قبل ان کے دورے کے تاثرات کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

”مجھے یہ کہنا چاھئے کہ میں اپنے دورے سے بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ نہ صرف سائنسدان اور افسران حکومت نے بلکہ عام لوگوں نے بھی میرا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا ہے۔ آپ نے صنعت اور تعلیم میں مثالی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ معاشی ترقی کی اعلیٰ سطح کے حصول کے بعد بھی آپ نے اس قومی ثقافت کی روایتی شکلوں کو برقرار رکھا ہے جسے ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں، کیونکہ ہماری اس کے ساتھ وابستگی ہے۔ میں نے بیلے رقص اور اوپیرا سے لطف اٹھایا لیکن تاجکستان کے جدید شعرا کو میں نے سب سے زیادہ پسند کیا۔ خصوصاً اس علاقے میں مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے ھی وطن میں ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان اور وسطی ایشیا کے درمیان صدیوں سے قریبی ثقافتی تعلقات قائم ہیں۔ انگریزوں نے ہمارے ان روابط کو توڑ دیا تھا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو نئی زندگی بخشیں۔“

ایک اور سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

”آپ کے بہت سے سائنسداں پاکستان میں گہری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی تاریخ، معیشت اور ثقافت کے مطالعہ میں نمایاں ترقی حاصل کی ہے۔ آپ کے بہت سے سائنسدانوں کو فارسی اور اردو زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔ آپ کے مستشرقین صرف سائنس ھی کو ترقی نہیں دے رہے ہیں

بلکه وہ دونوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات میں اضافے کے لئے بھی کام کر رہے ہیں ۔ اور میرا خیال ہے کہ معلومات ، ادب اور سائنسی دریافتوں کے تبادلے سے اس کام کو فروغ نصیب ہوگا ،،۔

انہی دنوں سوویت پاکستان ثقافتی انجمن کے زیر ایوان مشہور سوویت شاعر میخائیل لوکونن دورہ٘ پاکستان پر آئے تھے ۔ جب وہ وطن واپس جانے لگے تو ان سے چند استفسارات کئے گئے ۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا :

” لاہور ، ملتان ، راولپنڈی اور کراچی میں متعدد مہمان‌نواز ملاقاتیں اس قدر دلچسپ رہیں کہ انہوں نے مجھے فکرسخن کے لئے اور دونوں ممالک کے شعراء کے درمیان تعلقات کے لئے تازہ عمدہ مواد فراہم کردیا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی خاص قوت سامعہ کی مدد سے اردو ، سندھی اور پشتو شاعری کی نبض کو محسوس کیا یا اس کا ادراک کیا ہو ۔ حالانکہ میں ان زبانوں کو نہیں جانتا ، پھر بھی میں نے ان کی اصل روح کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے ۔ بہ حیثیت ایک ادیب کے مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ سوویت یونین کی طرح پاکستان بھی ایک کثیرالاقوامی ملک ہے اور مختلف زبانوں کی ادبیات میں باہمی ربط کے قیام اور باہمی ترجموں کا مسئلہ بےحد اہم ہے ۔ پاکستان کے ادیبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کے اعتبار سے اور ان مشاہدات و نظریات کے اعتبار سے جن تک صنف شاعری پر بات چیت کے دوران میری رسائی ہوئی تھی ، میرا دورہ٘ پاکستان بڑا کامیاب اور اہم رہا ہے ،، ۔

انہوں نے ان شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوائے جن سے وہ متاثر ہوئے تھے ۔

فلموں کا نمائشی میلہ

اتفاق کی بات ہے کہ اس سال مذکورہ بالا انجمن کے زیر اہتمام پاکستانی فلموں کا ایک نمائشی میلہ بھی ماسکو میں منعقد ہوا جس میں متعدد پاکستانی فلم دکھائے گئے ۔ اس موقع پر ان فلموں سے متعلق فنکاروں ، ڈرامہ نگاروں ، ہدایت کاروں اور موسیقی دانوں کو بھی مدعو کیاگیا تھا ۔ اس میلے میں ”سراج‌الدولہ ،، نامی فلم کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا تھا ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دو تین روسی فلموں کے مکالمے اردو میں ” ڈب ،، کئے گئے ہیں ۔ میں نے سوچا کہ اگر صدر الدین عینی کانفرنس کے منتظمین یا مس مارگریٹا سے کہ کر ان فلموں میں سے کسی ایک کو دیکھنے کا موقع مل جائے تو اچھا ہو ۔

سوویت پاکستان ثقافتی انجمن کے ایک سرگرم رکن مشہور شاعر کونستن تن سیمونوف ہیں ۔ ان سے ملاقات ہوگئی ۔ ان کی ایک نظم کا ترجمہ جناب انور احسن صدیقی نے بڑے کمال کے ساتھ کیا ہے ۔ اگر کسی سے نہ کہا جائے کہ وہ روسی نظم کا ترجمہ ہے تو سننے والے یہ سوچنے کے لئے مجبور ہونگے کہ یہ ہمارے کس پاکستانی شاعر کا کلام ہے ۔ فراوانئی جذبات اور انداز بیان کے لحاظ سے اس میں اردو نظم کا رچاؤ پایا جاتا ہے ۔ اس کا ٹیپ کا مصرع ہے:

”میں اک دن لوٹ کر آؤنگا میری منتظر رہنا ،،

غالب کے نام پر

مرزا غالب کے ساتھ روسی شاعروں کے دلی تعلق کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ۔ ان سے بے پناہ عقیدت کا اظہار ایک اور طرح بھی

کیا گیا ہے ۔ جس طرح اردو شاعری میں چنبیلی، گلاب ، موتیا اور چمپا کا ذکر آتا ہے ، روسی شاعری میں لی‌لاک کے پھولوں کو سراہا جاتا ہے ۔ ایک بار ایک سہانی چمکیلی صبح کے وقت جب اس کے روشن ارغوانی رنگ کے گچھے کھل اٹھے تو شاعری کے زبردست شائق لیونِد کولیس نکوف کی وصیت کے مطابق انہیں عظیم شاعر مرزا غالب کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ یہ بات اس قدر مشہور ہوئی کہ اب بہت سے روسی لی‌لاک کو " مرزا غالب " کہنے لگے ہیں ۔ تاہم یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ۔ اس ملک میں بہت سے پھولوں کو وہاں کی اہم شخصیتوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ البتہ یہ بات قابل قدر ہے کہ پہلی بار اردو کے عظیم شاعر کو یہ درجۂ قبول حاصل ہوا ۔

لینن کا جشن ولادت

۱۹۷۰ء میں روس کے نجات دہندہ لینن کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو کچھ لکھنے کی دعوت دی گئی ۔ مذکورہ بالا انجمن کے زیر اہتمام پاکستانی شاعر اور ادیب بھی مقابلے میں شریک کئے گئے ۔ کامیاب مصنفین کے لئے گرانقدر انعامات رکھے گئے تھے ۔ مجھے خوشی اور فخر ہے کہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے وابستہ جناب قمرہاشمی نے جو ایک باکمال نغزگو شاعر ہیں، مقابلے میں حصہ لیا اور انعام پایا ۔ ان کی طویل نظم کا عنوان تھا " مرا پیام محبت بنام لینن ہے " ۔ انھوں نے لینن کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کو " عظیم انسان ، عظیم رہبر ، عزم و ایثار و آگہی کے پیکر ، تحریک عصر حاضر کی روح تازہ، خوگر امن و آشتی ، مینار روشنی ، جیسے

شاندار الفاظ سے یاد کرتے ہوئے ایک بند میں کہا تھا :

جہاں بھی انسانیت پہ ہوتے رہے مظالم
وہاں ثریا نشیں رہا ہے مقام ان کا
لکھا ہے تاریخ انقلابات نے ہمیشہ
سنہرے حرفوں سے نام ان کا

قمر ہاشمی صاحب کے علاوہ اور بھی پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کو مختلف انعامات ملے تھے ۔ غرض یہ ہے کہ اس انجمن نے ، جس کے صدر دفاتر کراچی اور ماسکو میں اور شاخیں دونوں ملکوں کے متعدد شہروں میں قائم ہیں ، بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ۔ اس انجمن کے ایما پر ایک سوویت اشاعت گھر " پروگریسو پبلشرز " کے نام سے قائم ہے جو دنیا کی چالیس سے زیادہ زبانوں میں سماجی ، سیاسی ، سائنسی اور افسانوی ادب کی کتابیں ہر سال شائع کرتا رہتا ہے ۔ اس سال یعنی ۱۹۷۸ء کے لئے جو اشاعتی پروگرام ادارے نے مرتب کیا ہے ، اس میں لینن انعام یافتہ میخائیل شولوخوف کا ناول " کنوارے کھیت " ، پروفیسر وی افاناسی ئیف کی کتاب " سوشلزم اور کمیونزم " ، الیکساندر کیرن کی کہانیوں کا مجموعہ ، رسول حمزاتوف کی کتاب " میرا داغستان " اور بچوں کے مصنف یف گینی چاروشن کی کتاب ، جو بولی کے ایک بچے کی کہانی ہے ، سب سے زیادہ قابل ذکر مطبوعات ہونگی ۔ میں نے ان کتابوں کو اشاعت کے فوراً بعد حاصل کرنے کی فرمائش کر دی ہے ۔

طبی اداروں کا پروگرام

میں ادب اور شعر کی دنیا میں کھویا ہوا تھا کہ ایک دم

مادام مریم سلگانک نے مجھسے سوال کیا کہ میں دو تین دن میں کیا کیا کرنا اور کیا کیا دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں نے کہا کہ آج کا دن تو ختم ہی ہوگیا ہے ۔ اب ۱۲ اور ۱۳ اپریل کے دو دن باقی ہیں ۔ ان میں اگر روس کا کینسر انسٹیٹیوٹ ، اوپن ہارٹ سرجری کا کلینک اور ماسکو یونیورسٹی دیکھ لوں تو بہت اچھا ہو ۔ ان کے لئے اول الذکر پروگرام ذرا مشکل معلوم ہوئے ، تاہم انہوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا ۔ مس مارگریٹا کا بھی یہی خیال تھا ۔ حالانکہ اول الذکر دونوں پروگرام میرے لئے زیادہ جاذب نظر تھے ۔ سرطان سے نجات پانے کے لئے خود میں نے پاکستان میں ایک تحریک چلائی ہے جس کے سلسلے میں سگریٹ کے خلاف مہم سر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے ۔ اگر سرکاری تعاون پوری طرح نصیب ہوگیا ، تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب رہونگا ۔

دل کے ٹکڑے کرنا اردو شاعری میں تقریباً ایک محاورہ بن گیا ہے ۔ لیکن عملی طور پر دنیا بھر کے سرجنوں نے گوشت اور خون کے اس لوتھڑے پر طبع آزمائی شروع کر دی ہے ۔ طرح طرح سے اسے کاٹ پیٹ کر خرابیاں دور کرنے کے طریقے معلوم کرلئے ہیں ۔ اس ضمن میں چین اور روس سب سے آگے ہیں ۔ چین کے لئے ایک طبی وفد نے جاکر وہاں کے سرجنوں کے کرشمے بچشم خود دیکھ چکا ہوں ۔ ضرورت تھی کہ سوویت یونین میں دل کی جراحی کا حال دیکھوں ۔

امراض اطفال کے سلسلے میں سرجری ایک علاحدہ فن ہے کیونکہ بچے کا جسم کسی بالغ انسان کے جسم کے مقابلے میں زیادہ نازک ، ملائم اور کسی قدر غیر ترقی یافتہ ہوتا ہے ، اس لئے اس

سے نمٹنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ۔ سوویت یونین کے ہر بڑے شہر میں یا تو ایک سرجیکل کلینک ہوتا ہے یا ہر اسپتال میں اس شعبے کا ایک وارڈ قائم کیا جاتا ہے ۔ اس ضمن میں ماسکو کا " دولت سکی اسکول " ، ایک اعلیٰ ترین ادارہ ہے ۔ ڈاکٹر اولگاپولیا کووا کی میز پر شیشے کے نیچے بھولے بھولے گالوں والی بچی کی تصویر رکھی ہے جس کا نام ماشا تھا ۔ چند ہفتے پہلے اسے زچہ خانے سے سیدھا اس کلینک میں لایا گیا تھا ، کیونکہ اس میں بہت سے پیدائشی نقائص موجود تھے ۔ ایک نقص یہ تھا کہ اس کی غذا کی نالی بند تھی ۔ زچہ خانے کے منتظمین کا خیال تھا کہ آپریشن ممکن نہیں ہے ۔ لیکن کلینک میں پروفیسر استالن لاف دولت سکی نے ، جن کے نام پر ادارے کا نام رکھا گیا تھا ، آپریشن کیا ۔ ڈاکٹر اولگاپولیا کووا ان کی مدد کرتے رہے ۔ آخر ان کی جدوجہد کامیاب رہی اور بچی کو غذا ملنے لگی ۔ اس کی رپورٹ پڑھنے کے علاوہ میں نے کئی اور مریضوں کا حال معلوم کیا ۔ جگر کی تکالیف اور خون کی رگوں میں خرابی کا علاج بعض ملکوں میں جراحی کا ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے ۔ لیکن والیری اکوبیان ، جو اس ادارے کے ایک ذہین معالج ہیں ، اس قسم کے مریضوں سے اچھی طرح نمٹ لیتے ہیں ۔ انہوں نے بعض نادر قسم کے آپریشن بڑی کامیابی سے کئے ہیں ۔ جب کسی مریض کے بچنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے اور مطلوبہ آپریشن کی نوعیت انتہائی پیچیدہ ہوتی ہے تو کوئی سرجن آسانی سے خطرہ مول نہیں لیتا ۔ لیکن والیری ایسے ہر چیلنج کو قبول کرلیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کا حقیقتاً ایک وقت مقرر ہے ۔ اگر کسی مریض کے فوت ہونے کا لمحہ نہیں آیا ہے تو

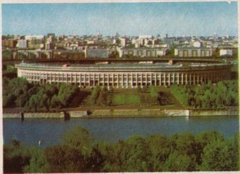
اسے کسی نہ کسی صورت تندرست کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ سب سے پہلے کوشش ہونی چاہئے کہ مرض کو مزید بڑھنے سے روک دیا جائے ۔ آپریشن کے وقت مریض کے جسم کی قیمتی حرارت اور خون کے ایک ایک قطرے کو بچانے کی کوشش کی جائے ۔ کسی بالغ کا تھوڑا سا خون ضائع ہو جانا کوئی تشویش کی بات نہیں ہے ، لیکن ایک کم سن بچے یا بوڑھے کے معاملے میں خون کو محفوظ رکھنا بہت ضروری ہے ۔

ماسکو کی یونیورسٹیاں

ماسکو میں ایک نہیں دو یونیورسٹیاں ہیں ۔ ایک ریاستی یونیورسٹی کہلاتی ہے اور دوسری پیٹرسن لوممبا فرینڈشپ یونیورسٹی ۔ ان دونوں میں غیرملکی طلبا کافی تعداد میں موجود ہیں ۔ اول الذکر کی سیر کے لئے یہ وقت مناسب نہیں تھا ، کیونکہ تمام غیر ملکی طلبا، جن میں پاکستانی سب سے زیادہ تعداد میں ہیں، تعلیمی دورے اور مشاہدے کے لئے تاشقند گئے ہوئے تھے ۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ پاکستانی طلبا نے ، جن کی تعداد بیس ہے ، اپنی ایک علحدہ انجمن بنا رکھی ہے ، جس کے صدر جناب عبدالرزاق ابرو سندھ یونیورسٹی ، حیدرآباد ، کی طرف سے وہاں داخل ہیں اور ارضیات کے موضوع پر تحقیقاتی مطالعہ کر رہے ہیں ۔ ایک اور طالب علم سیف اللہ میمن ہیں ، جو کراچی کے رہنے والے ہیں ۔ ان دونوں کی تعلیمی سرگرمیاں بہت زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی ہیں ۔ اگر وہ ماسکو میں ہوتے تو میں ان سے ضرور ملاقات کرتا ۔ اس یونیورسٹی میں بیرونی طلبا کے ڈائرکٹر ایوان پالوفچ برمان ہیں جو



ماسکو میں لومونوسوف یونیورسٹی



ماسکو میں لینن سنٹرل اسٹیڈیم

کئی سال سے اس عہدے پر فائز ہیں اور اپنے طلبا سے بے حد محبت ، خلوص اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں ۔ وہ بھی تمام طلبا کے ساتھ تاشقند گئے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر یقیناً مجھے بڑی خوشی ہوتی، اور جب وہ پاکستانی طلبا کی تعریف کرتے تو میں فخر محسوس کرتا۔

ماسکو میں پیٹرس لومبا فرینڈ شپ یونیورسٹی ۱۹۶۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہاں بھی پاکستانی خاصی تعداد میں داخل ہیں۔ اس یونیورسٹی کے گریجویٹ اس وقت ایشیا ، افریقہ اور لاطینی امریکا کے بہت سے ممالک میں کام کر رہے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے ماہرین کی حیثیت سے وہ اپنے اپنے متعلقہ ملک کی معیشت ، صحت عامہ ، تعلیم ، سائنس اور ثقافت کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ موجودہ تعلیمی سال میں نوے ممالک کے چھ ہزار چار سو سے زیادہ طلبا وہاں داخل ہیں۔ اس متحدہ کثیر الاقوامی خاندان میں پاکستانی طلبا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انجینئرنگ فیکلٹی کے تیسرے سال کے ایک طالب علم منصور شاہد گزشتہ چار سال سے وہاں داخل ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں پاکستانی طلبا کے صدر بھی ہیں۔ ایک موقع پر ایک نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ان کی تنظیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ پروفیسروں اور استادوں کو پاکستان کے لئے اعلیٰ تربیت یافتہ ماہرین کی تیاری میں مدد دی جائے۔ تعلیم کے علاوہ انجمن اپنے طلبا کو ان کے فرصت کے اوقات گزارنے میں بھی مناسب مدد دیتی ہے اور بہت سے کھیلوں کی سرگرمیوں ، سیرو تفریح اور طلبا کی تقریبات کا اہتمام کرتی ہے جس میں پاکستان کے سفیر ، سفارت خانے کے اراکین ، سوویت پاکستان دوستی کی انجمن کے

کارکن ، طلبا کی دوسری انجمنوں کے نمائندے وغیرہ شریک ہوتے ہیں۔ میزبان ہونے کے اعتبار سے پاکستانی طلبا اپنے علاقائی گیت اور رقص پیش کرتے ہیں اور مہمانوں کو اپنے مختلف فنون لطیفہ سے واقف کرتے ہیں۔

شاہد حسین یونیورسٹی کے پہلے پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھے، جن سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ میں نے سنا کہ وہ ایک ماہر معاشیات ہیں۔ ان کے قیام کے چار سال بعد ١٩٦٥ء میں پہلی بار یونیورسٹی سے اولین گریجویٹ فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ ان کی تعداد دو سو اٹھائیس تھی۔ اس سال ان کی تعداد بڑھکر پانچ سو باسٹھ ہوگئی ہے۔ ان میں سے تقریباً تین سو چالیس ایشیا ، افریقہ اور لاطینی امریکا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر دس پاکستانی طلبا فارغ التحصیل ہوچکے ہیں۔ اب ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ اس سال پاکستانی طلبا کی تعداد ستر ہے۔ وہ ہر شعبے میں شرکت کررہے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ عابد کامران اور حسن امیر شاہ طبیعیات اور ریاضی کے شعبوں میں پہلے پاکستانی طلبا ہیں۔ یونیورسٹی میں تجربہ گاہوں کے علاوہ ایک عمدہ لائبریری بھی موجود ہے جس میں مختلف زبانوں کی سات لاکھ سے زیادہ کتابیں رکھی گئی ہیں۔ روسی ، فارسی اور عربی کے علاوہ اردو زبان کی کتابیں سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ تمام طلبا اپنی نجی بات چیت قومی زبان میں کرتے ہیں۔ اس طرح بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ یہاں ہر قسم کے کھیل کھیلے جاتے ہیں ، لیکن برف پڑنے کے زمانے میں ’’ اسکی ئنگ ‘‘ کا کھیل سب سے زیادہ مرغوب ہوتا ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کے لئے سرکاری خرچ پر دوسرے شہروں کی سیر

بھی کرائی جاتی ہے جسے تعلیم کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

”روس کا دل“

ایک نا معلوم زمانے سے ماسکو کو ’’ روس کا دل ‘‘ کہا جاتا رہا ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر سب سے پہلے ١١٤٧ء میں ملتا ہے۔ تاہم آثار قدیمہ کی حالیہ کھدائیوں میں ایسا مواد دریافت ہوا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں اس جگہ پر، جہاں آج کریملن واقع ہے ، چاردیواری سے گھری ہوئی ایک بستی موجود تھی۔ ماسکو کی ترقی میں اس حقیقت نے بڑی مدد دی ہے کہ یہ ازمنۂ وسطیٰ کی اہم آبی اور بری شاہراہوں کے سنگم پر واقع تھا۔ اس لئے ماسکو زیادہ مالدار ہوتا گیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف فصیلیں کھڑی کرلیں اور بہت جلد اس وقت کی مرکزی روسی ریاست کا دارالحکومت سمجھا جانے لگا۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں اس کے بجائے زار روس کے نام پر قائم شدہ شہر پیٹرزبرگ (موجودہ لینن گراڈ) صدر مقام ہوگیا۔ اس نئے شہر کو بحیرۂ بالٹک کے کنارے پیٹر اول نے آباد کیا تھا۔ لیکن اس سرکاری تبدیلی کے باوجود لوگوں کے ذہنوں میں ماسکو، ’’ روس کے دل ‘‘ کی حیثیت سے باقی رہا اور یہ محض ایک اتفاقی امر نہیں ہے کہ ملک کی پہلی یونیورسٹی ١٧٥٥ء میں ماسکو ہی میں قائم کی گئی کیونکہ بیشتر دانشور اور سائنس دان ، ادیب اور فنکار، رقاص و موسیقار اسی شہر میں بدستور رہتے اور کام کرتے رہے۔ نئے شہر کے قیام نے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ پھر انیسویں صدی میں صنعت و حرفت کی تیزی سے ترقی ہوئی تو ماسکو ایک بڑا صنعتی مرکز

بن گیا ۔ اس کے قرب و جوار کے دیہی علاقوں میں لوگ بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ وہ سب نئی صنعتی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے نکل آئے ۔ حتیٰ کہ اکتوبر کے انقلاب کے بعد مارچ ١٩١٨ء میں ماسکو ایک بار پھر باقاعدہ ملک کا دارالحکومت تسلیم کرلیا گیا ۔ اس وقت حکومت کے سربراہ وی ۔ آئی ۔ لینن تھے۔ دسمبر ١٩٢٢ء میں سوویت سوشلسٹ جمہوریتوں نے مل کر یونین بنائی تو اس نے بھی اس فیصلے پر مہر توثیق ثبت کردی۔

پچھلے ساٹھ سال کے دوران یہ شہر اتنا وسیع ہوگیا ھے کہ اس کا تصور بھی محال ھے ۔ اس کا رقبہ ٨٧٨٫٧ مربع کلومیٹر ھے۔ اس میں سے ٢٨٦ مربع کلومیٹر باغوں، پارکوں اور دوسرے مقامات پر لگے ہوئے پودوں سے گھراھوا ھے۔ رھائشی رقبہ بارہ کروڑ تیس لاکھ مربع میٹر سے زیادہ ھے اور زیر زمین ریلوے لائن کی، جسے میٹرو کہا جاتا ھے، مجموعی لمبائی دوسو کلومیٹر کے قریب ھے۔ رقبے میں پانچ گنے اضافے کے باعث آبادی بھی تقریباً چارگنی بڑھ گئی ھے جو اب تقریباً اسی لاکھ ھے ۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر روزانہ کئی سو فلیٹ تعمیر ہوتے رہے ھیں ۔ اس قدر تیزی سے کام نہ ھوتا تو آبادکاری کا کام مشکل ھو جاتا ۔ اس اعتبار سے آمد و رفت کا نظام مناسب رکھنے کے لئے ایسے کارخانے قائم ہوئے جو پرزے جوڑ کر روزانہ ڈیڑھ ہزار موٹر گاڑیاں ، بسیں اور ٹرک تیار کرنے لگے تاکہ تمام ملک کی ضرورت پوری کرسکیں ۔ اس طرح کچھ کارخانے روزانہ تیس لاکھ گز سے زیادہ کپڑا ' ایک لاکھ جوڑی سے زیادہ جوتے ، ڈھائی ہزار ٹی وی سیٹ، پچاس ہزار دستی گھڑیاں اور کوئی چھ سو کپڑے دھونے کی مشینیں تیار کرنے لگے۔

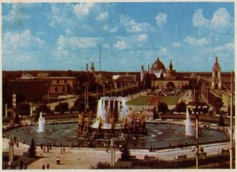
سوویت یونین نے ماھرین کی موجودگی کے پیش نظر اکیڈیمی آف سائنسز اور اس کے ماتحت چھیتر تحقیقاتی ادارے اسی شہر میں قائم کئے اور اسی اعلا تعلیمی ادارے کھول دئے جن میں مخصوص تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد اس وقت چھ لاکھ چالیس ہزار ھے۔ ایک ہزار تین سو عام اسکول ھیں جن میں طلبا کی تعداد ساڑھے آٹھ لاکھ ھے ۔ تحصیل معلومات اور فروغ علم کے لئے چار ہزار تین سو لائبریریاں ھیں ۔ تفریح کے لئے پچیس تھیٹر ، ساڑھے پانچ سو سنیما گھر اور چھپن عجائب گھر ھیں ۔ صرف ماسکو میں پبلک ٹرانسپورٹ سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ افراد روزانہ سفر کرتے ھیں ۔ بعض لوگ اپنے مشاغل حیات کے اعتبار سے کئی کئی بار گاڑیوں میں بیٹھتے ھیں ۔ بہت سی ایسی برقی موٹریں بھی تیار ھوتی ھیں جن کی صلاحیت سو کلو واٹ سے زیادہ ھوتی ھے ۔ جو کارخانے تعمیراتی سازو سامان تیار کرتے ھیں ، ان کا کہنا ھے کہ پیداوار کی کل مقدار گزشتہ ساٹھ سال میں دو ہزار گنی سے زیادہ ھوگئی ھے۔

انقلاب اکتوبر سے چارسال پہلے ماسکو میں صرف پچاس ھسپتال تھے جن میں بستروں کی کل تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ آج مختلف نوعیت کے دوسو ساٹھ ھسپتال اور شفاخانے قائم ھیں، جن میں سوا لاکھ اقامتی مریض زیر علاج رہ سکتے ھیں۔ بیرونی مریضوں کے شعبے ان کے علاوہ ھیں۔ ابتدائی طبی امداد کے ایک ہزار آٹھ سو مرکز ھیں۔ ان تمام ھسپتالوں اور مرکزوں وغیرہ سے طبی امداد مفت ملتی ھے ۔ زچگی کے ڈھائی سو مشاورتی مرکز ھیں جہاں زچاؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے قیمتی مشورے دئے جاتے ھیں۔ لوگوں کو تندرست اور چاق و چوبند رکھنے کے لئے مختلف

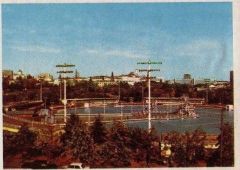
کھیلوں کے ستاون اسٹیڈیم ، ایک ھزار چار سو جمنازیم ، تیس تیراکی کے تالاب ، دو سو سے زیادہ اسکی ٹنگ کے میدان اور اس کی تنصیبات ھیں۔ کھیل کے کل اداروں کی تعداد پانچ ھزار سے زیادہ ھے۔

دلچسپ اعداد و شمار

ماسکو سے نکل کر سارے ملک یعنی سوویت یونین کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ھوگا کہ اس کا رقبہ دو کروڑ چوبیس لاکھ مربع کلومیٹر ھے۔ یعنی یہ کرۂ ارض پر خشکی کے حصے کا ایک چھٹا حصہ ھے۔ امریکا سے تین گنا ، برطانیہ سے نوے گنا یا پورے لاطینی امریکا کے برابر ھے۔ یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو تمام یونین کی آبادی پچیس کروڑ اناسی لاکھ تھی۔ گویا آزادی کے بعد ساٹھ سال کے عرصے میں دس کروڑ نفوس کا اضافہ ھوگیا۔ ۱۹۱۳ء میں روس میں لوگوں کی اوسط توقع حیات بتیس سال تھی جو ۱۹۶۷ء میں درازیٔ عمر کی تدابیر اختیار کرنے کے باعث ستر سال ھوگئی اور اب تقریباً پچھتر سال ھے۔ معلوم ھوا کہ دنیا کے معمر ترین سوویت شھری کا انتقال اب سے ساڑھے چار سال قبل ھوا۔ وہ آذربائجان کے ۱۶۸ سالہ شیرعلی مسلموف تھے۔ اب سو سال سے زیادہ عمر کے بڑے گروہ میں سب سے زیادہ معمر آذربائجان ھی کے ۱۴۳ سالہ مجید آغائیف ھیں۔ ۱۹۷۰ء میں سوویت یونین میں سو سال سے زیادہ عمر کے افراد کی تعداد انیس ھزار تین سو تھی۔ اب بیس ھزار کے لگ بھگ ھے۔ رفتار پیدائش نہ بہت زیادہ ھے اور نہ بہت کم۔ ھر منٹ گزرنے پر ملک میں نو بچے پیدا ھوتے ھیں اور جیسا کہ عموماً ھر ملک میں ھوتا ھے ، نوزائیدہ بچوں میں لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی تعداد



ماسکو میں قومی اقتصادی نمائش کا دفتر



ماسکو میں تیراکی کا تالاب

زیادہ ہوتی ہے۔ روس میں بھی اس وقت یہی حال ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت سارے ملک میں عورتوں کی تعداد چھپن فیصد ہے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران بےشمار مرد سپاہی کام آگئے تھے۔ عورتیں، جو محاذ جنگ سے دور رہ کر لڑائی کے کاموں میں حصہ لیتی تھیں، بہت کم فوت ہوئیں۔ قیاس ہے کہ تھوڑے عرصے میں عورتوں اور مردوں کا تناسب برابر ہوجائیگا۔ ملک میں آبادی کی اکثریت یعنی باسٹھ فیصد لوگ شہروں میں رہتے ہیں۔ پہلے دیہی آبادی زیادہ تھی لیکن مشینوں کے استعمال نے اس تناسب کو بدل دیا ہے۔ ملک کا سب سے زیادہ قدیم شہر آرمینیا کا دارالحکومت یریوان ہے، جو ڈھائی ہزار سال قبل آباد ہوا تھا اور سب سے زیادہ نیا شہر تنیدا ہے جو بیکال و آمور ریلوے لائن پر اس وقت زیر تعمیر ہے۔ ملک کے تمام شہروں اور قصبوں کی مجموعی تعداد دوہزار ہے اور اگر اس میں شہری طرز کی دور افتادہ بستیاں بھی شامل کرلی جائیں تو یہ تعداد تین گنی ہوجائیگی۔ ان میں سے نصف شہر اور قصبے سوویت یونین کے دوران اقتدار تعمیر ہوئے۔ پہلے کچے دیہات کی تعداد زیادہ تھی۔ ملک میں ایسے شہروں کی تعداد انتالیس ہے جن کی آبادی سات لاکھ سے زیادہ ہے۔ پہلے روس بڑی حد تک کسانوں کا ملک تھا۔ لیکن پچھلے ساٹھ سال میں زبردست صنعتی طاقت کا گہوارہ بن گیا ہے۔

کریملن کا علاقہ

ذرا پہلے برسبیل تذکرہ کریملن کا نام آیا ہے۔ کریملن کا علاقہ ایک بے ڈھنگی، بے قاعدہ تکون کی صورت میں دریائے ماسکو

کے کنارے واقع ہے۔ تینوں اطراف کسی قدر اونچی نیچی فصیلوں کا سلسلہ ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لئے تین بڑے اور متعدد چھوٹے دروازے ہیں جن میں سے موٹر گاڑیاں اور ٹرک تک گزرسکتے ہیں۔ بڑے دروازوں کے اوپر اونچے مینار ہیں، جن کے کلسوں پر یاقوتی رنگ کے ستارے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ہر ستارہ پانچ کونوں کا اور وزن میں تقریباً ایک ٹن کا ہے۔ ہر ایک کے پہلو تین تین گز لمبے ہیں۔ انہیں ایک دائرے میں لگے ہوئے لوہے کے چھوٹے چھوٹے گولوں کے اوپر اس طرح نصب کیا گیا ہے کہ ہوا کا ذراسا جھونکا ہر ستارے کو گردش میں لے آتا ہے۔ یہ ستارے قدیم زمانے سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ۱۹۳۰ء میں لگائے گئے تھے۔ دن کے وقت وہ سنہرے نظر آتے ہیں جو ان پر پھرے ہوئے رنگ کو ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ رات کے وقت ان میں سے یاقوتی رنگ کی شعاعیں نکلتی ہیں کیونکہ تیز بجلی کے لیمپ ان کے وسط میں اسی طرح لگائے گئے ہیں کہ وہ نیچے سے نظارہ کرنے والوں کو نظر نہیں آتے۔ لیمپ کے گولے خود بھی حرکت میں رہتے ہیں جس کے باعث روشنی چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہے۔

ہر بڑا دروازہ ایک تاریخی نوعیت کا ہے۔ دو دروازے جانب غرب ہیں اور ایک جانب شرق ہے۔ جانب شرق سرخ چوک، لینن کا مقبرہ اور عجائب گھر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرف ایک کھلا وسیع میدان بھی ہے جس میں قومی تقریبات کے عوامی اجتماعات ہوتے ہیں۔ جانب غرب وسیع باغ ہے جس میں انواع و اقسام کے پھولوں کی کیاریاں، بیلیں، پودے اور درخت ہر وقت موسم بہار کا رنگ طاری رکھتے ہیں۔ بچوں کے لئے جھولے،



ماسکو میں کریملن کی عمارات



کریملن میں لینن لائبریری

چکر اور هنڈولے بھی لگے ہوئے ہیں جن پر همه وقت بچوں کی یلغار رہتی ہے۔ کبڈی کی قسم کا ایک کھیل بھی کھیلا جاتا ہے جسے دیکھنے کے لئے بہت سے تماش بین جمع ہوتے ہیں۔ تینوں طرف دبیز دیواروں پر سات سات گنبد بھی بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ڈیزائن مختلف ہے۔ دیواروں کی لہر دار سطح کے بموجب وہ اونچے نیچے ہونے کے علاوہ وضع قطع میں بھی یکساں نہیں ہیں۔ کوئی گول ہے تو کوئی مخروطی، کوئی چوکور ہے تو کوئی ہفت پہلو۔ ان گنبدوں کے سائے میں ہوٹل تعمیر کئے گئے ہیں جن میں زیادہ تر غیر ملکی سفارتی نمائندے قیام کرتے ہیں۔

ایک گنبد کے نیچے تیز دھار کا ایک چشمہ ہے جس کا پانی باقاعدہ استعمال ہوتا ہے اور خاص طور سے اس زمانے میں کہ جب مختلف جنگوں میں کریملن کا محاصرہ ہوا اور فوجوں نے اس کی فصیل کے اندر پناہ لی تو اسی کا پانی ان کی پیاس بجھاتا اور ان کی دوسری ضروریات پوری کرتا رہا تھا۔ البتہ اب آب رسانی کا نظام عام قاعدے کے مطابق درست کرلیا گیا ہے۔

جانب غرب جو بردوئسکی مینار ہے، وہ خاص طور سے مدافعین کے کام آیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کتافیا نام کا ایک اور مینار ہے جو کریملن کی کسی دیوار کا جزو تو نہیں ہے لیکن علاقے کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہاں سے "باب تثلیث" (ٹرینٹی گیٹ) تک ایک پشتہ تعمیر کیا گیا ہے۔ وہ اس کمرے کی کھڑکی کے عین محاذ میں ہے جسے لینن، اپنے قیام کریملن کے دوران مطالعہ کے لئے استعمال کرتے تھے۔

جانب شرق اسپاسکی دروازہ سرخ چوک کے سامنے ہے۔

یہ دروازہ بالکل چوکور ہے۔ اس کے مینار کی بلندی پر ستارے سے نیچے ایک بڑا گھنٹہ نصب ہے جس کے ڈائل چاروں طرف نظر آتے ہیں۔ ان پر لگی ہوئی سوئیاں سونے کی ہیں اور ہر طرف ایک سے بارہ تک کے ہندسے بھی سونے کے پتروں سے بنائے گئے ہیں جو خوب صیقل شدہ ہونے کے باعث رات کو چمکتے ہیں۔ بہت دور سے ان کو پڑھا جاسکتا ہے۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد یہ گھنٹہ وقت ظاہر کرنے کی آواز دیتا ہے۔ یہ خودکار ہے۔ چابی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا لنگر ایسی زنجیروں کے ساتھ منسلک ہے جو بہت وزنی ہیں۔ زنجیروں کے ساتھ تیس گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں جن پر موگریوں کی ضرب لگنے سے تیز آواز نکلتی ہے۔ آوازوں کا سلسلہ ریڈیو کے نظام سے ملتا ہے۔ اس طرح کریملن کے اس گھنٹے کی آواز ہر ایک گھنٹے کے بعد ساری دنیا میں سنی جاسکتی ہے۔

سامنے ایوانوفسکایا نامی چوک میں کریملن تھیٹر سے ذرا آگے دائیں طرف وسیع شاہی محل ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ ایک مستطیل کی صورت میں ہے جس کے وسط میں بارہ گز اونچا گنبد ہے۔ یہ انیسویں صدی کے وسط میں اس وقت کے زار روس کے حکم پر مشہور معمار کونسٹنٹین ٹون نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے کلس پر ایک سرخ پھریرا لگا ہوا ہے جو قومی تہواروں اور تقریبات کے موقع پر یا جب سپریم سوویت کا اجلاس ہورہا ہو، لہراتا نظر آتا ہے۔ گنبد میں داخل ہونے کے چار دروازے ہیں۔ ہر دروازے پر سنگ مرمر کی ایک طویل و عریض تختی نصب ہے۔ ان سب پر سونے کے حروف میں ''روس کی سپریم سوویت'' کندہ ہے۔ اندر وسیع ایوان ہیں جن میں لگی ہوئی بڑی بڑی کھڑکیاں دیواروں کو زینت دیتی ہیں۔ ان

میں جڑے ہوئے شیشے خاص طور سے نقاشی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے کے باعث قابل دید ہیں۔ ہر چھت میں بہت سے خوبصورت جھاڑ آویزاں ہیں، جن میں لگے ہوئے قمقمے اپنی تیز روشنیوں سے بڑی جگمگاہٹ پیدا کرتے ہیں۔

اصل اسمبلی ہال کے علاوہ چھوٹے کمروں میں مختلف قسم کے اجلاس ہوتے ہیں۔ اسمبلی ہال میں نہایت نرم گدیلے والی آرام کرسیاں ترتیب سے لگائی گئی ہیں۔ ہر کرسی کے سامنے ایک ڈیسک لگا ہوا ہے جس پر صوتی آلات نصب ہیں۔ سارے ایوان کی دیواروں پر تقریباً سات ہزار لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ خفیف آواز بھی نشر ہوکر ہر شخص کو صاف سنائی دیتی ہے۔ اسٹیج کے عقب میں لٹکے ہوئے پردے پر لینن کی ایک عظیم الشان روغنی تصویر کئی ماہرین فن نے مل کر بنائی ہے۔ ایوان میں جب بھی کوئی تقریر ہو، اس کا ساتھ ساتھ ترجمہ تیس صوبائی زبانوں میں ہوتا رہتا ہے۔ صوتی آلات کے ذریعہ سے ہر شخص اپنی مرضی یا سمجھ کے مطابق ایک علیحدہ زبان میں تقریر سن سکتا ہے۔

ایک ایوان عوام کے اجتماعات کے لئے مخصوص ہے۔ سنٹ جارج ہال کے نام سے ایک اور وسیع ایوان قدیم فوجیوں کے نام سے منسوب ہے جس میں ان کی وردیاں، اسلحہ اور امتیازی نشانات محفوظ کئے گئے ہیں۔ سنگ مرمر کی طویل پٹیوں پر خاص جوانمردوں کے نام اور کارنامے سنہرے حروف میں کندہ کئے گئے ہیں۔ جون ۱۹۶۹ء میں یہاں ایک بہت بڑا اجتماع ہوا تھا جس میں کارل مارکس اور لینن کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔

کریملن کا عظیم الشان شاهی محل، جس کو ۱۹۶۱ء میں نئی وضع دی گئی اور نئے انداز میں آراسته کیا گیا، بهت بڑے پیمانے کے عوامی اجتماعات کے کام آتا ہے۔ اس میں چهه هزار کرسیاں قرینے سے لگی هوئی هیں۔ ان کے علاوه بهی دوهزار افراد کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے کمرهٔ ضیافت میں بیک وقت ڈهائی هزار افراد کهانا کهاسکتے هیں۔ یه کئی منزله ہے۔ اس کی دومنزلیں عام سطح زمین سے نیچے بهی هیں۔

سرخ چوک کریملن کی شمال مشرقی فصیل کے سامنے واقع ہے۔ کسی زمانے میں یه اشیائے خرید و فروخت کی بهت بڑی منڈی تها۔ پهر اسے عوامی چوک کی حیثیت حاصل هوگئی۔ یهاں سرکاری ترجمان عوام کو جمع کرکے زار روس کے فرمان سنایا کرتے تهے تاکه لوگ ان احکامات کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اب اس میں سرخی مائل بهورے رنگ کے سنگین چوکے جمادئے گئے هیں اس طرح که بیچ کا حصه ابهرا هوا ہے اور چاروں طرف ڈهلان ہے۔ یهاں هنگاموں کا تو ذکر هی کیا، معمولی شوروشغب بهی سنائی نهیں دیتا۔ هر وقت ایک پروقار خاموشی چهائی رهتی ہے۔ صرف اسپاسکی مینار میں بجنے والا گهنٹه اس طلسم خاموشی کو وقفے وقفے سے توڑتا ہے۔ اس خاموشی میں احترام کا جذبه کارفرما هوتا ہے کیونکه قریب هی ایک وسیع عمارت ہے جو روس کے نجات دهنده وی، آئی، لینن کا مقبره ہے۔

سرخی مائل سیاه رنگ کی یه چوکور عمارت بڑی شاندار ہے۔ بڑے هال میں لینن کی لاش محفوظ حالت میں اس طرح رکهی گئی ہے که اسے حنوط شده کها جاسکتا ہے۔ لیکن مصر کی حنوط شده لاشوں

میں اور اس میں نمایاں فرق هے۔ دیکهنے سے یه معلوم هوتا هے که لینن آسودهٔ خواب هیں اور اگر فوت هوگئے هیں تو مشکل سے چوبیس گهنٹے گزرے هیں۔ ان کے دیدار کے لئے زائرین کا ایک زبردست تانتا بندها رهتا هے۔ کئی کئی دن پهلے دیدار کرنے کی درخواست منظور هوتی هے، نمبر ملتا هے، وقت مقرر کیا جاتا هے اور لوگ بڑے نظم و احترام کے ساتھ قطار لگا کر جمع هوجاتے هیں اور گهنٹوں انتظار میں رهتے هیں۔ ان کی باری آتی هے تو دیدار محض چند منٹ کے لئے هوتا هے۔ برهنه سر کهڑے هوئے منتظمین اگلے شخص کو هٹا کر دوسرے نمبر پر کهڑے هوئے شخص کو آگے بڑهنے کا موقع دیتے هیں۔ ملک کے هر حصے سے اور کچھ بیرونی ملکوں کے عقیدت مند بهی اس مقصد کے لئے سرخ چوک کا طواف کرنے آتے هیں۔ عقیدت و احترام کا جذبه ان کا دامن تهامے رکهتا ہے۔ ان میں سے کوئی بهی بد دل هوکر واپس نهیں جاتا۔ انتظار کی گهڑیاں صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ گزار دیتا ہے۔ جب هم وهاں پهنچے تو کریملن کی دیوار بقعهٔ نور بنی هوئی تهی اور لینن کا مزار روشنیوں کا مرکز تها۔ لوگ آ آکر پهول چڑها رہے تهے۔ عین اس وقت ایک نیا شادی شده جوڑا بهی آپهنچا۔ دونوں لباس عروسی میں تهے۔ انهوں نے از راه عقیدت لینن کی قبر پر پهول رکھ کر خوشی منائی۔ همارے ملک میں اسے بدشگونی سمجها جاتا۔ مجهے بتایا گیا که بهت سے نئے جوڑے لینن کی قبر پر آکر اسی طرح عقیدت کا اظهار کرتے هیں اور سمجهتے هیں که اسطرح ان کی دلی مراد بر آئیگی۔ ان کی ازدواجی زندگی اچهی گزریگی۔ اس سے ذرا آگے مقبرے کے دروازے پر دو فوجی ست کهڑے پهرا دے رہے تهے۔ یقین نهیں آتا تها که زنده انسان هیں یا مجسمے

ہیں۔ یہ اس انداز میں ایک گھنٹے سے زیادہ کھڑے نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے ان کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ پھر بھی کہنا پڑیگا کہ ان میں بڑی سکت تھی۔ اس کے بعد لینن کا کمرہ مطالعہ بھی قابل دید ہے۔ اس میں ہر چیز اس طرح قرینے سے رکھی ہوئی ہے گویا کہ لینن مطالعہ کرتے کرتے اٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام وہیں گزارے تھے اور وہیں رہ کر اپنا آخری منشور مرتب کیا تھا، جس پر آج تک عمل ہورہا ہے۔ روسیوں کے نزدیک وہ ان کی الہامی کتاب کے برابر ہے۔

فصیل شہر کے اندر ایک گرجا بھی ہے جو سنٹ باسل کا گرجا گھر کہلاتا ہے۔ اب اسے بھی عجائب گھر بنادیا گیا ہے۔ وہ سولھویں صدی عیسوی میں ایک خاص موقع کی یادگار منانے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ گرجا کے قریب ہی دو جانبازوں کی یادگار قائم ہے۔ ان میں سے ایک چبوترے پر کھڑا ہے اور اپنی انگلی سے ایک سمت میں اشارہ کررہا ہے۔ دوسرا بیٹھا ہوا ہے، ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھال تھامے ہوئے ہے۔ اس یادگار کے دامن میں ایک کتبہ لگا ہے جس پر کندہ ہے: ''روس شکر گزار ہے اہلیان منن اور شہزادہ پوژ ارسکی کا۔'' سترھویں صدی کے آغاز میں ان سورما رضاکاروں نے فوج کشی کر کے ماسکو کو پولینڈ کے حملہ آوروں سے بچا لیا تھا۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی یادگار عمارتیں ہیں۔ مثلاً تاریخ کا عجائب گھر، ملک کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور اور انجمن تاجران کا اجتماعی مرکز وغیرہ۔ یعنی اگر کوئی شخص ماسکو آئے اور کریملن کے علاقے سے آنکھیں بند کر کے گزر جائے تو سمجھنا

چاہئے کہ اس نے روس کے قلب پر تو قدم رکھا لیکن اس قلب کی گہرائیوں کا اور دھڑکنوں کا جائزہ نہیں لیا۔

اسی علاقے میں ''لینن لائبریری'' بھی قائم ہے۔ مطالعہ کرنے کی غرض سے نہیں، سرسری جائزہ لینے کے خیال سے میں نے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں عام داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے کارڈ بنوانا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک فارم بھر دیا۔ بہت معمولی فیس ادا کردی۔ کاؤنٹر پر منتظم اعلیٰ ایک خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ میں روسی نہیں، کوئی غیر ملکی ہوں لیکن میرا لباس ان کے لئے جاذب نظر تھا۔ انہوں نے بڑی عنایت کی کہ مجھے پانچ سال کیلئے رکنیت کا کارڈ عطا کردیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں وہاں پانچ ماہ بلکہ پانچ ہفتے بھی نہیں رہ سکونگا۔ بہرحال میں کارڈ لیکر لائبریری میں داخل ہو گیا۔ یہ روس کی بہت بڑی لائبریریوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ستر لاکھ سے زیادہ کتابیں رکھی گئی ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث میں نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ میں شعبہ مشرقی علوم میں بھی گیا۔ وہاں فہرست کو دیکھا۔ اس میں پاکستان کی اردو کتابیں بھی موجود تھیں مگر کوئی اچھا انتخاب نہیں تھا۔ بس جو کتاب آگئی، رکھ لی گئی۔ اس سے زیادہ دلچسپی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے سوال کیا کہ کیا میری کوئی کتاب بھی یہاں موجود ہے؟ ترجمان نے انڈکس دیکھا تو اردو کی کوئی کتاب تو نہیں ملی۔ البتہ ''میڈیسن ان چائنا'' کا اندراج مل گیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ان کو اپنی اردو کتابیں بھیج دونگا۔

صدرالدین عینی کی تقریب میں شرکت کیلئے ہندوستان سے جناب پروفیسر جعفری اور محترمہ ادا جعفری کو دعوت نامے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں آرہے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ پاکستان کے فیض احمد فیض صاحب پچھلے دنوں دہلی میں تھے۔ توقع ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ روس آئیں گے۔

ماسکو گردی

انجمن مصنفین روس کے دفتر میں تبادل خیال سے فارغ ہو کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب ماسکو گردی ہونی چاہئے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ جب تک کسی جگہ کو پیدل چل پھر کر نہ دیکھا جائے، اس وقت تک وہاں کا صحیح حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ میری مترجم اور سکریٹری مس مار گریٹا پاؤلونا اس ضمن میں نئی ہیں مگر ان کی اردو دانی نیز ان کی سادگی اور خوش مزاجی قابل رشک ہے۔ مجھے یہ اردو داں خاتون پسند آئی ہیں۔ خصوصاً اس اعتبار سے بھی کہ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا بڑا احساس ہے۔ انہیں حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ کاش! یہ جذبہ ہر شخص میں پیدا ہوجائے خواہ وہ روسی نژاد ہو یا پاکستان کا باشندہ۔

میں نے انگریزی زبان میں روسی طبی کتابوں اور بعض ادبی مطبوعات سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ لہٰذا مس مارگریٹا مجھے کتابوں کے ایک بڑے بازار میں لے گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کتابوں کے بازار میں مطالعہ کے شوقین افراد کی بڑی ریل پیل ہے۔ دوکانوں میں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہے تو لوگ باہر پٹریوں پر نکل آئے ہیں اور وہیں کھڑے ہو کر کتابوں کو دیکھ بھال کر پسند کر رہے

ہیں۔ میں نے کتابوں کے ساتھ اس ذوق و شوق کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ پھر یہ ہی نہیں کہ لوگ ورق گردانی پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ وہ کوئی نہ کوئی کتاب خریدتے بھی ضرور ہیں۔ کتب خانوں کے قریب ہی اخبارات کے اسٹال بھی تھے۔ ان پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بیشتر لوگ دو دو تین تین اخبارات خرید کر لے جا رہے تھے۔ کتب و رسائل اور اخبارات کی پالیسی وضع کرنے میں حکومت نے سخت احتیاط ہی نہیں برتی بلکہ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مرضی اور منشا اور حکمت عملی کے بغیر کتابوں کی اشاعت آخری مرحلے سے نہیں گذر سکتی۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ سنسر کی پابندی کسی مسودے کو رد کردے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عوام قومی حکومت کے اصولوں کو عزیز رکھتے ہیں اور کوئی قدم ایسا نہیں اٹھاتے جو حکومت کی ناپسندیدگی کا باعث ہو، حکومت کے خلاف ہو یا پارٹی کے منشور کے منافی ہو۔ اسی منشا اور مقصد کے تحت غیر ملکی مطبوعات کی درآمد پر خاصی پابندیاں عائد ہیں۔ روس جانے سے پہلے میں نے اپنا مقالہ جو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے تھا، پمفلٹ کی صورت میں چھپوا لیا تھا اور دو سو کاپیاں حاضرین میں تقسیم کرنے کے لئے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ میرے سامان میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ذاتی مطالعے کے لئے چند کتابیں بھی تھیں۔ ہوائی اڈے پر مجھے کسٹم کے ارباب حل و عقد نے وی آئی پی یعنی اہم شخصیتوں میں شمار کیا اور میرا سامان میرے جائے بغیر باہر آ گیا اور موٹر میں رکھوادیا گیا۔ فرائض کے ساتھ وہ اصول احترام کو نظرانداز نہیں کرتے ہیں۔

اشاعت کتب

کتابوں کے بازار میں رہتے ہوئے میری تحقیقاتی فطرت اپنا کام کرتی رہی۔ میں نے معلوم کیا کہ سوویت یونین کی سب ریاستوں میں مجموعی طور پر نواسی مقامی زبانوں اور اکیاون غیر ملکی زبانوں میں تقریباً ایک ارب اسی کروڑ کتابوں کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ ہر سال اتنی کتابوں کی ایسی اشاعت کہیں اور سننے میں نہیں آئی۔ ان کتابوں کی کھپت بھی یقینی ہے کیونکہ سوویت یونین میں ایک لاکھ پچیس ہزار پبلک لائبریریاں قائم ہیں جن میں کتابوں کا ذخیرہ انقلاب سے پہلے کے روس کے مقابلے میں ایک سو چوبیس گنا زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں عوام میں خود کتابیں خرید کر پڑھنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے لائبریریوں میں جاتے ہیں یا پھر شائقین علم وہاں جا کر کتابوں کا سرسری جائزہ لے کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان کے ذوق اور طلب کی کونسی کتاب کس اشاعت گھر سے مل سکتی ہے تا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ آرڈر دے کر منگوا سکیں یا کسی قریبی کتب خانے سے خرید لیں۔ وہ دوسروں سے مانگ تانگ کر کتاب کا مطالعہ کرنا غیر اخلاقی فعل سمجھتے ہیں۔ چونکہ تمام ریاستوں میں ہر قسم کی تعلیم مفت اور عام ہے، اسلئے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اوپر کتابوں کے جو اعداد و شمار دئے گئے ہیں، ان میں کتب نصاب شامل نہیں ہیں۔ وہ سرکاری طور پر چھپتی اور درسگاہوں میں مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ موجودہ تعلیمی سال میں یونین کے عام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد پانچ کروڑ بیس لاکھ

ہے جبکہ اعلیٰ اور خصوصی تعلیمی اداروں میں ان کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ کے قریب ہے۔

اخبارات و رسائل کا بھی یہی حال ہے۔ ملک بھر میں کم و بیش پندرہ ہزار روزنامے اور مختلف موضوعات اور طبقات کی ضروریات پوری کرنے والے سترہ ہزار رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ بہت سے اخبارات کے صبح اور شام کے ایڈیشن الگ الگ چھپتے ہیں۔ ایک ہی نام سے بہت سے اخبارات کئی شہروں سے نکلتے ہیں۔ وہ پرائیویٹ اداروں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ سرکاری بھی ہیں لیکن سب کے لئے ایک صحافتی ضابطۂ اخلاق رائج ہے جس کی پابندی پورے خلوص اور صحیح جذبے کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔ حکومت کو شاذ و نادر ہی کسی تحریر پر احتساب کرنا پڑتا ہے۔

کتابوں کی دکانوں میں ایک سرسری جائزے سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔ چونکہ بیشتر زبانوں سے میں ناواقف تھا، اس لئے حتمی رائے قائم نہیں ہوسکی۔ اس کی حد قیاس آرائی تک رہی۔ ایک دکان میں عربی، فارسی اور اردو تک کی کتابیں نظر آئیں۔ ان میں بھی صرف روسی نقطۂ نظر کی کتابیں نہیں ہیں بلکہ دوسرے موضوعات اور مکاتیب فکر کی کتابیں بھی شامل ہیں، جو غیر سیاسی اور خالص علمی ہیں۔ ایسی کتابوں کے ساتھ سوتیلے پن کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ انہیں بھی دوسری مطبوعات کی طرح نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔

کئی زبانوں میں ایک ہی موضوع کی نظموں کے نئے مجموعے نظر سے گزرے۔ عنوان ہے ”لینن اور مشرق“۔ ان میں لینن سے متعلق افریقی ایشیائی شاعروں کی وہ نظمیں شامل ہیں جو لینن کی

صد سالہ تقریبات کے موقع پر کہی گئی تھیں اور سوویت یونین کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوگئی ہیں ۔ میں نے اردو ، فارسی اور عربی میں شائع ہونے والے ایسے مجموعے لیے لئے ۔ پاکستانی شاعروں میں سے فیض احمد فیض کی نظم " مرغ بسمل کی مانند شب تلملائی "۔ حسن حمیدی کی نظم " عہد تابندہ "، مسلم شمیم کی نظم " نذرماسکو "۔ قمر ہاشمی کی نظم " میرا پیام محبت بنام لینن "، اور دوسرے شاعروں کی نظمیں شامل اوراق ہیں ۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ ان اور دیگر پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف کرغزیہ زبان میں سب سے زیادہ مقبول ہیں ۔ حال ہی میں اس زبان میں نظموں کا ایک اور مجموعہ " آزاد دا وولی "، یعنی طوفان آزادی خوبصورت جلد میں شائع ہوا ہے ۔ اس میں جناب جوش ملیح آبادی ، ابن انشا، قتیل شفائی اور احسان دانش کی تخلیقات شامل ہیں ۔ کرغزیہ کے ایک شاعرسلیمان مینولوف نے بنگلہ دیش کے عوامی شاعر جسیم الدین مرحوم کی نظموں کا ترجمہ کرنے میں حقیقی شاعرانہ جذبے سے کام لیا ہے ۔ ان کی دو نظموں " سنہرا دیس "، اور " گھر مسکراتے ہیں "، کا خاص طور پر کامیاب ترجمہ کیا ہے ۔ مجھے اس حقیقت کا علم انگریزی متن سے ہوا جو کرغزیہ زبان کے ساتھ ساتھ شامل اوراق ہے ۔ سوویت یونین کی بہت سی کتابیں بیک وقت ایک ہی جلد میں دو یا تین زبانوں میں چھپتی ہیں ۔ مجھے یہ بات پسند آئی ہے ۔ نثرنگاروں میں سے پاکستان کے چند ادیب مثلاً احمد ندیم قاسمی ، شوکت عثمانی اور سعادت حسن منٹو یونین کی ریاستوں میں مقبول ہیں ۔

روزنامہ پراودا

میں نے روسی روزنامہ پراودا کے انگریزی ایڈیشن کا ایک

تازہ شمارہ خرید لیا ۔ یوں تو یہ اخبار سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا پرچہ ہے اور وہی اس کا خرچ برداشت کرتی ہے لیکن اس میں ہر مکتبۂ فکر کی ترجمانی نہایت آزادی کے ساتھ کی جاتی ہے ۔ ملک کے آئین کی دفعہ ۱۲۵ میں سوویت شہریوں کے جن بنیادی سیاسی حقوق کو بیان کیا گیا ہے، ان میں پریس کی آزادی بھی شامل ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے:

" ان شہری حقوق کی ضمانت محنت کش عوام اور ان کی تنظیموں کو ، چھاپہ خانوں ، کاغذ کے ذخیروں ، عوامی عمارتوں، سڑکوں، مواصلاتی سہولتوں اور ان کے حقوق کے استعمال کے لئے درکار دیگر ضروری ساز و سامان کا مالک بنا کر دی گئی ہے ۔"

پراودا اخبار کی مجموعی تعداد اشاعت چھیانوے لاکھ کے قریب ہے، یہ افتخار شاید کسی اور ملک کے کسی اخبار کو نصیب نہ ہو، پاکستان کا تو ذکر ہی کیا ۔ اگر اس کے کسی اخبار کی اشاعت ایک لاکھ سے اوپر چلی جائے تو اسے صحافت کی دنیا کا ایک معجزہ ہی کہا جاسکیگا ۔

معیشت کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھنے والے اخبارات متعلقہ وزارتوں اور محکموں کی جانب سے ان لوگوں کے لئے شائع کئے جاتے ہیں جن کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے ۔ مثال کے طور پر اس قسم کا ایک پرانا سوویت اخبار " گودوک " وزارت ریلوے اور ریلوے ٹرانسپورٹ ورکرز یونین کی مرکزی کمیٹی کی جانب سے شائع کیا جاتا ہے ۔ طبی کارکنوں، تعمیراتی کمپنیوں، تجارت سے تعلق رکھنے والے کارکنوں، ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نگاروں، افسانہ نویسوں

اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے کارکنوں کے اپنے اپنے اخبارات ھیں - بڑے بڑے کارخانے، اجتماعی کھیت اور ادارے اپنے لئے چھوٹے سائز کے اخبارات نکالتے ھیں جن میں متعلقه ادارے کی سرگرمیوں اور اس کے کارکنوں کی کامیابیوں کا ذکر ھوتا ھے - ساتھ ھی ان کی بعض کوتاھیوں اور ان پر قابو پانے کے طریقوں کی جانب اشارہ کیا جاتا ھے - مزدور، اجتماعی کسان اور دفتری ملازمین غیر ملازم نامه‌نگاروں کی حیثیت سے ان اخبارات میں مضامین لکھتے ھیں۔ ظاھر ھے که ان کی تعداد اشاعت جان بوجھ کر محدود رکھی جاتی ھے۔

دنیا کے بیشتر ترقی یافته اور ترقی پذیر ملکوں کے برعکس سوویت یونین میں کوئی ذاتی اشاعت گھر موجود نهیں ھے اور نه کوئی ایسا اخبار نکلتا ھے جو ایک فرد یا چند افراد کے گروہ کی ذاتی ملکیت ھو۔ اخبارات کی فروخت سے وھاں جس قدر رقم حاصل ھوتی ھے وہ ان اخبارات کی سربراہ تنظیموں کے کھاتے میں جمع ھوتی ھے۔ مدیران رسائل و اخبارات تک تمام کارکنوں کو ھر ماہ ان کے فرائض کی نوعیت کے بموجب تنخواہ یا معاوضه ملتا ھے لیکن ان میں بهت زیادہ فرق نهیں ھوتا۔ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یه امر ذھن نشین رکھنا چاھئے که سوویت اقتدار کے قیام کے فوراً ھی بعد انسان کے ھاتھوں دوسرے انسان کے استحصال پر پابندی لگادی گئی اور دوسروں کی محنت خرید کر اس کے ذریعے سے مالدار بننے کے نظام کا خاتمه کردیا گیا تھا۔ تمام کارخانے اور ادارے، آمد و رفت اور مواصلات کے وسائل جو پهلے نجی افراد کی ملکیت تھے، عوام کے ھاتھوں میں منتقل کردئے گئے - ان میں چھاپه‌خانے اور اخبارات و رسائل بھی شامل تھے -

پھر یه بھی ایک حقیقت ھے که سرمایه‌دار اخبارات کی بھاری اکثریت کے لئے اشتھارات آمدنی کے اھم‌ترین وسائل میں سے ایک ھے - ایسے اخبارات کا آپس میں مقابله نھایت شدید ھوتا ھے - ایسی صورت میں اخبار کا مالک، خواہ ذاتی طور پر پسند کرے یا نه کرے، مجبور ھوتا ھے که پابندی کے ساتھ ھر اشاعت میں قارئین کے ذوق اور ضرورت کا لحاظ رکھے بغیر، زیادہ سے زیادہ اشتھارات شائع کرے تاکه خود دیوالیه ھونے سے بچا رھے اور دوسرے ناشرین کے ساتھ مقابله کرسکے۔ ایسے اخبارات کے مالکان مجبور ھوتے ھیں که اشتھار دینے والوں کی مرضی اور منشا کے مطابق چلیں تا که وہ دوسرے اخبارات سے ناطه نه جوڑلیں اور اس طرح اخبار کو اس کے واحد یا ایک بڑے ذریعهٔ آمدنی سے محروم نه کردیں - اس کے برعکس سوویت یونین میں، جھاں اخبارات کی فروخت سے حاصل ھونے والی رقم آمدنی کا بڑا وسیله ھوتی ھے، ایسی کوئی بات نھیں ھوتی - چنانچه اکثر اخبارات میں اشتھارات برائے نام یا بھت ھی کم ھوتے ھیں - البته جو اخبارات صرف تجارتی مقاصد کے لئے مخصوص ھوتے ھیں، بھت سے اشتھارات چھاپتے ھیں - لیکن ان کی اشاعت قلیل ھوتی ھے - انھیں پڑھنے والوں کا طبقه بھی مخصوص ھوتا ھے۔ اسی طرح فلمی اشتھارات بھی زیادہ تر فلمی پرچوں میں شائع ھوتے ھیں اور فلم کے شائقین انھیں خریدتے ھیں - اس طرح عام دلچسپی کے اخبارات کو انتھائی حقیقت پسندانه انداز میں رائے عامه کی ترجمانی کرنے کا موقع ملتا ھے - لھذا عوام کی خواھشات کی ترجمانی کرتے ھوئے سوویت اخبارات ھر قسم کے دباؤ سے آزاد رھتے ھیں - وہ ھمیشه ایماندار اور صداقت پسند بنے رھتے ھیں -

مجھے بتایا گیا کہ صبح دس بجے کے بعد اخبارات و رسائل کی فروخت میں کسی قدر کمی ہوجاتی ہے کیونکہ انہیں خریدنے والے کی اس وقت تک خرید چکتے ہیں۔ اس کے بعد وہاں سے تصویری پوسٹ کارڈ، پمفلٹ، کتابچے، ٹکٹ، لفافے، خط لکھنے کا کاغذ، فلم اسٹاروں اور خلابازوں کی تصاویر، بال پن اور مقبول نغموں کے ریکارڈ فروخت ہونے لگتے ہیں۔ پانچ بجے تک یہ گھما گھمی رہتی ہے۔ پھر شام کے اخبارات پہنچ جاتے ہیں اور عوام اپنے کام سے فارغ ہو کر گھروں کی طرف لوٹتے وقت انہیں خرید کر لے جاتے ہیں اور دن کی کسل دور کرنے کے لئے انہیں پڑھتے ہیں۔ ان میں کوئی گرما گرم خبر مشکل ہی سے چھپتی ہے۔

ہوٹل کے ہر کمرے میں مسافر کے ذوق یا لسانی واقفیت کا لحاظ رکھتے ہوئے روزانہ کے اخبارات رکھے جاتے ہیں۔ لیکن میں وہاں کے اخبارات کی کاپیاں پاکستان لے جانا چاہتا تھا، اس لئے ان کو خرید لینا مناسب سمجھا۔ میرے ایک اشارے پر میرے ذوق کے مطابق کتابیں بھی مل سکتی تھیں لیکن میں نے ان کی خریداری کو ترجیح دی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ جب کتابوں کی قیمت روبل میں ادا کرنی چاہی تو کتب فروش نے امریکی ڈالر مانگے۔ حالانکہ اس سے قبل ہوٹل میں ہم نے ڈالر دینے چاہے تو منیجر نے روبل طلب کئے تھے۔ اسی قسم کا تضاد کئی جگہ دیکھنے میں آیا۔ کہیں امریکی ڈالروں کے لئے اصرار کیا گیا اور کہیں روسی روبل مانگے گئے۔ ایک جگہ اپنی حیرت دور کرنے کے لئے دریافت کرلیا کہ قاعدہ کیا ہے مگر تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ اصل قاعدہ اپنی مرضی کا ہے۔ پھر بازار میں روبل کو ڈالر میں یا ڈالر کو

روبل میں بدلنے کا طریقہ آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک فارم بھرنا پڑتا ہے جو ہر جگہ میسر نہیں آسکتا۔

روسی میٹرو

کتابوں کے بازار سے فراغت پانے کے بعد روسی میٹرو کی سیر کا پروگرام بنا۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ ماسکو میں زمیں دوز ریلیں بھی چلتی ہیں۔ اب تک مجھے لندن اور پیرس کا تجربہ تھا۔ مس مارگریٹا پاؤلونا نے بتایا کہ "نہیں جی، ماسکو میٹرو بھی خوب ہے۔" وہ بہت اچھی اور بامحاورہ اردو بولتی ہیں۔ ان کے بعض محاوروں کے صحیح استعمال پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ ان کا "اب نہیں جی!" کا استعمال بڑا دلچسپ ہے۔ میں نے آج ان سے پوچھا کہ "کیا آپ نے لندن کی میٹرو دیکھی ہے۔" انھوں نے بتایا کہ میں تو اپنی زندگی میں روس سے باہر صرف ایک بار گئی ہوں۔ میں نے کہا کہ لندن تو بہت قریب ہے۔ انہیں بتایا کہ لندن سے میرا قریبی تعلق ہے۔ وہاں ہمدرد مطب اور دواخانہ ہے اور کبھی کبھی میں خود وہاں جا کر مطب کرتا اور مریضوں کے لئے طب مشرق کے طریقۂ علاج کے مطابق دوائیں تجویز کرتا ہوں۔ میں آپ کو ایسے ہی کسی موقع پر لندن آنے کی دعوت دوںگا۔ مس مارگریٹا نے بڑے دلچسپ انداز میں کہا: "اس کی کوشش بھی نہ کیجئے۔" اس جملے میں ایک جہان آباد تھا۔ میں نے اس موضوع پر خاموشی اختیار کرلی اور زمین دوز ریلیں دیکھنے کی تیاری کرلی۔

ماسکو میں زیر زمین کل ننانوے ریلوے اسٹیشن ہیں۔ میں نے آج تیرہ چودہ اسٹیشن دیکھ لئے۔ ان کا نظام بڑا دلچسپ ہے۔

کسی بھی اسٹیشن پر لگی ہوئی مشین میں دس کوپک ڈال دیجئے اور اس کے بعد ”زیر زمین“ جب تک دل چاہے، رہئے، اور جہاں دل چاہے، ریل سے چلے جائیے - ہر اسٹیشن پر راستے بنے ہوئے ہیں اور ہر گزرگاہ پر مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر دس کوپک نہ ڈالے جائیں اور اندر جانے کی کوشش کی جائے تو ناکامی ہوگی - راستہ بند ہوجائیگا۔ میں نے تجربے کے طور پر ایسا کرنا چاہا لیکن ارادہ ترک کردیا۔ لندن میٹرو اور پیرس میٹرو میں بھی پہلے یہی قاعدہ تھا کہ ایک بار داخل ہوکر چاہے رات تک نہ نکلیں مگر اب اسے منسوخ کردیا گیا ہے - سیزن ٹکٹ جن کے پاس ہیں، ان کا راستہ الگ ہوتا ہے اور چک کرنے کے لئے عورتیں موجود رہتی ہیں - یوں بھی میٹرو پر زیادہ تر عورتیں ہی کام کرتی ہیں اور اکثریت بوڑھی عورتوں کی ہے۔ بعض بڑے اسٹیشنوں کی خودکار سیڑھیوں پر بوڑھی عورتیں کرسی پر نیم دراز دیکھی گئیں - میں نے مارگریٹا سے پوچھا: ”یہ صاحبہ یہاں کیوں تشریف فرما ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا: ”چونکہ بعض جگہ یہ سیڑھیاں بہت بلند ہیں، کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے، اس لئے یہ فرسٹ ایڈ اور دوسری قسم کی امداد کے لئے متعین ہیں -“ یہ بات مجھے اچھی معلوم ہوئی - اس کا مطلب یہ تھا کہ سوویت یونین کی حکومت عوام کا کس درجہ خیال رکھتی ہے -

ماسکو میٹرو کا استعمال بھی خوب ہے، بالخصوص شام کے وقت، جو ہم نے پسند کیا تھا۔ اس وقت بڑی آمدو رفت اور خوب چہل پہل رہتی ہے - ٹرینیں بڑی تیز رفتار ہیں اور بکثرت ہیں - ہر دو منٹ کے بعد ٹرین ضرور ہی مل جاتی ہے۔ زیادہ دیر انتظار

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک میں ڈبوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے اور سب بھرے ہوئے نظر آتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس طریقۂ سفر کو پسند کرتے ہیں - میں نے تیرہ چودہ اسٹیشنوں کی سیر کی اور کہیں بھی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ بہرحال دو گھنٹے کا یہ تجربہ بہت ہی دلچسپ اور معلومات افزا رہا۔ لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا - بعض ڈبوں کے بارے میں تو یہ گمان ہوا کہ شاید یہ مطالعے کے کمرے ہیں۔ ہر شخص کے ہاتھ میں کتاب تھی اور ہر شخص پوری محویت کے ساتھ مطالعے میں مشغول تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر طالب علم امتحان دینے جا رہا ہے - مطالعہ کا یہ ذوق خوب ہے - لندن میٹرو میں بھی آدھے سے ذرا کم ہی مسافر اخبار بینی کرتے نظر آتے ہیں - پیرس میں مطالعہ کرنے والوں کی تعداد برائے نام ہوتی ہے -

یہاں میٹرو میں میری نگاہیں اختلاط مرد و زن دیکھنا چاہتی تھیں - میں نے اپنی توجہ کو مرکوز اور نگاہوں کو تیز رکھا مگر ماسکو میٹرو میں ڈبوں کی سیٹوں پر کوئی بے ہودگی نظر نہ آئی - اس شائستگی اور انسانیت پر اطمینان ہوا۔ پیرس میٹرو میں اب سے چند سال پہلے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میٹرو مظاہرۂ حیوانیت کے لئے ہے مگر چارلس ڈیگال نے ذہنی انقلاب برپا کیا اور جب ۱۹۷۳ء میں مجھے پھر پیرس میں کوئی مہینہ بھر تک رہنے کا اتفاق ہوا اور کم خرچ میٹرو استعمال کرنے کا زیادہ موقع ملا تو میں نے ایک ماہ میں صرف ایک بار بارہ بجے شب ایک جگہ بوس و کنار دیکھا جبکہ لندن میں آج بھی اس مشغلے میں زیادتی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں تک ماسکو میٹرو کا تعلق ہے ایسا نہیں ہوتا۔

میں نے اس دوران میں خاص طور پر یہ چیز نوٹ کی کہ ان ریلوں میں، جہاں روز روشن میں بھی بلب جلتے ہوتے ہیں، کوئی بیہودگی نہیں ہوتی۔ ہر عورت و مرد کو، ہر بوڑھے اور جوان کو اپنے کام سے کام ہے۔ ہنسی ٹھٹھول تک کا کوئی مظاہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کسی عورت کو چھیڑنا تو بڑی بات ہے، نظر جما کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ جبکہ مرد اور عورت سب ایک ساتھ چڑھتے، اترتے اور بیٹھتے ہیں۔ یہ نظم و ضبط قابل تعریف ہے۔

البتہ ایک خاص بات یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں جب میں ماسکو پہلی بار آیا تو یہ نوٹ کیا تھا کہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ نہ ہنستے تھے، نہ کھیلتے تھے۔ لینن کے مزار پر اور کریملن کے احاطے میں بھی لوگ گم صم نظر آئے۔ مزار لینن کے قریب ایک بڑا اسٹور ہے، اس کا نام ''گم'' ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید لوگ یہاں اسی لئے گم صم رہتے ہیں۔ مگر اس بار یعنی ۱۹۷۸ء میں مزاج کی تبدیلی محسوس کی۔ لوگ اپنے چہروں پر اب مسکراہٹ کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

لندن میٹرو اور پیرس میٹرو کے کم و بیش ہر اسٹیشن پر اشتہارات کی بھرمار دیکھی گئی۔ ہر اسٹیشن کی دیواریں معقول اور نا معقول اشتہارات سے لپی ہوئی دیکھی گئیں اور خود ریل کے ڈبوں میں اشتہارات کی بھرمار ہے۔ ان کے برعکس ماسکو میٹرو میں کسی بھی اسٹیشن کی دیواروں پر یا ریل کے ڈبوں کے اندر کوئی اشتہار نظر نہیں آیا۔

ماسکو میٹرو کا ہر اسٹیشن کسی نہ کسی واقعہ کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے اور حسن و جمال کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

ایسے جاندار اور خوب صورت اسٹیشن میں نے تو کہیں اور دیکھے نہیں۔ ہر جگہ سنگ سفید کا استعمال بڑی فراوانی سے کیا گیا ہے۔ روشنی کے لئے ہر اسٹیشن پر الگ الگ نمونے کے جھاڑ آویزاں ہیں، ایسے کہ دیکھ کر دل خوش ہوجائے۔ ایسے جھاڑ فانوس تو عموماً محلات میں ہوا کرتے ہیں۔

ایک اسٹیشن روس کی سب سے اہم شخصیت لینن کے نام سے منسوب ہے۔ ان کے اقوال اسٹیشن کی دیواروں پر بڑی خوب صورتی کے ساتھ رنگین حروف میں لکھے گئے ہیں۔ کوئی قول کسی واقعہ سے متعلق ہے تو اس کی نقشہ کشی بھی کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ زینوں پر جو ریلنگ ہے، اس کے نقش و نگار میں بھی کوئی نہ کوئی قول ثبت کیا گیا ہے۔ ہر اسٹیشن پر یہی حال ہے۔ غرض میٹرو کے اکثر اسٹیشن کسی نہ کسی تاریخ کے حامل ہیں۔ میں نے اس انداز فکر اور طرز عمل کو دل چسپی کے ساتھ دیکھا اور میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اس کا اثر بھی قبول کیا۔ ایسے کام صرف وہی اقوام و ملل کرسکتی ہیں جو زندہ رہنا چاہتی اور زندہ رہنے کے طریقے جانتی ہیں اور زندہ لوگوں کو ہمنوا بنانے پر کمربستہ ہیں۔ میں نے چشم تصور سے وطن عزیز کا مشاہدہ کیا تو کم سے کم کراچی کا نقشہ برعکس نظر آیا۔ یہاں گلیوں اور سڑکوں، محلوں اور بازاروں میں لوگ چلتے پھرتے اوباشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہنسی مذاق ہی نہیں، ایذا رسانی، دھکم پیل معمولات زندگی میں شامل ہوگئے ہیں۔ انسانیت کچلے ہوئے سانپ کی طرح رینگتی نظر آتی ہے۔

میٹرو کی سیر دو گھنٹے میں ختم ہوئی اور اس دوران میں

سگریٹ یا سگار کا ذرہ برابر دھواں پھیپھڑوں میں نہیں گیا۔ میٹرو میں سگریٹ نوشی ممنوع ہے۔ اس ممانعت کا ہر شخص احترام کرتا ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں کوئی ہدایت کہیں لکھی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ہمارے ملک کی شاید ہر بس میں "سگریٹ نوشی منع ہے"، لکھا ہوا نظر آئیگا لیکن کنڈکٹر اور ڈرائیور سمیت اکثر مسافر یہ شغل کرتے نظر آئیں گے اور پاس بیٹھے ہوئے مسافر کا ذرا لحاظ نہیں کرینگے۔ میٹرو میں اگر کوئی شخص سگریٹ پیتا نظر آجائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ غیر ملکی ہے اور شہر کے قانون سے ناواقف ہے۔

میں نے اس دوران میں ایک بڑا دلچسپ مطالعہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ تمام چہروں پر ایک فلسفیانہ بردباری اور سنجیدگی طاری ہے۔ کسی مرد یا عورت کا مسکراتا چہرا نظر نہیں آیا۔ نہ کسی کا قہقہہ سنائی دیا۔ ہوائی جہاز ہی سے اس مطالعے کا آغاز ہوا تھا اور اس وقت تک ہزاروں روسی چہرے مسکراہٹ کے بغیر دیکھ لئے۔ ہوٹل نیشنل کے کاؤنٹر پر بھی چار خواتین مومی مورتیوں کی طرح دکھائی دیں مگر کیا مجال کہ ان کے چہروں کی سنجیدگی بلکہ یوں کہئے کہ ان کے ماتھے کے بل ذرا بھی دور ہوجائیں۔ لفٹ میں، کمروں کی خادمائیں، سب کے چہرے مسکراہٹ کے بغیر تھے۔ شاید اوقات کار میں یہ ان کے فرائض کا جزو تھا۔ اسکے بعد وہ مسکرانے اور قہقہے لگانے کے لئے وقت نکالتے ہونگے۔

اچھی طرح سیر کرلینے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے مس مارگریٹا پاؤلونا کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ یہاں سے ہی اپنے گھر چلی جائیں کیونکہ وہ ماسکو سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے اور میٹرو کے ذریعہ سے ہی انہیں جانا تھا۔ میں نے یقین دلایا

کہ میں تنہا ہوٹل یوکرائن چلا جاؤنگا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی نہ مانی۔ اسے اپنی ذمہ داری کا پوری طرح احساس تھا۔ مجھے اس نیک خاتون پر ترس آرہا تھا کیونکہ اب سردی کی لہر زیادہ شدید ہوگئی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ اس کی عادی تھیں لیکن پھر بھی سردی محسوس تو سب کو ہوتی ہے۔ لیکن میرے مشورے کے برعکس وہ ہوٹل تک ساتھ آئیں اور مجھے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئیں۔

میں اس دوران میں اتنا تھک گیا تھا کہ قویٰ جواب دے گئے تھے۔ بازار میں پیدل چلنے کے علاوہ میٹرو کی دو گھنٹے کی سیر میں بھی بہر حال پیدل ہی چلنا پڑا۔ مجموعی طور پر سولہ سترہ میل کی مسافت طے کی۔ اپنی پرانی عادت ترک کردینے کے باعث اور کچھ تقاضائے عمر کی وجہ سے زیادہ پیدل چلنا اب اکھرنے لگا ہے۔ ورنہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب میں پہاڑوں پر ۱۵-۲۰ میل روزانہ چلتا تھا اور کوئی تھکن نہیں ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد میں کراچی آگیا تو زندگی کے معمولات بدل گئے۔ اب گھر سے مطب اور مطب سے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کا دفتر معمول بن گیا ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ ہفتے میں دو تین دن صبح ٹینس کھیلنے کا وقت نکال لیتا ہوں ورنہ تو صحت ہی خراب ہوجائے۔ میٹرو سے واپس آنے کے بعد یہ جی چاہتا تھا کہ فوراً آرام کرنے کے لئے بستر پر دراز ہوجاؤں لیکن بھوک نے بھی سخت بیتاب کر رکھا تھا۔

میں نے غسل خانے میں جاکر ہاتھ منہ دھویا تاکہ ذرا ترو تازہ ہوجاؤں۔ پھر کھانے کے ہال میں چلا گیا۔ اگر انسان دن کو کچھ نہ کھائے اور ناشتہ بھی ہلکہ کرے تو رات کا کھانا تو

سیر ہو کر کھانا چاہئے۔ ہال میں چند لوگ پہلے سے موجود تھے۔ آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ زیادہ تر مقامی باشندے تھے۔ یہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر بار کھانے کے پیسے نقد دینے ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہوٹل میں مقیم مسافر کھانا کھائیں اور بل پر دستخط کردیں اور اپنے کمرے کا نمبر ڈال دیں تاکہ کھانے کی رقم ہوٹل کے بل میں کرائے وغیرہ کے ساتھ محسوب ہوجائے۔ یورپ میں ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر ماسکو میں اور ممکن ہے تمام سوویت یونین میں بل فوراً ادا کرنا ہوتا ہے۔

میں جب ہال میں داخل ہوا تو کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی منتظمہ نے مجھے پہچان لیا کہ میں مہمان ہوں مگر میرے ساتھ چونکہ مس مارگریٹا نہیں تھیں، جن کو میری طرف سے بل ادا کرنا تھا، اسلئے وہ خاتون ذرا مذبذب تھی۔ میں نے اس کی گھبراہٹ محسوس کی اور اس کا تذبذب دور کردیا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ میں بل کی رقم ادا کر دونگا۔ اس نے اپنی زبان میں سوال کیا ”مولیا“ یعنی آپ کے پاس بل ادا کرنے کے لئے پیسہ ہے۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ مطمئن ہوگئی اور بیرے کو اشارہ کیا کہ مجھے اس روز کا مینو دکھا دیا جائے۔

طعام برائے نام

میرا قاعدہ ہے کہ میں دوسرے ملک میں جا کر گوشت کھانے سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ یہ یقین نہیں ہوسکتا کہ جانور اسلامی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے۔ لہذا میں نے ٹماٹر کا سوپ اور ابلے ہوئے انڈے نیز ڈبل روٹی کے توس منگوا لئے۔ یہ

میرے لئے کافی سامان خوراک تھا۔ ہوٹل کے کارکنوں کو تعجب ضرور ہوا ہوگا کیونکہ ایسی فرمائش کبھی کسی نے نہیں کی ہوگی۔ آخر میں آئس کریم نے لطف دیدیا۔ ہال میں دوسرے لوگ گرم کافی پی رہے تھے کیونکہ موسم سرد تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں آرکسٹرا کا اہتمام تھا۔ مغربی انداز کا گانا بجانا ہورہا تھا لیکن میرے لئے اس میں کوئی سامان نشاط نہیں تھا بلکہ میرے کانوں کے پردے لرز رہے تھے۔ اپنے ملک میں جو پکا گانا گایا جاتا ہے اس سے بھی یہی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے۔

میں ہوائی جہاز کے ہر سفر میں عموماً آرام سے سوجاتا ہوں۔ کرسیاں آرام دہ ہوں اور پاؤں پھیلانے کی جگہ مناسب ہو تو کسے نیند نہیں آسکتی۔ لیکن ایرو فلوٹ کے اس ہوائی جہاز نے، جس سے میں نے سفر کیا، کرسیاں غیر آرام دہ تھیں اور پاؤں پھیلانے کی جگہ نہیں تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ پیر توڑ دئے تھے۔ جسم چور چور ہورہا تھا۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل پہنچنے پر ارادہ تھا کہ ایک دوگھنٹے خاموش لیٹ کر آرام کروں اور ساری تھکن دور کردوں لیکن ایک گھنٹے بھی کمرسیدھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سارے دن مصروفیت رہی۔ اس پر پیدل چلنا مستزاد ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رات کو سونے سے قبل اپنی دیرینہ عادت کے مطابق میں نے مسعود مفتی صاحب کی کتاب پڑھنے کی کوشش کی تو ایک پیراگراف بھی حاضر دماغی کے ساتھ نہ پڑھ سکا۔ فوراً آنکھ لگ گئی۔ ایسا سویا کہ صبح کی خبر لایا۔ رات بھر ایک ہی کروٹ سویا جو خلاف معمول تھا۔ تاہم اس گہری نیند نے میرے انجر پنجر کہ جو ڈھیلے ہوگئے تھے، خوب کس دئے

بالکل اسی طرح جیسے سازندہ سارنگی کے تار کس کر سر ساگر کی تیاری کرتا ہے۔ میں بھی تمام دن اس نئی سرزمین پر علمی اور ادبی جدو جہد کے لئے تیار ہوگیا۔

میرے دوست مسعود مفتی نے دو کتابیں حال ہی میں لکھی تھیں — " لمحے " اور " ریزے "۔ میں یہ دونوں کتابیں اپنے ساتھ انتقاماً لے آیا تھا۔ سوچا تھا کہ یہاں فرصت کے لمحات میں پڑھ لونگا۔ یہ مشرقی پاکستان کے بارے میں ہیں۔ مشرقی پاکستان کا تاریخی سانحہ اس علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہے جہاں میں اس وقت ٹھیرا ہوا تھا۔

دستکاری کی دکان میں

میں ناشتہ کر چکا تھا اور صبح کا ایک اخبار پڑھ رہا تھا جو ہوٹل کے منتظمین نے فراہم کردیا تھا کہ مس مارگریٹا پاؤلونا نوبجے کے قریب آگئیں۔ ان کی ذمہ داری کا دائرہ صرف مجھ تک وسیع تھا۔ یعنی میری ترجمانی ان کے فرائض میں داخل تھی۔ میں نے خیال کیا کہ جب فیض صاحب آجائیں گے تو شاید ان کی ترجمان بھی یہی خاتون ہونگی اور یہ " شرکت غیرے " کے مترادف بات ہوگی۔ ظاہر ہے کہ میں یہی چاہونگا کہ مس مارگریٹا فیض احمد فیض صاحب کا زیادہ خیال کریں۔ وہ بزرگ ہیں۔ پھر روس میں ان کا مقام بلند ہے۔ وہ لینن پرائز یافتہ ہیں کہ جو روس کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ اس وجہ سے فیض صاحب کو روس میں ہر پاکستانی سے زیادہ تفوق حاصل ہے اور ان کا مرتبہ بھی بلند ہے۔ شاید یہ کہنا بھی زیادہ غلط نہ ہوگا کہ جناب فیض پاکستان میں روس کے

نمائندے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو پاکستان میں بھی پورا تحفظ حاصل ہے۔ کوئی ان کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔

ابھی وقت تھا۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ قریب ہی روسی دست کاری کی جو چند دکانیں اور کھلونوں کا ایک مرکز ہے، وہاں جانا چاہئے۔ ان کو دیکھ لینا معلوماتی اعتبار سے مناسب تھا۔ لہذا مس مارگریٹا اور میں پیدل چل پڑے۔ یہاں کی سیر بڑی دلچسپ رہی۔ دستکاری کی دکانوں میں سے ایک دکان میں چینی مٹی کے ظروف رکھے تھے جو بہت ہی قابل دید تھے۔ خصوصاً چائے کے سیٹ مجھے بہت پسند آئے۔ ان پر جو مختلف رنگوں میں ہاتھ سے نقاشی کی گئی تھی وہ بےحد جاذب نظر تھی۔ دوسرے ظروف میں مرتبان، پیالے، رکابیاں اور حقے قابل ذکر تھے۔ روس میں اس فن کو ۱۷٦٦ء میں یعنی روسی ملکہ کیتھرائن دوم کے عہد میں فروغ نصیب ہوا تھا۔ اب کئی فیکٹریاں اس صنعت میں حصہ لے رہی ہیں۔ اس کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اس اٹھارھویں صدی میں فرانس کی ایک فرم روس سے عمارتی لکڑی خریدتی تھی۔ روسی جہاز جب لکڑی کے سلیپر فرانس کے ساحل پر اتار کر واپس آتے تو کوئی اور وزنی چیز نہ ہونے کے باعث جہاز کا حصہ مطلوبہ سطح تک پانی میں ڈوب نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ساحل کے قریب ملنے والی ایک خاص قسم کی مٹی اس میں بھری جاتی اور روس آکر اسے ساحل کے قریب ڈال دیا جاتا۔ رفتہ رفتہ اس مٹی کا ایک پہاڑ بن گیا۔ پھر ایک صنعت کار کو خیال آیا کہ اس مٹی سے استفادہ کیا جائے۔ تجربات کے بعد اسے ظروف کے لئے مفید پایا گیا۔ وہ مٹی ختم ہوگئی اور جہازوں کا سابقہ نظام بھی بدل گیا تو خود روس میں اس قسم

کی مٹی کی چھان بین شروع ہوئی اور ماسکو کے قریب ہی پہاڑوں میں اس کا پتہ لگا لیا گیا - اب یہ ملک دوسرے علاقے کا محتاج نہیں رہا - کئی کارخانے وجود میں آگئے - میں نے بہت سے ڈیزائن پسند تو کئے لیکن یہ سوچ کر مایوسی ہوئی کہ ان کو وطن تک لے جانا آسان کام نہیں ہے - نہ اتنا زرمبادلہ میرے پاس تھا نہ جہاز میں منظور شدہ وزن میں گنجائش تھی - لہذا صرف اس سامان کی زیارت پر اکتفا کیا - ایک اور دکان کھلونوں سے بھری ہوئی تھی - وہ سادے، روغنی، چوبی اور کپڑے کے تھے - زیادہ تر لڑکیوں کے ذوق کو مد نظر رکھا گیا تھا - بعض کھلونے وضع قطع کے اعتبار سے ان کھلونوں سے ملتے جلتے تھے جو برصغیر پاک و ہند میں ہولی دیوالی یا دوسرے تہواروں کے موقع پر بکتے ہیں - میں نے ان کو بھی دیکھ لینا کافی سمجھا - کچھ دکانیں گھریلو دستکاریوں یعنی کاٹیج انڈسٹری کی تھیں - ان میں بعض اشیاء انتہائی دلچسپ بلکہ دل پسند تھیں - مثلاً قروشئے سے تیار کئے ہوئے خواتین کے پہننے کے کپڑے ترغیب خریداری دے رہے تھے مگر قیمتیں ان کی ایسی تھیں کہ جو سامان پسند آجائے، اسے میں خرید نہیں سکتا تھا - اس سر زمین پر رہتے ہوئے جیب اجازت نہیں دیتی تھی - مجھے اس سفر کے لئے صرف تیس ڈالر ملے تھے کیونکہ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ میرے تمام اخراجات سرکاری طور پر برداشت کئے جائیں گے - لیکن ظاہر ہے کہ اس میں خریداری کی کوئی مد شامل نہیں ہوسکتی تھی - کوئی ذریعہ ممکن بھی ہو تو مجھے پسند نہیں تھا -

میں نے سفارت خانۂ پاکستان کے جناب اقبال صاحب سے دریافت کیا کہ مجھے مختلف موقعوں پر کتنی ٹپ ادا کرنی چاہئے -

"ایک یا دو روبل" ان کا جواب تھا اور یہ ٹھیک ہی تھا - مجھے کچھ کچھ تجربہ ہو چلا تھا - مثلاً اپنا اوورکوٹ کسی نگراں کے پاس عارضی طور پر رکھوا دیا گیا تو ایک روبل ادا کرنا پڑگیا - زرمبادلہ کے نرخ کے مطابق ایک روبل پاکستان کے چودہ روپے کے برابر ہوتے ہیں - ایک سو امریکی ڈالر کے ستر روبل ملتے ہیں - اس سرکاری نرخ سے قطع نظر سنا ہے بازار میں زیادہ بھی مل جاتے ہیں - مگر تیس ڈالر کی قیمت بڑھانے کے لئے مجھے ناجائز کاروبار کا سہارا لینا پڑتا اور یہ مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا - یہ کھیل کھیلنے کے لئے اپنے ضمیر کو کچل کر اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے - بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے یہ بات معمولات زندگی میں داخل ہے - میں نے ہمیشہ اس سے اجتناب کیا ہے - بس اتنی بات ہے کہ اس اصول کو برقرار رکھنے کے لئے نقصان اٹھانا یا کم سے کم مایوس و محروم ہونا پڑا ہے - یہ غنیمت ہے - میں نے فیصلہ کیا کہ وہ قدم نہیں اٹھایا جائیگا جہاں ٹپ دینا پڑے -

روبل نہیں ڈالر

ایک دکان ایسی بھی دیکھی جہاں ہر چیز کی قیمت وصول کرتے وقت صرف ڈالر قبول کئے جاتے ہیں - یہ کتابوں کی دکان ہے - میں نے وہاں ماسکو کے بارے میں ایک مصور کتاب دیکھی - اسے دس امریکی ڈالر دے کر خرید لیا - یہ انگریزی زبان میں تھی اور ماسکو ہی کے ایک ناشر نے اسے چھاپا تھا - اس بازار کی باقی سب چیزوں کو میں عجائب گھر میں رکھی ہوئی اشیائے ممنوعہ

کی طرح صرف دیکھ کر آگے بڑھتا رہا ۔ اگر خریداری کا شوق مجھے ترغیب دیتا تو خواہ مخواہ دل دکھتا ۔ خصوصاً کتابوں کے معاملے میں عموماً میری نیت خراب ہونے لگتی ہے اور میں دل تھام کر رہ جاتا ہوں ۔ میری حالت یہ ہے کہ اگر مجھے اچھی کتابیں کہیں نظر آجائیں تو میں اپنے کپڑے فروخت کرکے ان کو خرید لونگا ۔ مگر ماسکو میں مجھے یہ سوچنا بھی پڑا کہ میری یہ سرد شیروانی اس سخت سرد مقام پر کون خریدیگا ! ممکن ہے کہ کسی عجائب گھر کا منتظم اسے ایک عجوبۂ روزگار سمجھ کر خریدلے اور اپنے عجائب گھر کی زینت بنادے !

اگر ہوٹل میں وقت ملاقات مقرر نہ ہوتا تو شاید کچھ اور دکانوں میں چیزوں کے دیدار کئے جاتے ۔ لہذا ہوٹل واپس آجانا پڑا ۔ ٹھیک پونے بارہ بجے " مادام بلبل " آگئیں ۔ مادام سولووی اووا مالی ڈورا تاتیانا مجھسے ملنے آگئیں ۔ ان کے روسی نام کا فصیح ترجمہ " بلبل " ہوتا ہے ۔ یہ مارگریٹا نے بتایا تھا ۔ (دروغ بر گردن مترجم) مادام سولووی اووا کا تعلق نیشنل کمیشن برائے یونیسکو روس سے ہے ۔ یہ یہاں نائب نگراں ہیں ۔ کورئر کے روسی ایڈیشن کی مدیرہ ہیں ۔ یونیسکو کے زیر اہتمام کورئر سولہ زبانوں میں نکلتا تھا ۔ میری کوشش سے وہ اردو زبان میں میری ہی ادارت میں چند ماہ سے نکلنے لگا ہے ۔ اس طرح اس کی اشاعت دنیا کی سترہ زبانوں میں ہونے لگی ہے ۔ سال گزشتہ پیرس میں مدیران کورئر کا جو اجلاس ستمبر میں منعقد ہوا تھا ، اس میں مجھے بھی شریک ہونا پڑا تھا ۔ مادام سولووی اووا نے بھی اس میں شرکت کی تھی اور ان سے میری ملاقات بس وہیں پیرس میں ہوئی تھی ۔ انہوں نے

آخری دن میرے بارے میں یہ ریمارک پاس کیا تھا : " حکیم سعید تم بہت گہرے آدمی ہو ۔ اوپر سے ٹھیرے ہوئے دکھائی دیتے ہو لیکن اندر ایک تلاطم برپا رہتا ہے ۔" میں ان کی اس رائے کے خوب مزے لیتا رہا ۔ اب دوسری ملاقات کے وقت سوچا کہ ان سے پوچھوں کہ آپ اپنی رائے پر قائم ہیں یا کچھ ترمیم کردی ہے ، لیکن اس کا موقع نہ مل سکا ۔

شوہر نصف ترک بیٹا پاؤ ترک

مادام سولووی اووا کے شوہر کے والد ترک نژاد تھے ۔ اس لئے وہ اپنے شوہر کو نیم ترک اور اپنے بیٹے کو پاؤ ترک کہتی ہیں ۔ ان کے صاحبزادے ان دنوں واشنگٹن میں روسی سفارت خانے سے وابستہ ہیں ۔ مادام خود بھی شروع میں امریکہ میں چار سال تک روسی سفارت خانے میں کام کرچکی ہیں ۔ ان کی سیاسی زندگی بڑی دلچسپ ہے ۔ انہوں نے جرمن زبان سیکھ لی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی میں مقیم تھیں ۔ جنگ ختم ہونے کے بعد نیورمبرگ ٹرائل شروع ہوا تو اس میں مادام سولووی اووا شریک تھیں ۔ دیکھا جائے تو ان کے سیاسی کیرئر کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے ۔ انہوں نے ہٹلر کے معتمد خاص ھرھیس کے بارے میں بتایا کہ وہ کم از کم سات مہینے تک یہ تاثر دیتا رہا کہ وہ حافظے سے محروم ہے اور اسے بالکل کچھ یاد نہیں ہے ۔ اس کے وکلاء بھی مسلسل یہی کہتے رہے کہ ھرھیس یاد داشت کھو چکے ہیں ۔ مگر سات ماہ کے بعد ھرھیس نے خود ہی اعتراف کرلیا کہ میں عدالت کو سات ماہ تک غلط تاثر دیتا رہا ہوں ۔ مجھے بہت کچھ یاد ہے ۔

ہوٹل سے نزدیک ریستوران پراگ ایک معروف جگہ ہے۔ آج مادام موصوفہ نے دن کے کھانے کے لئے مجھے مدعو کیا اور اپنے ساتھ وہاں لے گئیں۔ میں نے واضح طور پر یہ مسئلہ ان کو سمجھا دیا کہ میں فل لنچ کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ محض ناشتے کے طور پر کچھ کھا پی لیتا ہوں۔ اب سوال یہ تھا کہ دودھ کہاں سے آئے۔ ریستوران میں چائے یا کافی کے لئے پوڈر کا دودھ تو مل سکتا تھا لیکن ویسے پینے کے لئے دودھ کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ٹماٹر کے رس کو دودھ کا نعم البدل بنالیا۔ اس کے علاوہ حسب معمول ابلے ہوئے انڈے اور ڈبل روٹی پر اکتفا کیا۔ علاوہ ازیں کووی آر (مچھلی کے انڈے) بڑے مزیدار تھے۔ میں نے ان کا استعمال کیا۔ پروٹین کے لئے اس سے بہتر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔ مگر ہے بڑی گرم شے۔ ۱۹۷۰ء میں بابا جان غفوروف نے کوئی چھے سات پونڈ کووی آر کا ڈبہ مجھے عطا فرمایا تھا۔ ہدایت تھی کہ میں اسے پیرس لے کر نہ جاؤں۔ وہاں کی حکومت اسے ضبط کرلیگی۔ لہذا میں اسے لندن لے گیا۔ وہاں دریافت کرنے پر قیمت کا اندازہ ہوا کہ وہ پانچ چھے ہزار رپے کے برابر تھی۔ میں نے یہ ہدیہ خضر نقوی صاحب کو دیدیا کہ وہ اس سے اپنے انگریز دوستوں کی خاطر تواضع کریں۔ میں نے خود استعمال نہیں کیا۔ لندن میں اس کی بڑی شہرت ہے۔ کووی آر بڑے مقوی، باہ بھی ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا۔

مادام سولووی اووا سے دوگھنٹے تبادل خیال کیا۔ اور طے یہ پایا کہ دوسرے دن میں نیشنل کمیشن فار یونیسکو کے دفتر میں ساڑھے بارہ بجے پہنچ جاؤں۔ وہاں میری ملاقات سکریٹری جنرل

سے ہوگی اور لنچ بھی وہیں دینگے۔ سکریٹری جنرل جناب نکولائی ای میرنوف ہیں۔ یہ بالکل واضح تھا کہ ہماری گفتگو کا دائرہ یونیسکو کے ماہنامہ کورئر سے بطور خاص متعلق ہوگا۔ یونیسکو کے صدر مقام واقع پیرس میں کورئر تین زبانوں میں یعنی انگریزی، فرانسیسی اور روسی میں مرتب ہوتا ہے اور پھر دنیا کی سولہ اور زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوکر مقامی طور پر چھاپا جاتا ہے۔ حال ہی میں پاکستان سے اردو زبان میں اس کی اشاعت میری ادارت میں عمل میں آئی ہے۔ اس لئے میر نوف صاحب اس ضمن میں مجھسے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے یقین کرلیا کہ یہ مذاکرات طرفین کے لئے مفید ثابت ہونگے۔ مادام نے مجھے ڈھائی بجے ہوٹل لاکر چھوڑ دیا۔ اور کل تک کے لئے "چیری او" پر آج کی ملاقات ختم ہوگئی۔

کمرے میں آیا تو مس مارگریٹا پاؤلونا میرے انتظار میں موجود تھیں۔ اب کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ آوارہ گردی پھر شروع کردی جائے۔ چنانچہ ہم دونوں نکل کھڑے ہوئے اور ماسکو کی سڑکوں کا طول و عرض ناپتے رہے۔ دکانوں میں جاکر مصنوعات اور بعض نوادرات کا جائزہ بھی لیا گیا۔ یہ آوارہ گردی چھے بجے تک جاری رہی۔ اس وقت سامنے ہوٹل میٹرو پول آگیا۔

تین سال پہلے کی پریشانی

اس ہوٹل میں ۱۹۷۰ء کے دوران سفر میں نے ایک دن قیام کیا تھا۔ میرے ساتھ جمیل الدین عالی صاحب بھی تھے۔ ہم

دونوں نے کفایت شعاری کے خیال سے ایک کمرہ لیا تھا کیونکہ کرائے کے طور پر ساٹھ امریکی ڈالر ادا کرنے تھے۔ کراچی سے روانہ ہوتے وقت ہم دونوں کو بتیس بتیس ڈالر ملے تھے۔ ان میں سے تیس تیس ڈالر کمرے کے کرائے میں خرچ ہوئے۔ اب بتائے چار ڈالر میں مشترکہ طور پر ہم دونوں کیا کرتے۔ جمیل الدین عالی صاحب کی رائے تھی کہ ہمیں اس ضمن میں اپنے سفیر پاکستان سے شکایت کرنی چاہئے۔ عالی صاحب ایک خاص مزاج کے آدمی ہیں۔ وہ خود بےخبری میں کبھی کبھی ایسی باتیں کرجاتے ہیں کہ جہاں ہمارے مخصوص حالات کے پیش نظر خاموشی مناسب ہوتی ہے۔

یہ تھی وہ صورت حال جس پر میں نے وزارت تعلیم سے سخت احتجاج کیا تھا کہ ہم کس طرح باہر جاکر پریشان ہوا کرتے ہیں۔ ارباب حل وعقد کو چاہئے کہ کبھی عقل سے بھی کام لے لیا کریں۔ بیس سال پرانے قاعدوں کی لکیر پیٹنا چھوڑ دیں۔ اگر حالات فوراً درست نہ ہوجاتے اور ہمارے سفیر صاحب، ہم پر مہربان نہ ہوتے تو ہمارے میزبانوں کو اور وطن میں رہنے والے رفقاء کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ہم پر کیسی مصیبت طاری ہوئی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتے کہ ہم ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے کے بعد باقی اخراجات کس طرح پورے کرسکے۔ میں نے عالی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ کچھ کپڑے میرے پاس ہیں۔ سرخ چوک بھی سامنے ہے جہاں ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہے۔ نئی اور پرانی سبھی چیزیں بک جاتی ہیں۔ خریدار بھی مل جاتے ہیں۔ باہمی معاہدے کے طور پر میں نے کہا کہ کپڑے میں دکھاؤنگا۔ بھاؤ تاؤ بھی میں

ہی کرلونگا۔ جو رقم جمع ہوگی، دونوں بانٹ لیں گے۔ لیکن غنیمت ہے کہ اس ناپسندیدہ اقدام کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ میرے لئے اور عالی جی کے لئے یہ تجربہ کم دلچسپ نہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ وہ گاھکوں کو جمع کرنے کے لئے اپنا کوئی دوھا بھی سنا دیتے۔

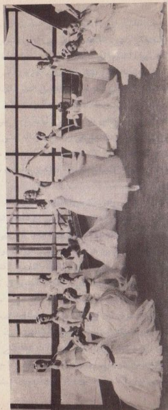
مرغی جان سے گئی

یہ سب باتیں جملہ ہائے معترضہ کے طور پر ذہن میں آئیں اور قلم کی روانی میں زیب داستاں ہوگئیں۔ دراصل ذکر تھا ہوٹل میٹرو پول میں پہنچنے کا۔ وہاں پہنچ کر مس مارگریٹا پاؤ لونا کی رائے ہوئی کہ ڈنر کھالینا چاہئے۔ کیونکہ اگر پروگرام کے مطابق ہم بیلے ڈانس دیکھنے والوں میں شامل ہوگئے تو رات دس بجے فارغ ہونگے اور اس وقت تمام ریستوران بند ملینگے اور ہم دونوں کو صبح تک کے لئے فاقہ کشی کی نوبت آجائیگی۔ میں نے حامی بھرلی۔ خیال تھا کہ میٹروپول کے ریستوران میں دودھ اور دہی مل ہی جائیگا اور میں اس طرح لذت کام و دہن حاصل کرلونگا مگر توبہ ہے، وہاں تو سوائے شراب اور گوشت اور لوازمات شراب کے کچھ بھی ممکن الحصول نہ تھا۔ بارے مرغی کا آرڈر دیدیا گیا اور جب یہ مرغی آگئی تو مجھے خیال آیا کہ یہ حلال کیسے ہو سکتی ہے۔ چھری کس نے پھیری اور زبان سے 'اللہ' اکبر، کے الفاظ ادا ہوئے یا نہیں؟ یہ سوچ کر سخت کراہیت پیدا ہوئی۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور ایسے کھانے سے پرہیز کیا۔ اپنی اس حماقت پر افسوس بھی ہوا کہ آرڈر خود میں نے دیا تھا۔ مرغی جان سے گئی اور کھانے والوں کے سواد کا ذکر تو کیا، فرمائش کرنے والوں نے چکھا بھی نہیں۔

میں نے ہاتھ تو کھینچ لیا لیکن سلسلۂ خیال نے ایک واقعہ یاد دلادیا ۔ گزشتہ اکتوبر میں یہ عاجز حکومت عراق کی دعوت پر کانفرنس ٹوین بی میں شریک ہونے بغداد گیا تھا ۔ وہاں میں تین دن تک انڈے کھاتا رہا ۔ ایک رات اسکاٹ لینڈ کے ایک دوست نے سوال کیا : ”کیا آپ سبزی خور ہیں ؟“ میں نے جواب دیا : ”نہیں“۔ فرمایا : ”پھر یہ گوشت سے گریز کیوں ہے ؟“ میں نے کہا کہ میں حلال گوشت ہی کھا سکتا ہوں ۔ اسکوچ دوست نے قہقہہ لگایا اور کہا : ”یہ تو مسلم ملک ہے“۔ مجھے بھی خیال آیا کہ واقعی میں بھی عجیب آدمی ہوں ۔ دراصل اس سے قبل میں تین ماہ مغرب میں رہا تھا اور اس دوران غیر حلال چیزوں سے پرہیز کرتا رہا تھا ۔ ذہن منتقل ہی نہ ہوا کہ اب میں دوسری جگہ ہوں ۔ لیکن یہ ممکن ہوتا بھی کیسے ۔ بغداد کے اس ہوٹل میں جب مینو سامنے آیا ، اس میں منجملہ اور چیزوں کے سؤر کا گوشت بھی درج تھا ۔ وہاں اکثر لوگ مے نوشی کرتے اور اس کے لوازمات سے دل بہلاتے ہیں ۔ اس لئے مغالطہ ہونا ضروری بھی تھا ۔ مس مارگریٹا کو میرے کھانا نہ کھانے کا افسوس ہوا ۔ مجھے بھی اس بات کا افسوس ہوا کہ وہ خرچ میزبان ملک کا تھا ۔

روسی بیلے اور بالشوئی تھیٹر

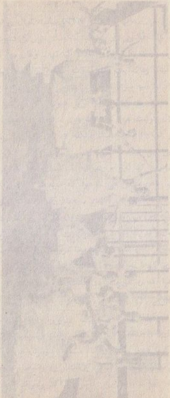
پروگرام کے مطابق میرے روسی میزبانوں نے مجھے روسی بیلے دکھانے کا انتظام کیا تھا ۔ میں رقص و موسیقی کے اجتماعات سے گریز کرتا ہوں ۔ میرے عام مشاغل دوسری نوعیت کے ہیں ۔ لیکن اپنی معلومات میں اضافے کے اعتبار سے یہ رقص دیکھ لینے میں کیا مضائقہ تھا ۔ روسی بیلے ڈانس کی اکثر تعریف سنی تھی ۔ سنا



روسی بیلے رقاصائیں جن کے مظاہرۂ فن کو حکیم محمد سعید نے پسند کیا ۔

تھا کہ ایک جم غفیر اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا ہے۔ ٹکٹ مہینوں پہلے بک چکے تھے۔ تا ہم میرے لئے کوئی دشوار مسئلہ نہیں تھا کیونکہ میرا انتظام تو سرکاری طور پر ہوا تھا۔ ہوٹل میٹروپول کے سامنے ہی بالشوئی تھیٹر واقع ہے۔ ۱۹۷۰ء میں وہاں داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں اور جمیل الدین عالی صاحب کامیاب نہیں ہوسکے تھے کیونکہ سرکاری پروگرام میں اسے شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بہر نوع اس بار موقع مل گیا۔ روس میں اس تھیٹر کی بڑی اہمیت ہے۔ چند دن پہلے ہی اس کا دوسوسالہ جشن تاسیس منایا گیا تھا۔ وہاں اہم ترین تقریبات بھی ہوا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر صدر الدین عینی کے جشن صد سالہ کا آخری جلسہ ۲۳ اپریل کو اسی جگہ ہونا ہے۔

ماسکو میں بیلے رقص کے بین الاقوامی مقابلے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت باقی دنیا کے فن رقص کے شاندار تہواروں جیسی ہوتی ہے۔ پچھلے سال ان مقابلوں کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی کیونکہ وہ ایسے موقع پر ہوئے کہ جب سوویت یونین کے عوام ایک عظیم تاریخی واقعے یعنی عظیم انقلاب اکتوبر کی ساٹھویں سالگرہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انقلاب اکتوبر کی کامیابی نے بیلے رقص کو نئے شائقین اور تماشائی عطا کئے تھے۔ سوویت عوام کی اکثریت کی دسترس اس فن تک ہوئی۔ چنانچہ تھیٹر میں مزدور اور کسان بڑی تعداد میں آنے لگے اور انہوں نے روسی فنکاروں اور رقص کے ہدایت کاروں کو نئے خیالات عطا کئے اور یہ سکھایا کہ اس دلپذیر فن کو عوام کے قریب تر کس طرح لایا جائے۔ یہ عمل بڑا تدریجی تھا۔ تا ہم یہ نہیں ہوا کہ روسیوں نے قدیم



افسانوی یا دیومالائی موضوعات کو یکسر مسترد کردیا ہو۔ انھوں نے ممتاز اور شہرہٗ آفاق مصنفین کی تحریروں کی بنیاد پر غنائیہ ڈرامے پیش کئے اور اس کے ساتھ ھی بہت سے فلسفیانہ موضوعات اور اھم مسائل کے بارے میں بھی پروگرام پیش کئے جن سے نہ صرف عام لوگوں میں جمالیاتی شعور پیدا ھوا بلکہ ان کے تخلیقی کاموں کے عمرانی جذبے اور اخلاقی موقف سے بھی عوام کو روشناس کرایا گیا۔ رقص کی ترقی میں چند مشہور کمپنیوں مثلاً ایگورموئی سیئف کی قائم کردہ لوک ناچ کی ریاستی کمپنی اور بیریوژکا کی ریاستی رقص کمپنی وغیرہ کا بہت بڑا حصہ ھے۔ سوویت یونین کو اس بات پر فخر ھے کہ اس نے اپنے کلاسیکی ورثے کے قیمتی نگینوں کی حفاظت کی ھے۔ چائیکوفسکی، کلا ژونوف اور منکوس جیسے عظیم موسیقاروں کے شہپاروں کو استعمال کیا جاتا رہا ھے۔ اس ملک کے کثیرالقومیتی کلچر نے ساری دنیا میں بیلے آرٹ کی ترقی کو بہت متاثر کیا ھے اور اب بھی کر رھا ھے۔ اس حقیقت کا ایک ثبوت تو یہ ھی ھے کہ سوویت بیلے رقص کی کمپنیاں اور بیلے رقاص بیرونی ملکوں کے کامیاب دورے کرتے رھے ھیں۔ اس کے ساتھ ھی یہ حقیقت بھی اھمیت رکھتی ھے کہ سوویت استادوں اور ماھرین رقص کی مدد سے مختلف ملکوں میں بیلے کے قومی اسکول قائم ھوئے ھیں تاکہ مقامی باشندے اپنے ذوق کے مطابق اس فن میں دلچسپی لے سکیں۔ اس مقصد کے لئے تقریباً سارے ممالک کے رقص کے استاد تربیت حاصل کرنے سوویت یونین میں آتے رھتے ھیں۔ اس وقت ملک بھر میں چالیس اوپیرا اور بیلے تھیٹر، انیس بیلے اسکول اور شوقیہ آرٹ کمپنیوں میں حصہ لینے والے فن کار بڑی تعداد میں موجود ھیں۔ اسی لئے

ماسکو قدرتی طور پر بیلے رقص کے بین الاقوامی مقابلوں کا روایتی مرکز بن گیا ھے۔ ان موقعوں پر محض مختلف ممالک کے نوجوان بیلے رقاصوں کا باھمی مقابلہ ھی نہیں ھوتا بلکہ ان سے دوستانہ تعلقات بھی وسیع ھوتے ھیں۔ نیز دنیا بھر کی رقص کی تہذیب کے نئے رجحانات سے واقفیت بھی حاصل ھوتی ھے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اس طرح فطری صلاحیت رکھنے والے نئے نئے رقاصوں سے ملنے کا موقع ملتا ھے۔ چنانچہ رقص و موسیقی کے پاکستانی طائفے بھی اکثر سوویت یونین آتے رھتے ھیں کیونکہ وھی مقاصد ان کے بھی پیش نظر ھوتے ھیں۔ اگر اس موقع پر کوئی پاکستانی طائفہ ماسکو میں اپنے فن کا مظاھرہ کرتا ھوتا تو میں بڑے فخر و انبساط کے ساتھ شریک محفل ھوتا اور مس مارگریٹا سے کہتا کہ دیکھ لو ھم بھی کسی سے پیچھے نہیں ھیں۔

بالشوئی تھیٹر کے چیف کوریوگرافر لینن انعام یافتہ اور سوویت یونین کے عوامی آرٹسٹ یوری گری گوروِوچ ھیں جو پچھلے سال بیلے مقابلے کے وقت جیوری کے سربراہ بھی تھے۔ آج وہ تھیٹر میں موجود نہیں تھے اور اگر ھوتے بھی تو میں اس فن کے بارے میں ان سے تبادل خیال کس طرح کرتا جبکہ میں اس فن لطیف سے واقف نہیں ھوں۔ غرض یہ کہ جب ھم دونوں بالشوئی تھیٹر میں داخل ھونے لگے تو دو اشخاص نے قریب آکر پوچھا: ”کیا آپ انگریزی جانتے ھیں؟“ اندازہ یہ ھوا کہ یہ دونوں عرب نژاد ھیں۔ ان کو بڑی کوشش کے باوجود بالشوئی تھیٹر کے ٹکٹ نہیں مل رھے تھے۔ میں نے مس مارگریٹا سے اردو میں بات کر کے انگریزی میں ان عربوں کو سمجھایا کہ ٹکٹ ملنے کی اب واحد صورت یہ ھے کہ کل دن کو

منیجر سے ملا جائے۔ وہ غیر ملکیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ٹکٹ کا انتظام کردینگے۔ میں نے ان کو جگہ بھی بتادی کہ کس جگہ جانا ہوگا۔

اب میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح محترمہ سولووی اووا کو ٹیلیفون کیا جائے تا کہ وہ کل صبح دس بجے کا کوئی پروگرام نہ بنائیں۔ بالشوئی تھیٹر کے نگران اعلا اتفاق سے اس وقت باہر نکلے تھے۔ میری سفید ٹھنڈی شیروانی ان کے لئے وجہ دلچسپی تھی۔ ان سے اپنا مقصد بیان کیا گیا تو انہوں نے اپنے کمرے سے فون کرنے کی اجازت دیدی۔ چلئے اپنی اس شیروانی کا کچھ تو فائدہ پہنچ ھی گیا !

میں بیلے وغیرہ کے باب میں اپنی بد ذوقی کا اعتراف پہلے ھی کر چکا ہوں۔ تاھم آج میں نے زندگی میں پہلی بار اس کھیل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مس مارگریٹا نے کہانی کا پس منظر سمجھایا۔ میں نے اس کو اپنے ذھن میں رکھ کر اس بے آواز یا بے مکالمہ ڈرامے کو سمجھنے کی کوشش کی اور جب سمجھ میں آگیا تو واقعی بہت ھی لطف آیا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ روسی بیلے ساری دنیا میں شہرت رکھتا ھے، میں نے اس خیال سے بھی اس کے رموز و نکات کو سمجھا تا کہ کہیں کسی محفل میں نا اھل ثابت نہ ھوسکوں۔ آج کے بیلے کا موضوع تھا ''انگارا''۔ یہ سائبیریا میں ایک دریا کا نام ھے۔ اس کو روسی زبان میں لکھا جائے تو اس طرح لکھنا ھوگا : "AHГAPA" ۔ روسی زبان میں بہت سے لاطینی حروف جوں کے توں لکھے جاتے ھیں لیکن ان کا تلفظ مختلف ہوتا ھے۔ اب اسی لفظ کو لیجئے ۔ H حرف لاطینی میں ''ح'' کی آواز دیتا ھے اور

روسی میں ''ن'' کی۔ P حرف لاطینی میں ''پ'' کی آواز دیتا ھے اور روسی میں ''ر'' کی۔ وغیرہ وغیرہ۔

آج کے بیلے کی کہانی اس طرح شروع ہوتی ھے کہ دو بھائی ایک ھی لڑکی پر عاشق ھوجاتے ھیں۔ لڑکی ان دونوں کے درمیان فرق و امتیاز نہیں کرسکتی۔ اس طرح تینوں کردار عجیب کشمکش میں گرفتار ھوجاتے ھیں۔ کوئی فیصلہ کرنا ان میں سے کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔ بیلے کے رقص و سرود نے اس جذباتی مد و جزر کو ابھارنے کی سعی کی ھے۔ ہال کی تیز روشنی میں کبھی کبھی چکا چوند سی پیدا ہوتی تھی۔ اسلئے بعض اوقات منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ تاھم اندر داخل ہوتے وقت جہاں کوٹ جمع کرائے گئے تھے، ایک دوربین کرائے پر لے لی گئی تھی۔ اس کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا کہ کرداروں کے چہروں پر طاری ہونے والے جذبات کا مطالعہ بھی کیا جاسکا جو یقیناً دلچسپ ثابت ہوا۔

بالشوئی تھیٹر بڑی آب و تاب کی جگہ ھے۔ بڑی پرشکوہ عمارت ھے۔ اس کی ھر چیز قدیم ھے۔ قدامت کی پوری شان و شوکت ھر چیز سے عیاں ھے۔ مگر ھر شے زرق برق ھے۔ بس پردے نئے انداز کے ھیں اور وہ اس لئے ضروری ھیں کہ اب پردوں کو روسی انقلاب کا آئینہ دار ہونا چاہئے تھا۔

بیلے ڈانس کے علاوہ ناچ کی ایک اور قسم روس کی سرزمین کے لئے مخصوص ھے۔ اسے ہوپک رقص کہتے ھیں۔ یوں تو اس کا مظاھرہ سوویت یونین میں ھر جگہ ممکن ھے لیکن یوکرائن کے لئے اس کی خصوصیت روایتی حیثیت رکھتی ھے۔ آپ کو مشکل ھی سے کوئی یوکرائنی ایسا ملیگا جسے ہوپک رقص پسند نہ ہو اور جس

نے اپنی جوانی کے دنوں میں خود ہوپک رقص نہ کیا ہو ۔ اکثر اوقات بڑے بوڑھے بھی شریک رقص نظر آتے ہیں ۔ اس لئے کہ اس کے بغیر مسرت و شادمانی کی کوئی محفل ممکن نہیں سمجھی جاتی ۔ شام کے اجتماعات میں، شادی کی تقریبات میں، عوامی تہواروں میں، شہروں اور دیہات میں، کلبوں سے لے کر شہر کے چوراہوں تک پر اور پارکوں میں، ہر جگہ نوجوان اس سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں ۔ پہلے ایک یا دو آدمی آہستہ سے لوگوں کے حلقے میں داخل ہوتے ہیں اور بینڈ یا اکارڈین کی دھن پر اپنا پسندیدہ ہوپک رقص کرنے لگتے ہیں ۔ جلدی ہی تیسرا اور چوتھا شخص ان میں شامل ہوجاتا ہے اور آپ کو پتہ بھی چلنے نہیں پاتا کہ سارے تماشائی خود بھی عملی طور پر رقص میں شامل ہیں ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی بے حد مقبولیت کا راز کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ عوام کے کردار اور ان کے مزاج کی واضح عکاسی کرتا ہے ۔ ان کی خوش مزاجی، قوت و ہنر مندی، ان کی مستعدی اور حوصلے کی بھی عکاسی کرتا ہے ۔ ان کی اس صلاحیت کی عکاسی کرتا ہے کہ جس جوش و خروش سے وہ اپنے پیشے کے مطابق کام کرتے ہیں، اسی جوش و خروش کے ساتھ خوشی بھی مناتے ہیں ۔ ہمارے ملک میں پٹھانوں کا جو کھٹک ناچ ہے، اس سے یہ بڑی حد تک ملتا جلتا ہے ۔ بہت گھن گرج کے ساتھ ہر شخص ناچ میں مصروف رہتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ ہوپک کی تاریخ کا تعلق ماضیٔ بعید سے ہے ۔ اس رقص نے ژاپوروژے سیچ میں جنم لیا جہاں آزاد کوسک رہا کرتے تھے ۔

یہ بہادر اور زندہ دل لوگ تھے جنہیں اپنی آزادی سب سے زیادہ عزیز تھی ۔ شروع میں یہ ناچ صرف مردوں کیلئے مخصوص تھا ۔ وہ علاقہ اب ماضیٔ بعید کا حصہ بن چکا ہے لیکن ہوپک باقی رہ گیا ہے اور اس کی مقبولیت عام ہو گئی ہے ۔ یہ اسٹیج پر بھی پیش کیا جانے لگا اور فلموں میں بھی عکاسی ہونے لگی ۔ یوکرائن میں شوقیہ رقاصوں کے صدہا طائفے اور بیسیوں پیشہ ور طائفے اس رقص کو پیش کرتے ہیں ۔ لیکن یہ غیر متنازعہ حقیقت ہے کہ پیشہ ور اور شوقیہ دونوں ہی قسم کے طائفوں میں مثالی ہوپک ریاستی اعزاز یافتہ طائفہ ہی پیش کرتا ہے جو سوویت یونین کے عوامی فنکار پاویل ورسکی کی رہنمائی میں کام کرتا ہے ۔ اس با صلاحیت طائفے کا پیش کردہ رقص فن کے ایک حقیقی نمونے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

میرے ایک واقف کار کو جو واقف فن بھی ہیں، اس مشہور و معروف ناچ کو ایک بار دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ ایک ناقابل بیان اور پر مسرت نظارہ تھا ۔ اسٹیج پر رنگوں کا ایک طوفان برپا تھا ۔ لڑکیاں دائرے کی شکل میں گھوم رہی تھیں اور ان کے لباس میں ٹنکے ہوئے رنگ برنگے فیتے آپس میں مل کر ایک حلقہ بنارہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک زندہ دھنک آسمان سے نیچے اتر آئی ہے ۔ نوجوان مرد گویا ہوا میں تیر رہے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کے پیر زمین کو چھو ہی نہ رہے ہوں ۔ جنون کی یہ کیفیت بڑھتی ہی گئی ۔ پھر جب موسیقی کی تان ٹوٹی اور رقاص ایک لمحے کے لئے ساکت ہوئے تو چار ہزار تماشائی فرد واحد کی طرح اپنی

نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تالیوں کے ایک طوفان نے سارے ہال کو ہلا کر رکھ دیا ۔ اس موقعہ پر میرے واقف کار کے کہنے کے مطابق کئی افریقی طالب علم نیز اوسٹریلیا ، پولینڈ اور دوسرے ممالک کے سیاح بھی موجود تھے ۔ ان سب کو رقص و سرود کے ایک والہانا جذبے نے مسحور کر دیا تھا ۔

پاویل ورسکی کا طائفہ نسبتاً نیا ہے یعنی اس کی عمر صرف بیس سال ہے لیکن اس کی شہرت صرف سوویت یونین تک ھی محدود نہیں ہے ۔ اس کے رقاص دنیا کے بہت سے ملکوں میں ، جہاں وہ اپنے فن کا مظاهرہ کرچکے ہیں ، کافی مشہور ہیں ۔ ان کے غیر ملکی دورے، جن میں ہر سال اضافہ ہورہا ہے ، نہایت کامیاب سمجھے جاتے ہیں ۔ اس کامیابی کا راز صرف اس طائفے کی غیر معمولی مہارت ھی میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس امر میں بھی پوشیدہ ہے کہ پاویل ورسکی اور ان کے طائفے کے اراکین اس عوامی رقص کے فن کو احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھ رہے ہیں ۔ ان تمام لوگوں کو ، جوطائفے کے پیش کردہ ہوپک رقص کی تشکیل کرتے ہیں ، ورسکی نے قومی تہواروں اور میلوں کے موقعوں پر یا شوقیہ مظاهرۂ فن کے دوران منتخب کیا اور پھر خود تربیت دے کر انہیں بہتر بنا لیا کہ وہ دنیا بھر میں نام پیدا کرسکیں ۔

دنیا کے اور بہت سے ملکوں کی طرح سوویت یونین میں نئے سال کا آغاز یکم جنوری سے ہوتا ہے ۔ وہ ایک ایسی تقریب کا دن ہوتا ہے جو گہرے خلوص اور پر مسرت جدت کی فضا سے سر شار ہوتی ہے ۔ لیکن بہت سی باتیں مغربی ملکوں کے رواج سے مختلف ہوتی ہیں ۔ تاہم وہ ایک چیز سے ہم آہنگ ہوتی ہیں ۔ وہ

ہیں رقص کی محفلیں جو ہر جگہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ برپا ہوتی ہیں ۔ نئے سال کا رقص ان لوگوں کے لئے جشن فتح ہوتا ہے جو جوان اور قوت حیات سے بھر پور ہوتے ہیں اور جن کی خوش بختی زمانے کی تلخی سے نا آشنا ہوتی ہے ۔ والز رقص کی زمزمہ آمیز حرکات ناچنے والوں اور دیکھنے والوں کو عجائبات کی دنیا کا سفر کراتی ہیں ۔ ایک ایسا سفر جو خواب میں نہیں ، حقیقت میں ہوتا ہے ۔ روس میں نئے سال کے رقص (بال) کی روایت زار روس پیٹر اول (۱۶۷۲ء تا ۱۷۲۵ء) کے زمانے سے شروع ہوئی تھی جس نے قبائلی ناچوں کا جنہیں وہ نا پسند کرتا تھا ، خاتمہ کر کے شریف خاندانوں میں یورپی روایات کو سختی کے ساتھ فروغ دیا تھا ۔ رفتہ رفتہ بال رقص نے نو جوان امراء کے دل جیت لئے ۔ عظیم روسی ادیب تا لستائی نے اپنے ناول ''جنگ اور امن،، میں سینٹ پیٹرز برگ کے ایک رئیس کے محل میں منعقد ہونے والے نئے سال کے جشن کی شاندار تصویر کھینچی ہے جس میں مشہور رقاصہ نوجوان نتاشا روستووا نے شرکت کی تھی ۔ آج کل کے روسی نوجوان بھی محفل رقص کی اس ہیروئن کے شیدائی نظر آتے ہیں ۔ جو رقص اس نے پیش کیا تھا ، وہ آج بھی تمام نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں مقبول ہے ۔ کریملن کے کانگریس ہال میں اس کا سب سے بڑا مظاهرہ ہوتا ہے ۔

رقص کے مختلف پہلوؤں پر بہت زیادہ غور کرتے ہوئے مجھے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے وابستہ ایک جواں فکر شاعر جناب قمر ہاشمی کی نظم یاد آگئی جو انہوں نے لینن کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں لکھی تھی ۔ اس کا عنوان تھا '' سوویت عوام

کا رقص طرب،، چونکه بے بحر کی نظمیں مجھے بہت کم یاد رهتی هیں، اس لئے اس کے صرف آخری تین مصرعے حافظے کی لوح پر بر قرار رہ گئے :

اٹھاؤ ساغر که زندگی آج رقص میں ہے،
زمین انگڑائی لے رهی ہے،
یه کائنات رقص میں ہے ۔

بالشوئی تھیٹر میں رات پونے دس بجے بیلے رقص ختم هوا ۔ هم دونوں باهر نکلے تو غضب کی ٹھنڈی هوائیں چل رهی تھیں ۔ ممکن ہے مس مارگریٹا کو زیادہ سردی نه لگی هو کیونکه وہ جوان هیں اور اسی سرزمین کی رهنے والی هیں لیکن میں کسی قدر کپکپا گیا ۔ یه غنیمت تھا که میں اپنا اوورکوٹ ساتھ لے آیا تھا، ورنه قلفی جم جاتی ۔ ٹیکسی کی تلاش تھی که اتنے میں قریب هی سے ،، السلام علیکم ،، نے همیں خاصه چونکا دیا ۔ میں نے مڑکر دیکھا تو ایک صورت جانی پہچانی تھی اور دو صورتیں ایسی تھیں که جن کو دیکھ کر میرا تو خون خشک هوگیا ۔ میں سمجھا که اس سرد رات اور ویران سڑک پر هم دونوں دهر لئے گئے ۔ مدافعت کے لئے غدہ هائے فوق الکلیه اپنی رطوبت خون میں چھوڑنے لگے مگر کسی مقابلے کی نوبت نه آئی ۔ یاد آگیا ۔ ان صاحب کو کنگرس عالمی تاریخ سائنس، ایڈنبرا ، اسکاٹ لینڈ ، میں دیکھا تھا ۔ خود انهوں نے اپنا تعارف کرانے میں دیر نه کی ۔ شیک هینڈ هوا اور پھر اسماعیل جرجانی پر تبادل خیال شروع هوگیا ۔ میرے پروگرام میں به ظاهر تاشقند شامل نهیں ہے ۔ اسماعیل جرجانی کا مخطوطه وهاں کے لئے ہے ۔ اسماعیل جرجانی پر میرا مقاله ایڈنبرا

میں پیش هوا تھا ۔ اس لئے یه صاحب مجھے پہچان کر اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے ۔ برفیلی هواؤں میں آدھ گھنٹے سڑک کے کنارے باتیں هوتی رهیں ۔ بالآخر ایک ٹیکسی روک لی گئی اور میں مس مارگریٹا کے ساتھ هوٹل یوکرائن آ گیا ۔ انهوں نے قریب هی اپنی ایک دوست کے گھر قیام کرنے کا فیصله کرلیا تھا ۔ میں نے هوٹل پر اترنے کے بعد اسی ٹیکسی میں ان کو بھیج دیا ، ورنه وہ پیدل جانے کا ارادہ کررهی تھیں جو مجھے کسی عنوان گوارا نه تھا ۔ رات کا وقت ، موسم سرد اور پھر ٹھنڈی هوائیں ، وہ جرأت و بهادری کا مظاهرہ کرنے کی عادی سهی، لیکن میں مطمئن نهیں تھا ۔ وہ اپنے اقدامات کی ذمه دار تھیں لیکن مجھے بھی اپنی ذمهداری کا احساس تھا ۔ یه غنیمت ہے که انهوں نے میرا مشورہ قبول کرلیا ۔

میں نے کمرے میں پهنچ کر شب خوابی کا لباس پہنا یعنی ته بند باندھا اور بستر پر دراز هو گیا ۔ بستر اس قسم کا تو نهیں تھا جس پر میں اپنے وطن میں سونے کا عادی هوں ۔ لیکن چونکه خلاف معمول تھک گیا تھا، اس لئے لیٹتے هی نیند آ گئی اور یه غنیمت ہے که کوئی خواب بھی نظر نهیں آیا ۔ دماغ مکمل طور پر پر سکون تھا ۔

معمولات سے قطع نظر

ان دنوں خاصی بے فکری تھی ۔ نه تو یه فکر دامن گیر تھی که بس صبح چار بجے اٹھ جانا ہے اور نه یه فکر سوار که کاغذات دیکھنے هیں، هر ایک پر اپنی رائے یا احکامات

لکھنے ھیں اور فائل درست کرنے ھیں ۔ نہ ھمدرد صحت کے مضامین کو جانچ پڑتال کے بعد قابل اشاعت بنانا تھا ۔ مطب جانے، کسی سے ملاقات کرنے یا دفتر جانے کا بھی سوال نہیں تھا ۔ اپنے معمولات کا نقشہ تو وطن ھی میں رہ گیا تھا ۔ ماسکو میں مصروفیات اپنی مرضی پر منحصر تھیں ۔ اگر مصروفیات پیدا نہ کروں تو ذرا بھی فکر نہ ہو۔بالکل آزاد تھا۔ایسی آزادی مجھے بہت کم میسر آتی ھے ۔ اس لئے ان تین دنوں کو ایک غیر معمولی نعمت سمجھنے لگا تھا ۔ چنانچہ سوکر ذرا دیر سے اٹھا ۔ طلوع و غروب آفتاب کا کوئی اندازہ نہیں ھوتا اور نہ کوئی بتانے والا تھا ۔ کوشش کی مگر ناکامی ھوئی ۔ نماز فجر قضا ھوگئی۔ اللہ کا نام لے کر مصلا بچھا لیا ۔ رخ نہ جانے کس جانب تھا ۔ کعبہ شریف کی سمت تو مسجد میں جا کر ھی معلوم ھو سکتی تھی اور وہ یہاں سے دور تھی ۔ اس بار قبلہ نما بھی ساتھ نہیں تھا ۔ ایسی غلطی میں کم کرتا ھوں ۔ میرے سامان سفر میں قبلہ نما لازماً رکھا جاتا ھے ۔ لیکن اس بار روانگی بڑی روا روی میں ھوئی ۔ میری بیٹی سعدیہ بھی جو میری ضروریات کو سمجھتی اور ان کا خیال رکھتی ھے، اس دفعہ بھول گئیں ۔ میری دوا حیاتین ج رہ گئی اور ناک کھولنے کی دوا بھی ساتھ نہیں تھی ۔ حال آں کہ یہ میری بڑی ضرورت کی چیز ھے ۔ جب سے کانوں میں تکلیف ھوئی ھے، میرے معالج کی سخت ھدایت ھے کہ سفر میں جہاز اڑتے وقت اور اترتے وقت ناک بند نہیں ھونی چاھئے ۔ تشخیص یہ ھوئی تھی کہ اصل تکلیف ناک میں ھے اور اس نے کان کو نقصان پہنچایا ھے ۔ سات سال تک اس ھدایت پر عمل کرتا رھا ھوں اور صرف اس سفر میں کوتاھی ھوگئی ۔ خیر، اللہ مالک ھے ۔

جراحت قلبی

آج کا پروگرام میرے لئے بےحد دلچسپ اور مفید مطلب تھا ۔ انجمن مصنفین کے شعبۂ روابطہ غیر ملکی کی نگراں محترمہ مریم سلگانک لے وو نا سے میں نے کہا تھا کہ میں ھارٹ سر جری (جراحت قلبی) دیکھنا چاھتا ھوں ۔ انھوں نے واقعی بڑی توجہ کی اور میرے لئے پروگرام بنا دیا ۔ انجمن نے موٹر بھجوائی مگر وہ وقت پر ھوٹل نہیں پہنچی ۔ اس لئے ہم نے خود ٹیکسی کرلی تاھم وقت مقررہ پر ساڑھے نو بجے وھاں نہ پہنچ سکے ۔ سرجن صاحب میرا انتظار کر کے سرجری میں چلے گئے ۔ تاھم ان سے کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم کر ھی لیا ۔ مگر مجھے بڑی شرمندگی ھوئی ۔ حالانکہ انھوں نے سب حال معلوم کر کے اعتراف کرلیا تھا کہ اس ضمن میں کوتاھی میری طرف سے نہیں ھوئی ۔ در اصل شرمندگی کے ساتھ ساتھ مجھے مایوسی بھی تھی ۔

ماسکو میں یہ انسٹی ٹیوٹ آف ھارٹ سرجری مرحوم باکولیف نے قائم کیا تھا ۔ عمارت کے باھران کا مجسمہ بھی لگا ھوا ھے ۔ اس وقت اس ادارے کے ڈائرکٹر اکیڈیمیشین ولادیمیر ایوانوویچ بورا کوفسکی ھیں ۔ ان سے شرف ملاقات حاصل ھوا ۔ وہ بڑے لحیم شحیم انسان ھیں ۔ قد بھی ساڑھے چھے فیٹ سے کم نہیں ھوگا ۔ مستند ماھر امراض قلب ھیں اور روس میں ان کی بڑی شہرت ھے ۔ ان سے ملاقات بڑی سر سری ھوئی ۔ وہ مریضوں کے معائنے میں مصروف تھے اور پھر ان سے وقت بھی مقرر نہیں ھوا تھا ۔

اصل ملاقات جارجیا کے ھارٹ سرجن جناب بکیریا صاحب

سے تھی - ان کو پا لیا - ایک نرس نے ان تک رہنمائی کر دی - یہ انسٹی ٹیوٹ پانچ عمارتوں پر مشتمل ہے - ہم ایک عمارت سے دوسری عمارت تک گئے - ماحول زیادہ صاف نہیں تھا - سڑک اور گلی کے کناروں پر رات کو گری ہوئی برف اب پگھل رہی تھی - صبح ہی سرکاری ملازمین نے اس کو سمیٹ کر کناروں سے لگا دیا تھا تا کہ وہ پگھلتی رہے - لیکن اس سے کیچڑ پیدا ہو گئی تھی - خیر ہم دامن بچاتے ہوئے بکیریا صاحب کے پاس پہنچ گئے - وہ ہمارے منتظر ہی تھے - ان سے تعارف کرایا گیا - بکیریا صاحب اس ادارے کے نائب نگران اعلاہیں اور ان کو جراحت قلب میں مہارت تامہ حاصل ہے - انہوں نے چیمبر سرجری کا طریقہ اختیار کیا ہے - میں اس کی ابتدائی تفصیل بیان نہیں کر سکتا - چونکہ مریض کا ہارٹ اوپن کیا جا چکا تھا اور بکیریا صاحب کو وہاں جانے سے روکنا مناسب نہیں تھا، اس لئے تفاصیل ان سے معلوم نہ کر سکا - تاہم انہوں نے جرمن زبان میں چھپا ہوا اس موضوع پر اپنا ایک مقالہ میرے مطالعے کے لئے مجھے دیدیا - بکیریا صاحب نے مجھے مخصوص لباس پہنا دیا جو اپریشن کے وقت ہمیشہ پہنا جاتا ہے - موزے پہن لئے اور ٹوپی بھی اوڑھ لی - اب میں ان کے ساتھ اپریشن تھیٹر میں گیا - یہاں میں نے دیکھا کہ ایک گول چیمبر بنا ہوا ہے - وہ آہنی ہے - بس ورٹیکل بائلر کی شکل ہے - اپریشن کے وقت اس چیمبر میں بے اندازہ اوکسیجن گیس ہوتی ہے - اس لئے یہاں بجلی کا کوئی دخل نہیں ہے کہ اس سے آگ پکڑنے کا خطرہ رہتا ہے - اس چیمبر کے لئے ہر چیز باہر ہے - یہ تمام انتظام بکیریا صاحب نے مجھے دکھایا اور سمجھا دیا - چیمبر کے

اندر بس بجلی کا چاقو ہوتا ہے کہ جس سے مقام قلب اور خود قلب چیرا جاتا ہے - انہوں نے بتایا کہ اس چیمبر میں اگر کبھی اکیڈیمیشین بورا کوفسکی آجاتے ہیں تو وہ بیٹھ کر ہی کام کرتے ہیں - میں بکیریا صاحب کے ساتھ کوئی پون گھنٹہ رہا اور جراحت قلب کو دیکھ لیا اور سمجھ لیا - دل بہت متاثر ہوا - آج مریض ایک نوجوان بچہ تھا -

مجھے یاد آیا کہ اس سے قبل میں نے ۱۹۷۳ء میں ہیوسٹن (امریکا) میں اوپن ہارٹ سرجری دیکھی تھی - تقریباً دو گھنٹے میں نے وہاں صرف کئے تھے - میں نے بکیریا صاحب سے اس کا ذکر کیا - انہوں نے کہا کہ ہماری اس انسٹی ٹیوٹ میں بہت زیادہ تجدد آپ نہیں پائیں گے - یہاں موڈرن آلات بھی نہیں ہیں - تاہم ہم بڑی کامیابی کے ساتھ اب تک ایک سو ساٹھ اپریشن کر چکے ہیں اور ہمارا چیمبر میتھڈ خوب ہے - میں نے بکیریا صاحب کے طریق کار کی تعریف کی - یقیناً وہ اس کے مستحق تھے - میں نے برسبیل تذکرہ ان سے پوچھا : ”کیا آپ نے پاکستان کا کبھی دورہ کیا ہے ؟“ ان کا جواب نفی میں تھا - البتہ وہ روس سے باہر انگلستان اور امریکا میں رہ چکے تھے - انگریزی خوب اچھی بولتے ہیں مگر جرمن زبان پر زیادہ عبور حاصل ہے - ممکن ہے کہ انہوں نے مہارت جراحت جرمنی میں حاصل کی ہو - میں نے ان سے کہا : ”کیوں نہ آپ پاکستان آئیں اور جراحت قلب کے موضوع پر لیکچرز دیں اور ممکن ہو تو کوئی اپریشن بھی کر دکھائیں - میں آپ کے لئے اپنے ملک میں یہ انتظام کر سکتا ہوں“ ؟ - میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے اس بات کو پسند کیا ہے اور ان کے

دل میں پاکستان آنے کی خواہش ہے ۔ انھوں نے فرمایا ؟ ‘‘ آپ ہماری وزارت صحت کی معرفت دعوت دیں ۔ میں ضرور پاکستان آؤنگا ’’ ۔

ان سے رخصت ہوتے وقت میرے ذہن نے کام کیا اور مجھے یاد آیا کہ عالمی ادارہ صحت نے ایک تقابلی جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ سوویت یونین کے بچے دنیا بھر میں سب سے زیادہ تندرست ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں بچوں کی سرجری کے سوویت ماہرین کافی تعریف کے مستحق ہیں ۔ آج سوویت یونین کے ہر بڑے شہر میں یا تو ایک علیحدہ سرجیکل کلینک ہے ، یا پھر ہر ہسپتال میں اس شعبے کا ایک وارڈ ہے ۔ بچوں کی سرجری کے دائرے میں ‘‘ دولت سکی اسکول ’’ اعلا ترین ادارہ ہے ۔ عالمی ادارہ صحت نے بطور مثال اپنے ماہنامے میں ایک اپریشن کا بھی ذکر کیا تھا ۔ بچی کا نام ماشا تھا ۔ اسے زچہ خانے سے سیدھا کلینک لایا گیا تھا ، کیونکہ اس میں بہت سے پیدائشی نقائص موجود تھے ۔ ایک نقص یہ تھا کہ اس کی غذا کی نالی بند تھی ۔ زچہ خانے کے ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپریشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن کلینک میں موجود پروفیسر استالن لاف دولت سکی نے اپریشن کیا جبکہ ڈاکٹر اولگا پولیا کووا نے اس بچی کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے چھے ماہ تک جد و جہد کی ۔

دولت سکی صرف خود ہی ایک اعلا پائے کے سرجن نہیں ہیں ، بلکہ وہ بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے علم سے دوسروں کو بھی مستفید کرتے ہیں اور کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے ۔ وہ تخلیقی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی عزت کرتے ہیں ۔ دوسری طرف

نوجوان ڈاکٹر اپنے سرپرست سے علم حاصل کرتے وقت اپنی اعلا صلاحیت اور استعداد کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں ۔ یہی وہ چیز ہے جس نے دولت سکی اسکول کو جنم دیا تھا جس میں اب ممتاز سرجنوں کی ایک بڑی ٹیم کام کرتی ہے ۔

جب بارہ سالہ لوسیارودزےوچ یہاں آتی ہے تو ڈاکٹر اسے ہمیشہ کی طرح دیکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں ۔ لوسیا اس کلینک میں اور سرجری سوسائٹی کے جلسوں میں گرما گرم گفتگو کا موضوع رہ چکی ہے ۔ ایک سال پہلے ڈاکٹر والیری اکوپیان اور ان کی ٹیم نے اس بے جگر لڑکی کا آپریشن کیا تھا ۔ اس کے بچنے کے امکانات بہت ہی کم تھے ۔ لیکن خدا کی عنایت اور سرجنوں کی صلاحیت نے اسے نئی زندگی عطا کی تھی ۔ جگر کی تکالیف اور خون کی متعلقہ رگوں کے نقائص کا علاج آج بھی ایک غیر حل شدہ سرجیکل مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ والیری اکوپیان ، جو دولت سکی اسکول کے ذہین نمائندوں میں سے ایک ہیں ، اس قسم کے کیسوں سے بچوں کی سرجری کے کلینک کے حالات میں نمٹتے ہیں ۔ انھوں نے بعض نادر قسم کے اپریشن بڑی کامیابی کے ساتھ کئے ہیں ۔ ان کی عمر زیادہ نہیں ہے تاہم وہ جگر کے بعض پیچیدہ کیسوں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں ۔ انھوں نے بعض ایسے خطرناک اپریشن بھی کئے ہیں جن کی تکمیل میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے ۔ وہ ہر چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ۔ انھی کے ایک ساتھی الیکسی اوف چلی کوف پہلی مرتبہ بچوں کی سرجری کے وارڈ میں اس وقت آئے کہ جب وہ طالب علم تھے ۔ اب سے دس سال پہلے بھی وہ کلینک کے طالب علموں کے سرجری

گروپ کے صدر تھے۔ لیکن اب نوجوان سرجن طالب علموں کو پھیپھڑوں کی سرجری کا درس دیتے اور اپریشن کر کے دکھاتے ہیں۔ طب میں امیدوار کی ڈگری حاصل کرنے والے بہت سے طالب علم اپنے تیس سالہ استاد کے مقابلے میں بسا اوقات زیادہ عمر کے بھی ہوتے ہیں مگر عمر کے اس تفاوت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کلینک میں علاج اسی وقت سے شروع کردیا جاتا ہے کہ جب مرض پورے طور سے ظاہر ہونے بھی نہیں پاتا۔ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ مرض کو مزید بڑھنے سے روک دیا جائے۔ بڑے بچوں، حتیٰ کہ بالغوں میں بھی بہت سی بیماریاں قطعاً پیدا نہیں ہونگی بشرطیکہ ان چیزوں کا فوراً ہی علاج کردیا جائے جو عہد طفلی میں پہلی نظر میں معمولی اور غیر مضرت رساں معلوم ہوتی ہیں۔ بلاشبہ جتنے جلدی علاج ہوجائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا ہے، ویسے ویسے اس کا متاثرہ جسم اپنے نقائص کے مطابق ڈھلتا جاتا ہے اور اپریشن کے بعد اسے پھر نئی صورت حال کا عادی ہونا پڑتا ہے۔ سرجن کے لئے بہترین حکمت عملی یہی ہے کہ وہ فوراً یعنی بچے کے پیدا ہوتے ہی اپنا کام شروع کردے۔ مذکورہ بالا کلینک کے سرجن اب زیادہ سے زیادہ اپریشن کر رہے ہیں۔ اپریشن ایک خصوصی وارڈ میں ان بچوں کے کئے جاتے ہیں، جنھیں زچہ خانوں سے سیدھا یہاں لایا جاتا ہے۔ یہاں طریقہ یہ ہے کہ اپریشن کی میز کو گرم رکھا جاتا ہے اور گرم پانی کی بوتلیں چادروں کے نیچے ترتیب سے لگائی جاتی ہیں تاکہ جسم کی قدرتی حرارت اور خون کی ایک ایک بوند کو بچایا جاسکے۔ ایک بالغ شخص کے جسم سے زیادہ خون کا ضائع ہوجانا زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے لیکن

ایک نوزائیدہ بچے کے معاملے میں خون کا ایک ایک قطرہ قیمتی ہوتا ہے۔ اپریشن کرتے وقت سرجن بچے کے جسم میں اس توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے جو کہ بیماری سے پہلے جسم میں موجود تھا۔ دولت سکی اسکول انسانی زندگی کی حفاظت کرتا ہے اور اگر زندگی کے بچنے کا خفیف ترین امکان بھی موجود ہو تو اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

امراض قلب کے سلسلے میں یہ بات میرے علم میں آئی تو حیرت ہوئی کہ سوویت یونین کے سرجن مصنوعی دل بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں کامیابی کی امید ہے۔ بعض آلات کے ذریعہ سے دل کو حرکت میں رکھنا تو ممکن ہوچکا ہے مگر یہ بات کہ اصل دل نکال کر مصنوعی دل لگا دیا جائے، عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے، آپ نے دل میں درد محسوس کیا، ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے بتایا کہ آپ کا دل بیکار ہوچکا ہے، اسے فوراً بدل دینا چاہئے۔ آپ کیمسٹ کی دکان پر گئے اور اپنے دل کا سائز بتاکر مصنوعی دل خرید لیا۔ آپ کے سینے سے پرانا دل نکال کر نیا فٹ کردیا اور آپ بھلے چنگے ہوگئے۔

اس صدی کی ساتویں دھائی کے وسط میں جب ڈاکٹر کرسچین برنارڈ نے دل کی منتقلی کا سنسنی خیز کام شروع بھی نہیں کیا تھا، سوویت یونین کے اکیڈیمیشین بورس پترووسکی کی راھنمائی میں والیری شوماکوف نے ایک مشین کا دل ایجاد کرنے کے سلسلے میں سرگرم تحقیقاتی کام شروع کردیا تھا۔ آج وہ اعضا اور عضلات کی منتقلی کے ادارے کے سربراہ ہیں۔ یہ ادارہ کئی طبی تنظیموں اور صنعتی اداروں سے تعاون کرتا ہے۔ شروع میں یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا

که مصنوعی دل کس چیز سے بنایا جائے۔ ظاہر ہے که اسے بڑا پائیدار بلکه سرجنوں کی زبان میں گھسنے ٹوٹنے سے محفوظ ہونا چاہئے۔ اس لئے که دل پر کام کا سب سے بڑا بوجھ پڑتا ہے۔ سارے جسم میں خون پمپ کرنے کے لئے اسے ایک منٹ میں ساٹھ تا اسی مرتبه سکڑنا اور پھیلنا پڑتا ہے، گویا ایک سال میں کوئی چار کروڑ مرتبه۔ اس کے پائیدار، مضبوط اور قابل اعتماد ہونے کے علاوہ یه خیال بھی رکھنا پڑتا ہے که جس چیز سے بنایا جائے، اسے انسانی جسم قبول بھی کرلے یعنی جن عضلات سے یه مس ہو، ان میں سوزش وغیرہ پیدا نه ہوسکے اور اس کی اندرونی سطح پر خون جمنے نه پائے۔ خون کی خصوصیت یه ہے که رگ سے باہر نکلتے ہی یه بڑی تیزی کے ساتھ جم جاتا ہے۔ اگر خون میں یه خوبی نه ہوتی تو ہمارے جسم میں معمولی سوئی کے چبھتے ہی خون کا فوارہ نکلنے لگتا اور بند نه ہوتا۔ یه پہلو بھی مصنوعی دل کے موجدوں کے لئے ایک اہم مسئله بن گیا تھا۔ اس ایجاد کے سلسلے میں ڈاکٹر، ریاضی داں، کیمیاداں اور ماہرین طبیعیات نے مل جل کر کام کیا۔ طویل عرصے اور انتھک محنت کے بعد وہ مطلوبه دل بنانے میں کامیاب ہو گئے جو لمبائی، چوڑائی، وزن اور بناوٹ کے لحاظ سے قدرتی دل جیسا تھا۔ اسے شفاف پلاسٹک سے تیار کیا گیا تھا۔ اندر کی ساری رگیں اور نسیں اوپر ہی سے نظر آتی ہیں۔ ان رگوں اور نسوں کے سرے پر والو بھی ہیں جو پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ایک آزمائشی اسٹینڈ پر تنصیب شده ہر دل کو کئی مہینے مسلسل دھڑکتا رکھاجاتا ہے تاکه اس میں کوئی خامی یا نقص ہو تو علم ہوجائے۔ میں نے اس ضمن میں کئی مریضوں کی کیس ہسٹری کا

مطالعه کیا اور حقیقتاً حیران رہ گیا اور دل ہی دل میں ان محققین و موجدین کی کامیابی پر داد دیتا رہا۔

دل کو ٹھیک طرح چلانے والا برقی آله (پیس میکر) ایک مرتبه لگانے کے بعد دو ڈھائی سال چلتا رہتا ہے۔ پھر اس کی ننھی سی بیٹری ڈاؤن ہوجاتی ہے۔ چنانچه دوبارہ اپریشن کر کے اسے تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ یه دشواری فی‌الحال باقی ہے۔ تاہم ایک سرجن نے مزید تجربات کے بعد ایک اور آله ایجاد کیا ہے جو ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ ان کی کوشش سے ریڈیو آئی سوٹوپ کے اصولوں پر کام کرنے والے آلے میں برقی قوت پلوٹینم ۲۳۸ کے ذریعه سے پیدا کی جاتی ہے۔ پلوٹینم کے ریڈیائی اثرات سے گرمی پیدا کی جاتی ہے جسے ایک تھرمو ایلیمنٹ کے ذریعه سے برقی توانائی میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ یه ننھاسا ایٹمی بجلی گھر تقریباً پندرہ برس تک چل سکتا ہے۔ لیکن سوویت سائنسداں اس پر بھی قناعت نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اس آلے کو اسقدر ترقی دینا چاہتے ہیں که اس کا عمل ہمیشگی اختیار کرلے۔ توقع ہے که ایک نه ایک دن انھیں کامیابی ہوگی۔ انھی سائنسدانوں کا خیال ہے که پلاسٹک کے مصنوعی دل کو مزید ترقی دے کر اس لائق بنایا جائیگا که آج سے سینکڑوں ہزاروں سال پہلے فوت شده انسانوں میں، جن کی حنوط شده لاشیں عجائب گھروں میں محفوظ ہیں، مصنوعی دل لگا کر اور ایٹمی قوت سے ان میں خون کی روانی بحال کر کے زندہ کرلیا جائیگا۔ لیکن اس کامیابی کے لئے ایک طویل عرصه درکار ہے۔ شاید اس صدی کے ختم ہونے تک یه منصوبه مکمل نه ہوسکے۔

دراصل سوویت یونین میں علاج معالجے کے بہت سے منصوبوں

کو اس لئے پائے تکمیل تک پہنچنے کا موقع ملتا ھے کہ وھاں طبی اداروں اور بیماریوں کی روک تھام کرنے والے مرکزوں کو خاطر خواہ سرکاری اعانت حاصل ھوتی ھے۔ وہ محض اپنی ھی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے بلکہ حکومت کی امداد پر بھی بھروسہ کرتے ھیں۔ اس کا ایک خاص سبب بھی ھے۔ علاج کی سہولتیں شہروں اور دیہاتوں تک یکساں طور پر وسیع ھیں اور اس لئے دائرۂ عمل وسیع تر ھے۔ چنانچہ بہت بڑی آبادی کو تندرست رکھنے کے لئے ھر وقت غور و خوض سے کام لیا جاتا اور بہتری کے نت نئے طریقے سوچے جاتے ھیں۔ پھر یہ نہیں کہ دیہات کے کم ترقی یافتہ لوگوں کے لئے علاج کی سہولتیں برائے نام ھوں۔ وھاں ھر دیہی ھسپتال میں ھر قسم کے سازو سامان سے لیس لیبارٹریاں موجود ھیں جہاں فوری طور پر ضروری تجزیہ کیا جاتا ھے۔ اپریشن کے کمرے ھر جگہ ھیں۔ نیز کشادہ اور آرام دہ وارڈ ھیں۔ ایکسرے اور الیکٹرو کارڈیوگراف کی مشینیں تک ھر جگہ گاؤں میں رکھی گئی ھیں تاکہ کہیں دور جانا نہ پڑے۔ دیہات میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار عملہ ھر وقت متعین رہتا ھے، پھر بھی شہر کے زیادہ بڑے فنی ماھرین ان علاقوں کا وقتاً فوقتاً دورہ کرتے اور مفید مشورہ دیتے رہتے ھیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف ھارٹ سرجری سے نکل کر میں بھاگ دوڑ کر کے ساڑھے گیارہ بجے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز پہنچ گیا۔ یہاں آج کانفرنس میں شامل ھونے والے مندوبین کو گیارہ بجے جمع ھونا تھا۔ میں آیا تو پتہ چلا کہ حاضری بہت کم ھے تاھم ملاقات اور تعارف کا سلسلہ جاری ھے۔ میں بھی ادب کے ساتھ اندر داخل ھوگیا اور اندر آ کر گم ھوگیا۔ مجھے اچانک ایک دیرینہ کرم فرما

بابا جان غفوروف کا خیال آ گیا۔ روس کے اس عظیم ادارے کے وہ ڈائرکٹر تھے۔ گزشتہ بار جب میں ۱۹۷۵ء میں یہاں آیا تھا تو میرا زبردست استقبال کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ جب امیر خسرو کی بین الاقوامی کنگرس کے سلسلے میں اختتامیہ جلسہ یہاں ھوا تو بابا جان مرحوم نے مجھے اسٹیج پر اپنے قریب بلا لیا تھا اور اس وقت میں واحد مندوب اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا اور اس سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ میں نے اس جلسے میں حسب خواھش بابا جان اختتامی تقریر کی تھی۔ انھوں نے بڑے موزوں الفاظ میں حاضرین سے میرا تعارف بھی کرایا تھا۔

آج کا یہ اجتماع بس ملاقات اور باھمی تعارف کے لئے مخصوص تھا اور اس لئے بھی تھا کہ صدرالدین عینی کے بارے میں کچھ معلومات مندوبین کو فراھم کر دی جائیں۔ ایک بزرگ جن کا نام معلوم نہ ھو سکا، خود کو عینی کا شاگرد بتا رہے تھے۔ کہتے تھے اگرچہ میں خود روسی ھوں تاھم تاجیکستان کے صدرالدین عینی کی عظمت کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں ھے۔

مجھے سوا بارہ بجے یہاں سے اٹھنا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی مترجم مس مارگریٹا پاؤلونا کو اٹھایا۔ وہ باھر چلی گئیں۔ میں نے چند منٹ ٹھیرنے کا فیصلہ کیا۔ شکر ھے کہ تقریر ختم ھوئی اور مجھے ایک گستاخی سے نجات مل گئی۔ میں بھی اٹھ گیا۔

ھندستان کے تین مندوبین شرکت کے لئے آئے تھے۔ جناب ڈاکٹر جعفری صاحب اور ان کی اھلیہ سلطانہ جعفری اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ۔ یہ تینوں اس جگہ موجود تھے۔ مگر میرے آداب کو انھوں نے نظر انداز کر دیا۔ مجھے اندازہ ھوا کہ جعفری

صاحب اور عصمت چغتائی صاحبہ کو یقین نہ آتا تھا کہ میں یہاں کیسے ہوں۔

ادارۂ علوم شرقیہ

علوم شرقیہ کے مطالعہ سے متعلق یہ ادارہ بہت عرصے سے قائم ہے اور اس کے زیر ایوان تمام مشرقی ممالک کے ادبی ورثوں کا مطالعہ اور تجزیہ بڑے پیمانے پر کیا جاتا رہا ہے۔ ادارے سے وابستہ کام کرنے والوں میں مورخین، فلسفی، ادیب، شاعر اور نقاد سبھی شامل کئے جاتے ہیں۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے، علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات پاکستان کے علاوہ کئی ملکوں میں منائی گئیں۔ ان میں روس بھی پیش پیش رہا۔ اس وقت سے پہلے بھی عظیم پاکستانی شاعر اور مفکر کی تخلیقات سوویت یونین میں بہت مقبول رہی ہیں۔ اس حقیقت کا بین ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں اقبال کی نظمیں روسی، ازبکی، تاجیکی، تاتاری اور دوسری زبانوں میں تقریباً تیس بار شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تخلیقات ماسکو، تاشقند، دوشنبہ اور کازان میں کتابی صورت میں اور ممتاز اخبارات و رسائل کے صفحات پر بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کارخیر میں مستند مترجمین اور ممتاز شعرا نے حصہ لیا جن میں سرگئی سیورت سیف، شیم یون لپکن، اورم اور میر شاکر شامل ہیں۔ یہ سب علوم شرقیہ کے ادارے سے وابستہ ہیں۔ ایک اور سوویت ماہر علوم شرقیہ نے پاکستانی عوام کی آزادی اور خودمختاری کے حصول کی جنگ میں اور نو آبادیاتی ظلم و تشدد کے خاتمے میں اقبال کے خصوصی کردار کے مطالعہ پر توجہ دی ہے۔ علوم شرقیہ کے سوویت ماہر نکولائی آئی کیئف نے اپنی متعدد کتابوں میں ان

کی تخلیقات میں انسان دوستی کے رجحانات اور فلسفیانہ ورثے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی کتاب ۱۹۰۹ء میں "محمد اقبال، ممتاز مفکر اور شاعر" کے عنوان سے کافی تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ آنی کیئف نے اقبال کے فلسفے میں فرد کے مسئلے اور ان کے معاشرتی و سیاسی رجحانات کے تجزیے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ عبداللہ غفاروف اورس اور کاردرووا نے بھی انہی موضوعات کے مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ لیودمیلا پولونسکایا کی کتاب "پاک و ہند کی عوامی فکر میں مسلمانوں کے رجحانات" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بیشتر حصے میں اقبال کے فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نکولائی گلیبوف، نتالیا پریگورنیا، الیکسی سوفو چئیف، غضنفر الیئف، میر شاکر اور علوم شرقیہ کے دوسرے ماہرین نے اقبال کی شاعری اور ان کی عظیم تخلیقی صلاحیتوں کی ترقی اور ارتقا کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ماسکو سے شائع ہونے والی کتاب "جنوبی ایشیا میں فارسی زبان کے ادب کی تاریخ" اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہونے والی "اردو ادب کی تاریخ" میں بھی اقبال، غالب، حالی، نذیر احمد اور راشدالخیری کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۲ء کی ایک کتاب میں نئی نسل کے نوجوان پاکستانی دانشوروں کے حالات زندگی اور تخلیقات پر مقالے لکھے گئے ہیں۔ روسی انسائیکلوپیڈیا اور حوالہ جات کی دوسری کتابوں میں بھی پاکستانی ادیبوں اور شاعروں پر کافی مواد موجود ہے۔ "بانگ درا" کا مکمل ترجمہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں "پیام مشرق"، "ضرب کلیم" اور "جاوید نامہ" کی مشہور نظموں کے ترجمے کئے گئے اور کتابی صورت میں شائع کئے گئے۔

سوویت بچے بھی پاکستانی ادب کی چاشنی سے محروم نہیں رہے ۔ یہاں کی بہت سی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے ان کے لئے بھی کرائے گئے جن کے مصور ایڈیشن ہر شہر میں دستیاب ہیں ۔

پروفیسر عثمانوف

مطالعہ* علوم شرقیہ (اورینٹل اسٹڈیز) کا شعبہ اکیڈمی آف سائنسز کے ماتحت ہے اور اس سے وابستہ پروفیسر عثمانوف صاحب بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے ۔ وہ صرف اپنے فرائض منصبی ہی ادا نہیں کرتے بلکہ اس کام میں خاص دلچسپی بھی لیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ذاتی دلچسپی کے بغیر کوئی کام سلیقے کے ساتھ انجام نہیں پاتا ۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی کہ جب میں امیر خسرو دہلوی کے جشن میں شرکت کے لئے ماسکو آیا تھا اور جمیل الدین عالی صاحب بھی میرے ساتھ تھے ۔ اس دوران قیام میں ایک روز ترجمان نے مجھے بتایا کہ آج دوپہر کو پروفیسر عثمانوف صاحب کے گھر پر میری دعوت ہے ۔ وہ خود تشریف لائے تھے ۔ مجھسے ملاقات نہ ہوسکی تو پیغام چھوڑ گئے تھے ۔ چنانچہ میں اپنے مترجم اور عالی صاحب کو ساتھ لے کر چل پڑا ۔ ان کا گھر جو حکومت کے تعمیر کردہ ایک فلیٹ میں تھا ، زیادہ دور نہیں تھا ۔ ان کا فلیٹ اور اس کا انداز دیکھکر مجھے استنبول کے پروفیسر قراحان کا گھر یاد آگیا ۔ دونوں میں بڑی ہی مماثلت تھی ۔ مکان سے اندازہ ہوا کہ روس میں پروفیسروں کا مقام واقعی بہت بلند ہے ۔ وہ بڑے اطمینان سے رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کی لائبریری میں مختلف ممالک میں چھپے ہوئے قران شریف جمع تھے ۔ احادیث کی تمام معروف کتابیں

موجود تھیں ۔ عربی و فارسی ادبیات پر بے اندازہ اچھی کتابیں بھی نظر آئیں ۔ اپنے مطالعے کے جس کمرے میں وہ بیٹھکر اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں، وہاں جائنماز بھی رکھی تھی ۔ اسطرح ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں اندازہ لگانے کا موقع مل گیا ۔

پروفیسر عثمانوف صاحب کی اہلیہ کا نام خدیجہ ہے ۔ محترمہ نے بہت ہی پر تکلف کھانے تیار کئے تھے ۔ مجھے خلاف معمول دوپہر کے اس کھانے میں شرکت کرنی پڑی ۔ میری کوشش یہ رہی کہ زیادہ میٹھی اشیا سے شغل کروں ، ورنہ ہضم کا نظام خراب ہو جاتا جبکہ گوشت کھانے سے میں نے اجتناب کیا ۔ اس موقع پر عالی صاحب نے فرمایا :

''حکیم صاحب کو تامل اس لئے ہے کہ یہ ذبیحہ ہے یا نہیں''۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں تھی ۔ وہ کوئی ہوٹل نہیں، ایک اچھے راسخ العقیدہ مسلمان کا گھر تھا۔ یہ بات زبان پر لانی نہیں چاہئے تھی ۔ میں نے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے تردید کا اظہار کیا اور فوراً گوشت کھانا شروع کردیا۔ تاکہ عالی صاحب کے جملے کی تردید ہوسکے اور میزبان کو تکلیف نہ ہو ۔ میں نے محسوس کیا کہ پروفیسر صاحب اور محترمہ خدیجہ صاحبہ کو ایک گونہ اطمینان ہوا اور وہ عالی صاحب کے ریمارک کو محض مزاح سمجھ کر مسکرا کر رہ گئے ۔

کھانے کے بعد پروفیسر عثمانوف صاحب نے ایک لمبی جا نماز بچھادی تھی جس پر کئی اشخاص بیک وقت نماز پڑھ سکتے تھے ۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں امامت کروں ۔ مقتدی

وھی ایک تھے - نماز سے فارغ ھوکر میں اپنے میزبان سے علمی باتیں کرتا رھا اور وعدہ کیا کہ میں پاکستان جاکر ان کے ذوق کے مطابق بہت سی کتابیں سفارت خانے کی معرفت بھیجونگا - دوران گفتگو معلوم ھوا کہ انھوں نے ''شاھنامہ' فردوسی،، کی چار جلدیں روسی زبان میں مرتب کی ھیں - میں نے کہا کہ میں ''شاھنامہ' اسلام،، کی ایک جلد آپ کو بھیجونگا - انھیں علوم شرقیہ سے خاص دلچسپی تھی -

علوم شرقیہ کے سوویت ماھرین کی کاوشیں ادب وشعر تک محدود نہیں رھیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع رھا - تاریخ کے بارے میں ایک ممتاز کتاب ''پاکستان کے تین آئین'' قابل ذکر ھے - اسے میرے عزیز دوست پروفیسر سی - گونکوفسکی اور و، موسکا لینکو نے مشترکہ طور پر مرتب کیا ھے۔ اس میں پاکستان کی آئینی تاریخ کا جائزہ لیتے ھوئے دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی بحث کی گئی ھے۔ اس کا دیباچہ میخائیل کاپتسا نے تحریر کیا ھے جو کئی سال تک پاکستان میں سوویت یونین کے سفیر رہ چکے ھیں۔ وہ سفیر بننے سے پہلے اور اس کے بعد بھی علوم شرقیہ کے ادارے کے سرگرم رکن رھے ھیں۔ سوویت مستشرق' مقیم ژانو وا نے، جو پاکستان کی خارجہ پالیسی پر اپنے تحقیقی مقالوں کے سبب مشہور ھیں' 'پاکستان' جنوبی ایشیا اور امریکی پالیسی، کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ۱۹۶۰ء کے بعد پاکستانی امریکی تعلقات کے بارے میں اھم مسائل کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ھے جسکے بعض حصے غور طلب بلکہ متنازعہ فیہ بھی ھوسکتے ھیں۔ جب بھی ضرورت پڑی ھے، سوویت مستشرقین نے پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کے

دانشوروں سے رابطے قائم کئے اور ان کی اعانت کا اعتراف کیا ھے -

بالکل حال کی بات ھے کہ پاکستان کے بارے میں مضامین کے دو مجموعے شائع ھوئے ھیں، جو ان سوویت صحافیوں نے لکھے ھیں جن کو ادارہ' مذکور نے پاکستان میں قیام کے لئے بطور خاص بھیجا تھا - ایک مجموعے کا نام ''ستروان سمت الراس'' ھے جسے و، نا کاریا کوف نے مرتب کیا ھے۔ دوسرے کا نام ''ماضی سے بغاوت'' ھے جو ا، فلیپوف کے روزنامچوں اور سفر نامے پر مشتمل ھے - اس ضمن میں مستشرق خواتین نے بھی حصہ لیا ھے - مثال کے طور پر پاکستانی خواتین کی تنظیم اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں صبیحہ مافامووا کی ایک کتاب حال ھی میں شائع ھوئی ھے -

مستشرقین کے علاوہ اور مصنفین کے نام بھی لئے جاسکتے ھیں جو ادارے سے وابستہ نہ سہی لیکن قابل قدر خدمات انجام دیتے رھے ھیں۔ مثلاً لیود میلا آرستووا کی لکھی ھوئی کتاب ''پاکستان کا فنیاتی ذیلی ڈھانچہ'' یا تاجیکستان کے نوجوان اسکالر تاخور جباروف کی کتاب ''صوبہ سرحد کی معیشت'' قابل ذکر اضافے ھیں -

روسی نیشنل کمیشن برائے یونیسکو

مذکورہ بالا دونوں اداروں میں حاضری دینے کے بعد مادام سولووی اووا صاحبہ نے میرے لئے آج کا جو پروگرام بنایا تھا ، اس میں نیشنل کمیشن برائے یونیسکو ، روس میں جانا شامل تھا - یہ بھی میرے مزاج کے عین مطابق تھا - پاکستان کے نیشنل کمیشن برائے یونیسکو سے اپنے تعلق کی بنا پر، نیز کورئر کے اردو ایڈیشن ''پیامی،، کے مدیر کی حیثیت سے اور یونیسکو کی سرگرمیوں سے دلچسپی

کی وجہ سے مجھے اس کمیشن کے دفتر میں آنا ھی چاھئے تھا ۔ چنانچہ وھاں پہنچ گیا ۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ اس عمارت کا قدیم نام معلوم ھوجائے جس میں دفتر قائم تھا مگر اس کا صحیح علم کسی کونہیں تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ اس عمارت کی تاریخی اھمیت یہ ھے کہ جب فرانس کے نپولین بونا پارٹ نے روس پر حملہ کر کے ماسکو پر قبضہ کیا تو وہ اس عمارت میں عارضی طور پر قیام پذیر ھوگیا تھا ۔ اس وقت عمارت کا وھی کمرہ نیشنل کمیشن کے سکریٹری جنرل جناب نکولاس ای مر نوف صاحب کا کمرہ ھے ۔ نپولین کی وہ خواب گاہ تھا ۔ اس اعتبار سے میں آج ایک تاریخی عمارت اور ایک تاریخی کمرے میں تھا ۔ اگر روسی جنرل کوتوزوف اپنی شکست تسلیم کر کے ماسکو نپولین کے حوالے نہ کرتے تو نپولین یہاں کیسے آتا اور سوتا ۔ کوتوزوف نے ماسکو نپولین کے حوالے کر دینے کا فیصلہ جب ایک جھونپڑی میں بیٹھ کر کیا تھا تو کوئی بھی جنرل اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا ۔ بلکہ وہ کوتوزوف کو پاگل قرار دے رھے تھے ۔ تا ھم حالات نے ثابت کر دیا کہ کوتوزوف نے ماسکو نپولین کے حوالے کرکے اس کو سخت مشکل میں ڈال دیا تھا ۔ جب سردی نے زور پکڑا ، برف باری نے راھوں اور گزرگاھوں کو بند کردیا اور اکل و شرب کی فراھمی مسدود بلکہ ناممکن ھوگئی تو نپولین کو لوٹ جانا پڑا اور جب اس کی فوج اس کے زیر کمان واپس ھو رھی تھی تو کوتوزوف نے اسے جا لیا اور بڑی دردناک اور عبرت انگیز شکست دی ۔ ماسکو روسی فوج کو واپس مل گیا۔ نپولین نے اس مہم میں صرف اتنا کیا کہ اس کمرے میں سوکر

اسے تاریخی بنا گیا ۔ عمارت کی تاریخی حیثیت معلوم نہ ھو تب بھی یہ حقیقت ایک تاریخی اھمیت رکھتی ھے ۔

نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کی عمارت پر زبردست پہرہ لگا ھوا تھا ۔ یہ روز کا معمول تھا ۔ اس سرکاری عمارت پر پہرے کا انداز یہی ھے ۔ میں نے ٹھیک بارہ بجے وھاں قدم رکھا ۔ میرے پہنچنے سے پہلے مادام سولووی اووا دروازے پر میرے استقبال کے لئے موجود تھیں ۔ اس ادارے میں ان کی حیثیت ایک نائب کی ھے۔ نکولاس ای سرنوف ان کے ''باس،، ھیں ۔ تعارف کے بعد ھم تینوں ایک گول میز پر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے تبادل خیال ھوا ۔ مرنوف صاحب نے روس کے نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کے خط و خال کے بارے میں بتایا ۔ اندازہ ھوا کہ اس کے بورڈ میں مصنفین روس کی انجمن کے، پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اور اکیڈمی آف سائنسز کے نمائندگان یعنی کل بیالیس ارکان شامل ھیں اور اس اعتبار سے یہ بڑا اھم نیشنل کمیشن ھے ۔ اس کا اپنا چھاپے خانہ ھے ۔ مجموعی طور پر اس کمیشن سے ایک ھزار افراد متعلق ھیں اور یونیسکو کے تعاون سے بڑے اھم کام ھو رھے ھیں ۔ میں نے جملہ تفاصیل کو کان کھول کر غور سے مگر بڑی حیرت کے ساتھ سنا ۔ پھر مجھے خیال آیا کہ پاکستان میں نیشنل کمیشن برائے یونیسکو اس لحاظ سے کس درجہ خوابیدہ ھے ۔ میں سوچتا ھوں کہ میری بھاگ دوڑ سے اس میں جو بھی جان آئی ھے ، ھنوز نہ ھونے کے برابر ھے ۔ اسے مزید روح افزائی کی ضرورت ھے ۔ میں نے مرنوف صاحب کو بتایا کہ اب پاکستان کا نیشنل کمیشن برائے یونیسکو متحرک ھے ۔ اس کے بورڈ پر اب وائس چانسلرز ، اکیڈمی آف سائنس اور سائنس فاؤنڈیشن

کے اہم لوگ متعین ہیں ۔ بہ ایں ہمہ یہ ہمارا نیشنل کمیشن کس درجہ غیر فعال ہے ۔ اس کا حال لکھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔

میں نے مرنوف کو ان تین پروجیکٹس کے بارے میں بتایا کہ جو اس وقت ہمارے زیرغور ہیں اور ان پر عمل ہونے والا ہے ۔ وہ یہ ہیں :

(۱) ہسٹری آف سویلائزیشن ان سنٹرل ایشیا ۔

(۲) انٹر نیشنل کنگرس، ہسٹری اینڈ فلاسفی آف سائنس ۔

(۳) انٹر نیشنل چلڈرن کلچرل فیئر ۔

اول الذکر کے بارے میں مرنوف صاحب بخوبی آگاہ تھے ۔ میں نے ان کو بتایا کہ میری حسب خواہش دوشنبہ کی میٹنگ میں یہ طے پایا ہے کہ اگلی مشاورتی میٹنگ پاکستان میں منعقد ہوگی ۔ یونیسکو اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے اشتراک عمل سے یہ کام اسی سال ہوگا ۔ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے بارے میں بھی میں نے اختصار کے ساتھ بتایا ۔ بلا شبہ یہ تینوں پروجیکٹس بڑے اہم ہیں ۔ مرنوف صاحب نے بھی ان کی اہمیت کو محسوس کیا اور اچھی طرح سراہا ۔

ریستوراں پراگ میں جناب مرنوف نے لنچ کا انتظام میرے اعزاز میں کیا تھا ۔ وہ ان کے دفتر سے قریب تر ہے ۔ ہم تینوں ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ۔ اچھا ریستوراں ہے مگر یہاں دودھ نہیں ملتا۔ میں نے آج مناسب خیال نہ کیا کہ میں اپنا ناشتہ الگ طلب کروں ۔ بس فیصلہ کیا کہ آج پورا لنچ لے لینا چاہیئے ۔ چنانچہ ایسا ہی کرلیا گیا ۔ کھانا اچھا تھا ۔ لیکن میں عادی نہیں تھا ۔ بس دل کڑا کر کے نوش کرلیا مگر انجام وہی

ہوا جس کی توقع تھی ۔ طبیعت بھاری ہوگئی اور کسل نے گھیر لیا ۔ غنیمت ہے کہ اس کے بعد کوئی علمی پروگرام طے نہیں تھا ، ورنہ اس میں شرکت مشکل ہوجاتی ۔ میرا تو یہ حال تھا کہ جیسے چوھے کو پارا پلا دیا گیا ہو ۔کھانے پر مرنوف صاحب اور مادام بلبل سے خوب باتیں ہوئیں۔ ان سے پتہ چلا کہ مادام اولگا رودمیل، نائب مدیر اعلا، کورئر گزشتہ دنوں ماسکو میں تھیں ۔ ان سے یہ بھی معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مدیر اعلا رینے کالوز کی صحت اچھی نہیں رہتی اور وہ شاید بر بنائے خرابیٔ صحت اس سال کے آخر تک مستعفی ہوجائیں ۔ رینے کالوز بہت نفیس انسان ہیں ۔ کاش میں ان کے قریب ہوتا اور اپنی طبی استعداد کو بروئے کار لا کر ان کے کام آتا ۔ ڈاکٹر کافلر صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد یہ خطرہ تھا کہ اب کافلر جیسا انسان نہ آسکے مگر رینے کالوز نے ان کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا ۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔ بہت اچھا ہو اگر مادام اولگا رودمیل ان کی جگہ مقرر ہوجائیں ۔ شاید ایسا ہی ہوگا ۔

مندوبین کے اعزاز میں

آج ہی دو بجے کے قریب انجمن مصنفین روس کی جانب سے انھی کی عمارت میں ایک اجتماع کی اطلاع ملی تھی ۔ یہ صدر الدین عینی کے جشن صہ سالہ کے مندوبین کے اعزاز میں ہونا تھا ۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی علمی ادبی تقریب ہوگی مگر معلوم ہوا کہ محض لنچ کا اہتمام تھا ۔ خیر، میں اس میں برائے نام شریک ہوگیا اور یہ دیکھتا رہا کہ مختلف ملک و مزاج کے لوگ کس طرح لذت کام و دہن حاصل کرتے ہیں ۔ جناب فیض

احمد فیض بھی دھلی سے آچکے تھے - افغانستان کے رحیم صاحب اور ترکی کے مندوب بھی موجود تھے - مجموعی طور پر غیر روسی مندو بین کی تعداد سات یا آٹھ تھی - باقی ماسکو کے باشندے تھے جن کا تعلق فارسی زبان سے تھا - ان سمیت کل تعداد پچیس یا چھبیس تھی - دوسرے روز اسی گروپ کو دوشنبہ (تاجیکستان) روانہ ہونا تھا - میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی علمی اجتماع نہیں ھے - محض ایک جشن ھے اور لوگ کھانے پینے کے زیادہ شائق ھیں - ان کی شرکت سے اجتماع کو ایک جشن کی حیثیت اور شان حاصل ہوگئی تھی - ایران سے کوئی نمائندگی نہیں تھی - یہ لنچ بہت بے تکلف تھا - ھر لحاظ سے بے تکلفی پائی جاتی تھی - شراب و کباب کا دور تھا اور سوائے میرے سب ھی ''خوش ذوق،، تھے اور خوب داد عیش دے رہے تھے - خواتین کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بھی شراب و کباب میں دل و جان سے شریک تھیں اور مردوں سے بازی لے جانے کی کوشش کررھی تھیں - محاورے کے مطابق سب مچھلی کی طرح پی رہے تھے -

میں نے اس وقت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ میں اس اجتماع میں کس درجہ ''ان فٹ،، ہوں بلکہ ''مس فٹ،، ہوں - اندازہ ہوا کہ دوشنبہ پہنچ کر ھی میری یہ وحشت دور ہوگی - وھاں اھل علم ملینگے - خصوصاً پیارے دوست محمد عاصموف صاحب جن کا مقام بڑا علمی ھے اور جو بہت ھی سنجیدہ و متین انسان ھیں، اپنی معیت سے لطف پہنچائیں گے - ان کے رفیق اور میرے دوست مرزا یوف صاحب تو اللہ کو پیارے ہوگئے - وہ پاکستان آکر میرے مہمان رہے تھے -

شام کے ٹھیک پانچ بجے پروفیسر گونکوفسکی صاحب تشریف لے آئے - روس کی یہ بڑی اہم شخصیت ھیں، اور ان کو مطالعۂ پاکستان میں درجۂ تخصص حاصل ھے - پاکستان پر ایک آتھریٹی کی حیثیت سے وہ کئی کتابیں لکھ چکے ھیں - مجھے ذاتی طور پر ان کے انداز فکر سے اتفاق نہیں ھے - میرا تاثر یہ ھے کہ یہ آج بھی موجودہ آدھے پاکستان کو چار قومیتیں قرار دیتے ھیں اور ان کی رائے میں ان کو چار ملک بن جانا چاھئے - ان کو پاکستان کا ھمدرد قرار دینا مشکل ھے - البیرونی کنگرس میں بابا جان غفوروف شرکت کرنے والے تھے - انھی کو دعوت دی گئی تھی - مگر آگئے گونکوفسکی صاحب - مجھے اس موقع پر ان سے پہلی بار تعارف حاصل ہوا تھا - میں نے ان سے دوستی کا فیصلہ کیا اور میں نے ان سے قریب ہوکر ھمیشہ کوشش کی کہ وہ پاکستان کے بارے میں اپنے نقطۂ فکر میں تبدیلی پیدا کردیں - میرا موقف یہ تھا کہ یہ کوشش اس کے مقابلے میں صحیح تر ھے کہ گونکوفسکی کو غیر ھمدرد بنائے رکھا جائے اور اس طرح ان کی پاکستان کے مفاد سے عدم دل چسپی میں اضافہ کیا جائے - میں نے اسی مقصد عظیم کے تحت ان سے دوستی کی اور میں اس دوستی کو نبھاتا رھا - اسی دوستی کا اثر و نتیجہ ھے کہ وہ آج ماسکو میں مجھسے ملنے آگئے، حالانکہ یہاں اپنے ملک میں ان کا مقام بہت بلند ھے اور لوگ ان کو ایک اہم انسان جانتے ھیں اور حقیقتاً وہ ھیں بھی بہت بلند - پاکستان کیلئے نہ سہی، اپنے ملک کے مفاد کیلئے ان کی خدمات قابل تعریف سمجھی جاتی ھیں - جب لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ مجھ سے ملنے آرھے ھیں تو سب کو حیرت ہوئی اور

پھروہ جس گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ملے وہ اور بھی حیرت انگیز بات تھی - ۱۹۵۷ء میں جب میں ماسکو آیا تھا تو میں نے ڈائری میں حسب ذیل تاثرات لکھے تھے :

''بابا جان غفوروف صاحب تاجیکستانی ہیں، روسی نہیں ہیں - میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ پروفیسر گونکوفسکی ان سے قریب نہیں ہیں - شاید بابا جان کی جگہ ان کو لینی ہے اور یہ اس کیلئے خواہاں نظر آتے ہیں - اگر انسٹیٹوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کا منشاء متعین ہے تو اس جگہ کی صدارت کے لئے غیر روسی ہی ہونا چاہئے - گونکوفسکی صاحب کا میری رائے میں کوئی چانس نہیں ہے - لیکن چونکہ گونکوفسکی صاحب مستشرق کی حیثیت سے بھی ابھر رہے ہیں، اس لئے کم امکان موجود ہے کہ وہ ان کی جگہ لینگے لیکن میرے نزدیک پروفیسر محمد عاصموف صاحب سے بہتر کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوسکتا - بابا جان غفوروف صاحب کی صحت جواب دے رہی ہے - ان کے گردوں میں ضعف ہے - اب ان کی اہلیہ بھی علیل ہوکر ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوچکی ہیں - بابا جان کی ایک ہی لڑکی ہے جو ان کے پاس نہیں ہے - اب گھر پر یہ تنہا ہیں - میں نے بڑی کوشش کی کہ میں ان کے گھر پر حاضر ہوجاؤں مگر انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا -

آج پروفیسر گونکوفسکی کے ساتھ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر سرگے بھی آئے تھے - گذشتہ بار میرے یہاں آنے پر طالب علم سرگے میرے لئے ترجمانی کے فرائض انجام دینے پر مامور کئے گئے تھے - اب تین سال میں وہ فارغ التحصیل ہوکر ڈاکٹر ہوگئے تھے - ان کی

ایک کتاب اقتصادیات پاکستان پر شائع ہوئی ہے - انہوں نے اپنے ایک خط کے ساتھ ایک جلد مجھے پاکستان بھجوائی تھی اور مجھے اطلاع دی تھی کہ اب میں ڈاکٹر ہوگیا ہوں - انہوں نے اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کیا ہے - میں نے ان کو فوراً مبارک باد بھیجی تھی - اندازہ یہ ہے کہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ یعنی تھیسس یہی کتاب ہے - میں نے پروفیسر گونکوفسکی صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ ڈاکٹر سرگے کو وہ ایک ڈیڑھ ماہ کیلئے پاکستان بھجوادیں تاکہ پاکستان کی اقتصادیات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا ان کو موقع مل جائے اور وہ اپنی کتاب کے اگلے ایڈیشن میں مناسب رد و بدل کرلیں - میری رائے سے انہوں نے اتفاق کیا اور شکریہ بھی ادا کیا - لیکن خود مجھ ہی سے درخواست کی کہ میں ایک باقاعدہ خط لکھدوں - میں نے مشورہ دیا کہ اس مقصد کیلئے اسی سال دسمبر کا یا اگلے سال جنوری کا مہینہ مناسب رہے گا -

پاکستان کے حالات پر

پروفیسر گونکوفسکی صاحب نے پاکستان کے حالات حاضرہ کے بارے میں سوال کیا - یہ سوال غیر متوقع تھا - انہوں نے کہا کہ وہ تین ماہ کنیڈا رہ کر آئے ہیں - جہاں وہ اسلامک سنٹر کے مہمان تھے - پروفیسر کینٹ ول اسمتھ ان کے میزبان تھے اور پروفیسر چارلس بھی کہ جو آجکل اس کے ڈائرکٹر ہیں - پروفیسر گونکوفسکی صاحب نے بتایا کہ اسمتھ صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے ، اس میں ایک اہم باب ''پاکستان میں اسلام'' پر ہے - یہ کتاب مجھے اب تک نہیں ملی ہے - اسمتھ صاحب پاکستان میں میرے مہمان رہ چکے ہیں اور شام ہمدرد کی تقریب میں لیکچر

بھی دے چکے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں سوال کو میں گھما کر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ان کو جو بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) فوجی انقلاب بر وقت تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خانہ جنگی ہوتی۔

(۲) بھٹو صاحب نے سب سے شدید غلطی یہ کی کہ انہوں نے لوگوں کو بے عزت کرنے کی پالیسی اختیار کی، جو بہر حال غلط تھی۔ میں نے بتایا کہ خود مجھے انہوں نے زبردستی سیاست میں گھسیٹ کر مجھے شکست دلوانے کا انتظام بھی کیا۔ پروفیسر کو اس پر حیرت ہوئی مگر میں نے اس پر پورا زور دیکر یہ حقیقت گونکوفسکی صاحب کے ذہن نشین کرادی ہے۔ وہ گزشتہ مارچ میں میرے انتخابات میں حصہ لینے کے بارے میں خوب واقف تھے۔

(۳) میں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کو ہم بہت اچھا انسان قرار دیتے ہیں اور اس بات کے حامی ہیں کہ قومی حکومت ان کی نگرانی میں قائم ہو جائے اور وہ کم از کم تین چار سال تعمیر پر توجہ دے۔

(۴) میں نے ان کو بتایا کہ بھٹو صاحب نے سیاسی اغراض کے لئے لیبر پالیسی ایسی بنائی ہے کہ اب پوری صنعت ملکی مفلوج ہے اور پروڈکشن آدھی سے بھی کم ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو ماسکو میں

جگہ جگہ آویزاں بورڈوں کا حوالہ دیا جس میں مزدور عہد کرتا ہے کہ میں مصنوعات ملکی میں روسی معیارات بلند کروں گا۔

(۵) پاکستان ساری اقوام و ملل کی دوستی کا خواہاں ہے۔ اقوام و ملل کو بھی پاکستان کا احترام کرنا چاہئے کہ جو بد قسمتی سے نہیں ہے۔

پروفیسر گونکوفسکی کی میں عزت کرتا ہوں اور ان کا احترام بھی دل سے کرتا ہوں۔ میں ان کو پاکستان کا دوست دیکھنا چاہتا ہوں اور ان کے دل میں پاکستان اور اہل پاکستان کی محبت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ ان کو جو محبت اور تعلق میری ذات سے ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ ایسی ہی محبت میرے وطن کے ہر فرد سے کریں۔ پاکستان اور روس کے مابین بہتر تعلقات کی بنیاد خلوص و دوستی کو بننا چاہئے اور سیاست سے گریز کرنا چاہئے۔ سیاسیات حاضرہ انسانوں کو بے مروت اور خود غرض بنا رہی ہے، اور عالمی نزاع پیدا کر رہی ہے۔ میں پاکستان اور روس دوستی کا آرزومند ہوں مگر قطعی طور پر انسانیت اور محبت و خلوص کی بنیادوں پر اور ایسا میری رائے میں ممکن ہے۔

ایک گھنٹے کی یہ ملاقات اچھی رہی۔ میں نے پروفیسر گونکوفسکی صاحب سے کہا کہ اگست ۱۹۷۸ء کی ۲۶ تاریخ کو میں اور سعدیہ اور آپ کی شاگرد مسز ڈی سلوا دو دن کے لئے ماسکو آئیں گے۔ پروفیسر صاحب نے زور دیکر کہا کہ ہم ان کے گھر قیام کریں۔ میں نے شکریہ ادا کردیا ہے اور ڈاکٹر سرگے کے لئے کہ دیا ہے کہ ان کو تیار کردیں۔ یہ میرے ساتھ میرے گھر

قیام کرینگے - میں ان کو اپنے بیٹے کی طرح رکھوں گا - اور چونکہ میرے ہاں بیٹا نہیں ہے ، اس لئے شاید میں ان کو پاکستان میں روک لوں -

نیشنل کمیشن برائے یونیسکو نے آج اہتمام کیا ہے کہ میں روسی شہرۂ آفاق سرکس دیکھوں - کمیشن کی جانب سے جناب انا تونی صاحب آئے تھے - ان کے ساتھ سرکس دیکھنے گیا - سات بجے سے رات پونے دس بجے تک پروگرام تھا - بڑا دلچسپ پروگرام تھا - ۱۹۷۰ء میں بھی میں نے یہاں کا سرکس دیکھا تھا - یہ لوگ ترقی کرتے جارہے ہیں - نئے نئے پروگرام بناتے رہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ جب بھی آؤ ، ہال بھرا ہوا ملیگا اور کبھی خالی نہیں ہوتا - آج میں نے پھر یہ بات نوٹ کی کہ سرکس اور تماشے کے دوران تعمیر وطن کی بات بڑے سلیقے سے آجاتی ہے - سوا دس بجے میں ہوٹل واپس آگیا -

میں نے پروفیسر گونکوفسکی صاحب سے سوال کیا تھا :

”میں ۱۹۷۰ء میں جب آیا تھا تو میں نے ماسکو میں ایک بات شدت کے ساتھ محسوس کی تھی کہ لوگ بڑے سنجیدہ رہتے ہیں - میں چہروں پر مسکراہٹ کو ترس گیا تھا - مگر اب ۱۹۷۸ء میں وہ بات نہیں ہے - لوگ زیادہ خوش نظر آتے ہیں - اس کی کیا وجہ ہے ؟“

انہوں نے بتایا کہ اب حالات بدلتے جارہے ہیں - لوگ اب تعمیری جدوجہد کے بعد خود کو ری لیکس (Relax) محسوس کرتے ہیں - خوش حالی میں اضافہ ہورہا ہے - انہوں نے کہا :

”ذرا ماسکو سے باہر جاکر دیکھئے کہ اب لوگ کیسے

مکانوں میں رہتے ہیں - گزشتہ تین سالوں میں لوگوں کے رہن سہن میں فرق آگیا ہے بلکہ انقلاب آگیا ہے - موجودہ حالات سے لوگ اب زیادہ خوش ہیں “ -

ماسکو سے دوشنبہ

اب موجودہ سفر کی دوسری منزل تک پہنچنا تھا - یعنی ماسکو سے دوشنبہ (تاجیکستان) جانے کا پروگرام تھا - یہ طے ہوگیا تھا کہ تمام مندوبین صبح نوبجے جمع ہوجائیں گے اور پھر سب موٹریں ایک ساتھ روانہ ہونگی تاکہ ایک ہی وقت میں منزل مقصود پر پہنچ سکیں - میں بہر نوع وقت مقررہ پر ہوٹل یوکرائن کے وسیع ہال میں آگیا جہاں واقعتاً ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا ہے - ہزاروں آدمی مختلف پروازوں سے روزانہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں - ہوٹل بہت بڑا ہے - اس کی گیارہ منزلیں ہیں جن میں رہنے کے ہزاروں آراستہ کمرے ہیں - لفٹ صرف چھ لگے ہوئے ہیں - ان میں سے دو تین کام نہیں کرتے - لیکن باقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ذرا انتظار کرنا نہیں پڑتا - سب خود کار ہیں - صرف دو لفٹ گیارھویں یعنی آخری منزل تک جانے کے لئے مخصوص ہیں - باقی بیچ ہی میں رکتے اور پھر نیچے اتر آتے ہیں - ان کو چلانے کے لئے ہوٹل کا اپنا جنریٹر ہے - اس لئے کبھی کسی کے فیل ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا - متبادل انتظام کے طور پر بجلی کی عام لائن سے بھی حسب ضرورت مدد لی جاسکتی ہے - البتہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسے بڑے ہوٹلوں میں نیچے کی پہلی یا دوسری منزل میں قیام کرنا بہتر ہے تاکہ اگر بفرض محال کبھی لفٹ میں جگہ نہ ملے یا وہ چلنے سے معذور ہوں تو سیڑھیوں کو استعمال کیا جاسکتا ہے - بہ صورت اوپر

کی منزل میں پیش آئے تو بڑا وقت اترنے چڑھنے ھی میں صرف ھوجائے۔

ھم ھوٹل سے ساڑھے نو بجے کے بعد ھی روانہ ھوئے۔ ھوٹل سے ھوائی میدان کا راستہ صرف پون گھنٹے کا ھے۔ اس مختصر مدت میں میں نے خاص طور پر آج مضافات ماسکو پر نظر ڈالی۔ واقعی گزشتہ روز پروفیسر گونکوفسکی صاحب ٹھیک ھی کہ رھے تھے کہ مضافات میں اتنے رھائشی فلیٹ بنے ھیں کہ حیرت ھوتی ھے۔ آٹھ آٹھ دس دس منزلوں کے پلازا ھیں۔ سب ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت قطار اندر قطار تعمیر ھوئے ھیں۔ ماسکو سے ھوائی میدان تک بالائی سڑکوں کے علاوہ زمین دوز راستے (میٹرو) بھی ھیں جن کے ذریعہ سے بڑی عمارتوں کو بھی ایک دوسرے سے ملادیا گیا ھے۔ زمین کے نیچے ٹرینوں کا جال بچھا ھوا ھے۔ لوگوں کو ماسکو سے آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ھوتی۔ وسیع علاقے میں زیادہ تر محنت کش طبقے کے عوام رھتے ھیں لیکن بناوٹ اور سجاوٹ دونوں اعتبار سے عام عمارتوں سے کسی طرح بھی کم تر درجے کی چیز نہیں ھیں۔

مجھے معاً اپنا وطن یاد آ گیا۔ کراچی پہلے بہت چھوٹا شہر تھا۔ لیکن تعمیری منصوبہ بندیاں تیز تر رھیں اور شہر چاروں طرف پھیلتا چلاگیا۔ ھر طرف بلند و بالا عمارتیں تعمیر ھورھی ھیں۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ھم نے روس اور چین سے بات اخذ کی اور غور و فکر کے بغیر پاکستان میں اس پر عمل شروع کردیا۔ میری رائے یہ ھے کہ بالخصوص کراچی میں ان بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر نے دو بالکل بدیہی مسائل پیدا کر دئے ھیں۔ ایک یہ کہ

تمام سرمایہ ان عمارات میں جاکر لگ گیا ھے اور صنعتوں کے فروغ میں کوتاھی ھورھی ھے۔ پاکستان جیسے ملک میں سرمائے کا یہ انجماد اور ''کالی رقم'' کا اس طرح ''سفید'' ھوجانا اچھی بات نہیں ھے۔ تمام صنعت کار عمارات سازی کی صنعت میں رقم لگا بیٹھے ھیں اور مسلسل لگا رھے ھیں جس کا حاصل فوراً کچھ نہیں ھے۔ ممکن ھے کہ حکومت سابق کے ذھن میں یہ بات ھوکہ وہ بالآخر تمام عمارات کو قومی ملکیت میں لے لیگی۔ اگر ایسا تھا تو یہ فکر کی ناھمواری کے ھم معنی کہا جاسکتا ھے۔ عمارتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مرحلہ جس وقت آئیگا اس وقت تو صنعت پاکستان مفلوج ھو کر رہ جائیگی۔ کیونکہ ان مکانات میں دیہات کے رھنے والے آکر آباد ھوتے جارھے ھیں۔ اس طرح ھماری زراعت کو شدید نقصان پہنچ رھا ھے۔ ایک دوسرا واضح نقصان یہ ھے کہ گزشتہ پانچ سال میں مزدور کا سارا طبقہ عمارتوں کی تعمیر میں لگ گیا ھے اور صنعت و حرفت کو بڑی دشواری درپیش ھے، جبکہ کار آمد ذھن پاکستان سے باھر جارھے ھیں اور بلا روک ٹوک یہ سلسلہ جاری ھے۔ چنانچہ صنعت و حرفت کو ایسے لوگ میسر آرھے ھیں جو نہ تو تجربہ کار ھیں اور نہ ناقص اور غیر اسلامی لیبر قوانین کی وجہ سے وہ پروڈکشن بڑھانا اپنی ذمہ داری سمجھتے ھیں۔

روس کا یہ تجربہ سرکاری ھے۔ یہ عمارات سرکاری ھیں اور ان میں آبادی منظم طور پر ھورھی ھے۔ یہاں یہ ممکن نہیں ھے کہ اجازت و منشاء اور منصوبہ بندی کے بغیر آبادیاں دیہات سے شہروں میں منتقل ھوجائیں۔ یہاں روس میں تو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے پر بھی پابندی ھے اور ھوٹلوں میں ٹھیرنے کے لئے سرکاری

اجازت نامه درکار هوتا هے - هوائی جهاز اور ریل کے ٹکٹ بهی اجازت لے کر هی خریدے جاسکتے هیں۔

دسواں پنجساله منصوبه

سوویت یونین کے دسویں پنجساله منصوبے پر مجموعی طور پر ایک کهرب بیس ارب روبل خرچ هونگے۔ اس رقم کا دو تهائی حصه ان منصوبوں پر صرف هوگا جو پچهلے سال شروع هوئے هیں۔ اس کے مطابق تعمیراتی کاموں کی رفتار بهت بڑھ رهی هے - شهروں کے لئے جو ماسٹر پلان تیار کئے گئے هیں۔ ان کے بموجب هر روز سارے ملک میں تین سو فلیٹ مکمل هوکر رهنے کے قابل بن جاتے هیں۔ ایک کام ۱۹۸۰ء تک چلتا رهیگا - هر کام بڑی تیزی سے هو رها هے۔ اب وه زمانه نهیں رها که ایک ایک اینٹ چن کر دیواریں اٹهائی جائیں اور تسلوں میں گارا بهر کر چهت پاٹی جائے - اب تو نئی بستیوں یا رهائشی علاقوں میں تعمیراتی منصوبے ایک فیکٹری کا سا منظر پیش کرتے هیں - مکان تعمیر کرنے والے کارخانے مطلوبه پیمائش کے مطابق بنی بنائی دیواریں اور مکانوں کے پورے پورے حصے فراهم کرتے هیں - بهاری کرینوں هی کے ذریعے سے صیحیح جگه ان کو نصب کردیا جاتا هے چنانچه عمارتوں کے حصے تعمیر کرنے والی فیکٹریاں زیاده تر ان علاقوں میں واقع هیں جهاں بڑے پیمانے پر صنعتی اور زرعی ترقی کا کام جاری هے - مثلاً سائبریا اور روسی وفاق کے غیر سیاه مٹی والے علاقے میں گیاره کروڑ بیس لاکھ مربع میٹر رهائشی جگه کے لئے مقرر کئے گئے هیں جبکه ۱۹۷۰ء میں دس کروڑ تیره لاکھ مربع میٹر میں رهائشی تعمیرات هوئی تهیں - اس کا مطلب یه هے که اس سال مزید ایک کروڑ

افراد نئے اور زیاده آرام ده فلیٹوں میں منتقل هوجائیں گے - اب زیاده سے زیاده مکان معیاری ڈیزائنوں کے مطابق بن رهے هیں جن میں آسائش اور آرائش کا زیاده لحاظ رکھا گیا هے - ظاهر هے که پرانے قسم کے مکانوں کی به نسبت ان پر زیاده لاگت آتی هے لیکن سوویت یونین میں شهریوں پر اس کا مطلق بار نهیں پڑتا، اس لئے که پچهلے بیس تیس سال میں ملک بهر میں مکانات کے کرایوں میں کوئی خاص اضافه نهیں کیا گیا هے -

اس وقت یونین میں مکان کا اوسط کرایه جس میں بجلی، پانی، گیس، سردیوں میں مکان گرم رکهنے اور غلیظ پانی کی نکاسی کا اهتمام شامل هے ، کنبے کے بجٹ کے پانچ یا چھ فی صد سے زیاده نهیں هوتا - ۱۹۲۸ء میں یکساں قسم کے مکانوں کے جو کرائے مقرر کئے گئے تهے ان میں اضافه نهیں هوا هے جبکه اجرتیں اور آمدنیاں اس وقت کے مقابلے میں پانچ گنی هو چکی هیں اور دوسری طرف مکانات تمام جدید ترین سهولتوں سے آراسته هوئے لگے هیں - اس ضمن میں حکومت کو جو نقصان هوتا هے اسے برداشت کر لیا جاتا هے -

سوویت یونین کے جمله مکانات تین حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے هیں - ان میں ایک قسم نجی ملکیت کے مکانوں کی هے جو عام طور پر چهوٹے قصبوں یا قصباتی بستیوں اور دیهات میں واقع هیں - ان میں کسان، استاد، ڈاکٹر اور زرعی معیشت سے متعلق لوگ رهتے هیں۔ ظاهر هے که ان لوگوں کو کوئی کرایه دینا نهیں پڑتا - البته مکانوں کی مرمت اور سفیدی وغیره خود کرانی پڑتی هے - شهروں میں رهنے والوں کی اکثریت جن مکانوں میں رهتی هے، وه

ریاستی اقتدار کے اداروں یا کارخانوں کی ملکیت ہوتے ہیں ۔ تاہم تعمیر ہونے والے ہر ایک سو میں سے اسی حکومت نے بنوائے ہیں اور لوگوں کو مفت دیدئیے ہیں ۔ تیسری قسم سرکاری فلیٹوں کی ہے جو زندگی بھر کے لئے کرائے پر دیئے جاتے ہیں ۔ یعنی کوئی شخص یا تو اپنی مرضی سے فلیٹ خالی کرتا ہے یا اتفاقی صورتوں میں عدالتی حکم کے تحت اسے خالی کرنا پڑتا ہے ۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب اس کے اطوار عام نظم و نسق کے مانے ہوئے اصولوں کے بر عکس ہو جائیں۔

پچھلے دس سال کے دوران میں سوویت یونین میں ایک کروڑ دس لاکھ سے زیادہ افراد نئے سرکاری فلیٹوں میں منتقل ہوئے ہیں ۔ دنیا کے کسی اور ملک میں جدیدترین سہولتوں کے ساتھ مکانات کا تناسب اتنا بڑا نہیں ملتا ۔ یہاں نوے فی صد مکانات نل ، مکانات گرم رکھنے کے آلات ، گندے پانی کی نکاسی کے انتظام ، بجلی اور جدید وضع کے غسل خانوں سے مزین ہیں ۔

گھروں میں گیس اور بجلی پہنچانے کا کام مکانات کی تعمیر سے دوگنی رفتار سے کیا جاتا ہے ۔ ہر سال کوئی پچاس لاکھ مکانوں میں گیس پہنچ جاتی ہے ۔ بجلی سے کوئی مکان محروم نہیں رہتا ۔ سوویت یونین میں ایک اوسط کنبہ تین یا چار افراد پر مشتمل ہوتا ہے ۔ کیونکہ لڑکی کی شادی ہوتے ہی وہ اپنا گھر بار الگ کر لیتی ہے ۔ ہر گھر میں ایک ٹائلٹ اور ایک غسلخانہ ہوتا ہے ۔ چار افراد کا ایک خاندان، جو عموماً میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل ہوتا ہے ، تین کمروں کے فلیٹ کا کرایہ پندرہ روبل بیس کوپک ادا کرتا ہے ۔ اس میں سات روبل آٹھ کوپک اصل

کرایہ ، دو روبل تیراسی کوپک پانی کی اجرت، دو روبل سیورج کا خرچ ، ایک روبل سولہ کوپک بجلی کا خرچ اور پچاس کوپک پلگ لگا کر ریڈیو پروگرام سننے کا معاوضہ شامل ہے ۔ دو روبل اڑتالیس کوپک گرم پانی کے اور ایک روبل پندرہ کوپک ٹیلے وژن کے مشترک اینٹینا کے ہوتے ہیں ۔ مزید دو روبل ادا کئے جائیں تو پورا مکان گرم رکھا جا سکتا ہے ۔ اس میں قدرتی برف ہٹانے کا معاوضہ شامل ہوتا ہے ۔

پچھلے سال سوویت یونین میں ایک فرد کی اوسط آمدنی ڈیڑھ سو روبل تھی ۔ اگر کسی کنبے کے دو افراد کمانے والے ہوں اور ان کی آمدنی تین سو روبل ماہوار ہو تو اس رقم کا صرف چھے فی صد مکان کا کرایہ لیا جاتا ہے ۔ تنخواہ کا حساب مدنظر نہ رکھا جائے تو کرائے کی زیادہ سے زیادہ شرح ۱۳ء۲ کوپک فی مربع میٹر ماہانہ ہوتی ہے ۔ پیمائش صرف کمروں کی ہوتی ہے ۔ باورچی خانہ ، غسل خانہ وغیرہ محسوب نہیں کئے جاتے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں ہر خاندان اپنی آمدنی سے قطع نظر ، آرام دہ فلیٹ میں آسانی سے رہ سکتا ہے ۔ یوں سمجھیے کہ مکان کی مرمت پر جو خرچ ہوتا ہے ، اس کا صرف ایک تہائی بطور کرایہ لیا جاتا ہے ۔ باقی حکومت ادا کرتی ہے ۔ گویا اس مدت میں اسے ہر سال پانچ ارب روبل خرچ کرنے پڑتے ہیں ۔ صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت لوگوں کو فلیٹ کاروباری طور پر نہیں بلکہ ایک سماجی خدمت کے طور پر فراہم کرتی ہے ۔

حکومت کے علاوہ امداد باہمی کی انجمنیں بھی فلیٹ بناتی ہیں ۔ وہ ان لوگوں کے لئے ہوتے ہیں جو عام معیاری فلیٹوں سے

زیادہ بڑے مکانوں میں رہنا چاہتے ہیں ۔ جتنے نئے فلیٹ تعمیر ہوتے ہیں، ان میں سے سات فی صد امداد باہمی کی انجمنوں کے ہوتے ہیں ۔ ان کے لئے حکومت قرضہ دیتی ہے ۔ ان کا نقشہ اور ڈیزائن بھی سرکاری طور پر تیار کیا جاتا ہے ۔ انجمنوں کو زمین بھی مفت ملتی ہے ۔ یہاں ساری زمین حکومت کی ملکیت سمجھی جاتی ہے ۔ اس لئے افراد ان کی خرید و فروخت آپس میں نہیں کر سکتے ۔ ایسے مکان لینے کے لئے ہر شخص کو تیس سے چالیس فی صد رقم تعمیراتی اخراجات کے طور پر ادا کرنی پڑتی ہے ۔ باقی رقم حکومت کے قرضے سے فراہم کی جاتی ہے ۔ یہ قرضہ بیس سال میں قسطوں کی شکل میں واپس کیا جاتا ہے ۔ اس پر سود کی شرح صرف ایک فی صد ہوتی ہے ۔ رقم ادا ہو جانے کے بعد مکان اس کی ملکیت سمجھا جاتا ہے ، پھر بھی وہ اسے فروخت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی اولاد اسے استعمال کرتی ہے ۔ بعض علاقوں میں جہاں عام طور سے لوگ رہنا پسند نہیں کرتے ، حکومت تعمیر کے اخراجات کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ خود ادا کر دیتی ہے ۔ ایسے انتیس علاقے خود مختار جمہوریتوں میں پھیلے ہوئے ہیں ۔

نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ

تمام مندوبین کی موٹر کاریں صاف ستھری اور ہموار سڑک پر تیزی سے دوڑتی چلی جارہی تھیں کہ پروگرام کے مطابق انہیں ایک جگہ روک لیا گیا ۔ وہاں نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کی عمارت زیر تعمیر تھی ۔ سب اراکین کے لئے وہ دلچسپی کی چیز نہیں تھی لیکن میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا ۔ میں نے اپنے وطن میں سرطان کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے اس اعتبار سے اسے دیکھکر اطمینان

ہوا کہ یہاں کی حکومت بھی سرطان کو ایک موذی مرض سمجھ کر اس کے تدارک کے لئے کوشاں ہے ۔ واقعی بہت عظیم الشان عمارت تعمیر ہورہی تھی جو اپنی آخری منزل میں تھی ۔ بتایا گیا کہ سرطان کی تحقیق کے لئے یہ دنیا کی سب سے بڑی تجربہ گاہ ہوگی ۔ کل اخراجات کا تخمینہ کم و بیش دس کروڑ روبل لگایا گیا ہے ۔

ہوائی میدان پر خصوصی انتظامات کئے گئے تھے ۔ ہمیں کوئی زحمت نہ ہوئی ۔ بس ہوائی جہاز میں جا کر بیٹھ گئے ۔ سامان بھی رکھ دیا گیا ۔ گزشتہ بار جب میں یہاں آیا تھا تو دو پنکھوں والے جہاز میں سفر کرایا گیا تھا ۔ اب بھی وہی دو پنکھوں والا جہاز میدان میں لایا گیا تھا ۔ ماسکو سے دو شنبہ تک سفر پانچ گھنٹے کا ہے ۔ اندازہ ہوا کہ اس راستے پر بوئنگ نہ چلانے کی کوئی خاص فنی وجہ ہوگی ۔ آگے پیچھے دو جہاز چلائے گئے ۔ ان دو کے بجائے ایک بڑا جہاز بھی آ سکتا تھا ۔ دو پنکھوں والا جہاز اس دور میں اتنے طویل سفر کے لئے آرام دہ ثابت نہیں ہوتا ۔ اس لئے ہوائی کمپنیوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ چھوٹے جہاز کی آواز بھی اب قابل برداشت نہیں رہی ۔ تا ہم میں چھوٹے بڑے جہازوں میں بیٹھنے کا اس درجہ عادی ہوگیا ہوں کہ میں نے یہ سفر پورے اطمینان سے طے کیا اور بہت سا تحریری کام چار گھنٹے میں مکمل ہوگیا ۔

ماسکو اور دوشنبہ کے درمیان وقت کا فرق تین گھنٹے ہے ۔ ماسکو وقت کے مطابق جہاز پونے سات بجے آیا ۔ دوشنبہ میں وقت پونے دس بجے تھا ۔ دوشنبہ اور پاکستان میں صرف ایک گھنٹے کا فرق ہے ۔ پاکستان میں جب بارہ بجتے ہیں تو دوشنبہ میں ایک بجتا

ہے ۔ دونوں کے عرض بلد میں تھوڑا ھی سا فرق ہے۔

غرض یہ کہ پانچ گھنٹے کی پرواز کے بعد دو انجنوں والا ہوائی جہاز ہوائی میدان پر بڑے آرام سے اترا ۔ ہم نے جھانک کر دیکھا کہ عمارت میں لوگوں کا بڑا اجتماع ہے اور نہایت تیز طاقت کی متعدد بتیاں لگی ہوئی ہیں ۔ اور ہوائی میدان بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ہوائی جہاز کا دروازہ کھلا تو بین باجے کی آوازیں آئیں جس کا انتظام زینے کے قریب ھی کیا گیا تھا ۔ بینڈ بجانے والے اپنے مخصوص لباس میں سج رہے تھے ۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ ہمارے استقبال کی روایتی شان ہے کہ جو تاجیکستان سے مخصوص ہے ۔

ہوائی جہاز سے باہر نکلا تو ٹیلے وژن کے کیمرہ مین چاروں طرف موجود تھے ۔ وہ اس استقبال کی منظر کشی ہر پہلو سے کرنے میں مصروف تھے ۔ چاروں طرف سفید کپڑوں اور سرخ ٹائیوں میں خوبصورت اور صحت مند بچیاں ہاتھوں میں پھول لئے کھڑی تھیں اور خوشی سے اپنے پھولوں جیسے ہاتھ ہلا ہلا کر مندوبین کا استقبال کر رہی تھیں ۔ ان کی تعداد پچاس سے کم نہیں تھی۔

عاصموف سے تجدید ملاقات

میں ابھی جہاز کی سیڑھیوں پر تھا کہ پروفیسر محمدعاصموف نے مجھے دیکھ لیا اور دوڑ کر قریب آگئے ۔ فرط مسرت سے انھوں نے مجھے بھینچ لیا ۔ میں نے بھی ان کو اپنے آغوش میں دبا لیا اور پیار کیا ۔ پروفیسر محمد عاصموف نہایت نفیس انسان ہیں ۔ ان سے شرف ملاقات قدیم ہے ۔ میں درحقیقت ان سے محبت کرتا ہوں ۔ وہ بڑے عالم فاضل انسان ہیں ۔ تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر ہیں ۔ زندہ دل اور فرشتہ صفت ۔ انھوں نے میرے ہاتھ کا بیگ

لے کر میرا بوجھ ھلکا کر دیا ۔ مگر میں نے ان کی اس زحمت کو گوارا نہ کیا اور بیگ واپس لے لینا چاہا ۔ اس کشمکش میں انھی کے اشارے پر ان کے دوسرے ساتھی نے بیگ لے لیا تا کہ وہ ان کے پاس رہے نہ میرے پاس ۔ میں ان ساتھی کو بھی جانتا تھا ۔ ١٩٧٠ء میں جب میں روس آیا تو وہ میرے مترجم اور مشیر رہے تھے ۔

پروفیسر عاصموف صاحب کی کرم فرمائیاں بڑی دیرینہ ہیں۔ مجھ پر ہمیشہ ان کی نظر عنایت رہی ہے ۔ ١٩٧٥ء میں جب میں امیر خسرو رح دھلوی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ماسکو آیا تو ایک جلسۂ عام دوشنبہ میں شام کے چار بجے ہونے والا تھا ۔ میں اور سارے وفود وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے ۔ وہاں تاجیکستان کے وزیر اعظم صاحب اور وزیر تعلیم موجود تھے ۔ ان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا ۔ وہ دونوں خندہ پیشانی سے ملے۔ اس کے بعد ہم اندر اسٹیج تک گئے ۔ وفود کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تھا ۔ وزیر اعظم صاحب کے جانے کے بعد وزیر تعلیم نے جلسے کی تمام کاروائی سر انجام دی ۔ ان کے دائیں جانب ھندستانی مندوب بیٹھے تھے ۔ میں نے پروفیسر عاصموف صاحب کا اشارہ نہیں سمجھا۔ وہ مجھے صدر کے دائیں جانب بٹھانا چاہتے تھے ۔ اس موقع پر میں نے جمیل الدین عالی صاحب کی بے چینی کو پوری طرح محسوس کیا اور عاصموف صاحب سے درخواست کی کہ پاکستان کی جانب سے میرے بجائے عالی صاحب کو خطاب کا موقع دیا جائے ۔ میرے اس فیصلے سے عاصموف صاحب کو اتفاق رائے نہیں تھا ۔ مگر انھوں نے میری درخواست کو بادل ناخواستہ قبول کر لیا ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عالی صاحب کو ذرا بھی کمتری کا کوئی احساس میری وجہ سے ہو۔

میں عالی صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں ۔ وزیر تعلیم صاحب نے حاضرین سے میرا تعارف اہمیت کے ساتھ کرایا اور پھر خود عالی صاحب نے اپنے خطاب میں میرے بارے میں اہمیت کے ساتھ کلمات خیر فرمائے ۔ اسی طرح پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم سرکاری مہمان خانے کے ضیافت ہال میں پہنچے تھے تو جناب محمد عاصموف صاحب نے مجھے اپنے بائیں طرف بٹھایا ۔ ان کے دائیں جانب ہندستان کے شکلا صاحب تھے ۔ سامنے وزیر تعلیم تھے اور ان کے دائیں بائیں عراق و ایران کے نمائندوں کو جگہ دی گئی تھی ۔ یہ عزت افزائی عاصموف صاحب کی وجہ سے تھی جو مجھ پر بے حد مہربان تھے ۔ وہ موجودہ دورے میں بھی مہربان رہے ۔

اب پروفیسر عاصموف صاحب نے عمارت کی جانب راہنمائی کی ۔ بچیوں نے جو منتظر تھیں، تمام مندوبین کو گل دستے پیش کئے ۔ ساز بج رہا تھا اور سچ پوچھئے تو ایک شادی کا سا منظر تھا ۔ ہر ہاتھ پر پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے اور پھول سے بچوں کی مسکراہٹوں نے ساز کو سوزوگداز بخشا تھا اور انہیں حسن و رعنائی عطا کی تھی ۔

ڈاکٹر غفاروف سے شرف ملاقات

ماسکو میں مس مارگریٹا پاؤلونا میری مترجم تھیں اور اب میں استاد محترم جناب ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف کی رہنمائی میں ہوں ۔ استاد غفاروف صاحب اکیڈمی آف سائنسز میں انسٹی ٹیوٹ اورینٹل میں صدر شعبۂ ہند و پاکستان ہیں ۔ یہ میرے لئے وجہ شرف و اعزاز ہے کہ مجھے ان استاد عالی مقام کا قرب حاصل ہو گیا ۔ اور دوشنبہ میں جب تک رہنا ہوگا، وہ میرے ساتھ ہی رہینگے ۔



حکیم محمد سعید اور پروفیسر عبداللہ جان غفاروف ، خلوص و انس کے عالم میں ۔



نمائش گاہ عینی ، دوشنبہ ، تاجیکستان ۔ کمال عینی ،فرزند صدرالدین عینی ،

میرے لئے ایک کار کا انتظام تھا - میں تو جناب فیض صاحب کے ساتھ بیٹھ رہا تھا مگر بتایا گیا کہ میرے اور ان کے لئے علحدہ علحدہ کاریں ہیں۔

استاد بزرگ کی رہنمائی میں مہمان خانے تک پہنچا - یہ وہی مہمان خانہ تھا کہ جہاں ۱۹۷۵ء میں بھی مجھے ٹھیرایا گیا تھا - بڑی شاندار عمارت ہے - ایک وسیع و عریض باغ ملحق ہے اور اس باغ میں یہ مہمان خانہ تعمیر کیا گیا ہے - الگ الگ کئی حصے ہیں - مجھے مین بلڈنگ میں جگہ دی گئی - فیض صاحب بھی اسی میں ٹھیرائے گئے اور ہندستانی وفد بھی، جس میں سردار جعفری، ان کی بیگم صاحبہ اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ شامل تھیں -

سردار جعفری صاحب کو انگریزی مترجم ملیں جو ماسکو سے ساتھ آئی تھیں - میری ماسکو والی مترجم جناب فیض صاحب کے حوالے کی گئیں - ڈاکٹر منیرہ' جو اکیڈمی آف سائنسز میں اسکالر ہیں اور میرے مرحوم دوست پروفیسر مرزایوف کی شاگرد رشید، محترمہ عصمت چغتائی کی دیکھ بھال پر مامور کی گئیں میری خوش بختی یہ تھی کہ مجھے استاد عبداللہ جان صاحب محترم کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا۔

شاندار مہمان خانے میں

مہمان خانے میں میرا کمرہ ایسا شاندار تھا کہ اس میں سوتے ہوئے تامل ہو رہا تھا - بستر اتنا زرق برق تھا کہ اس پر لیٹتے ہوئے دکھ ہونے لگا کہ اس میں سلوٹیں پڑجائینگی - ریڈیوگرام بھی رکھا تھا اور ٹیلے وژن بھی - ایک طرف بے شمار تولئے لٹک

رہے تھے ۔ جوتے پر چمک پیدا کرنے کے لئے ہمہ رنگ کے پالش معہ برش موجود تھے ۔ غسل خانے میں صابن اور ٹوتھ پیسٹ تک رکھا ہوا تھا ۔ ٹیلے فون بھی تھا جس کا نمبر ۴۴-۴۴،۱۴-۴ تھا۔

اس مہمان خانے کے ضمن میں یہ بڑا دلچسپ اور دل خوش کن تجربہ کہا جا سکتا ہے کہ سارے کمروں میں کنڈی تالے کا کوئی تکلف نہیں ہے ۔ رات کو کمرہ بند کرنے کا کوئی مسئلہ ھی نہیں ہے ۔ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ بات صرف سرکاری مہمان خانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یا سارے شہر میں یہی دستور ہے۔ پتہ چلا کہ یہاں کا نظام سخت ہے اور چوری چکاری کا کوئی خطرہ نہیں ہے ۔ تائید اس بات سے ہوئی کہ ہم یہاں کے سب سے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گئے تو وھاں دکانوں تک پر کوئی تالہ نہیں تھا ۔ پردہ ڈال دیا اور بس دکان بند ہوگئی ۔ میں نے سعودی عرب اور یہاں کے حالات کا موازنہ کیا ۔ سعودی عرب کا حال بہر نوع بہتر ہے ۔ مگر تاجیکستان میں یہ اہتمام دیکھ کر بڑا ھی اطمینان ہوا۔

دل چاھا کہ میں اپنی عادت اور اوقات کے مطابق زمین پر سو رہوں مگر خیال آیا کہ کہیں یہ نامناسب نہ ہو ۔ میں ابھی سوچ ھی رہا تھا کہ استاد عبداللہ جان نے بلایا کہ کھانا حاضر ہے ۔ میں چاھتا تھا کہ فیض صاحب کے ساتھ چلوں مگر پتہ چلا کہ وہ اور سردار جعفری صاحب ایک گھنٹے بعد کھانا تناول فرمائیں گے۔ میں ان دونوں کے ذوق و شوق سے واقف ہوں ۔ میں نے تاخیر سے کھانا کھانے کی وجہ سمجھ لی اور تنہا چلا گیا ۔ وھاں دوسرے مندوبین بیٹھ چکے تھے ۔ میں نے دھی کے دو گلاس اور دو سیب اور ذرا سی نان نوش جان کی ۔ کبابوں کا انتظار کیا مگر میری باری

نہ آئی ۔ بہر نوع میں نے جتنا کھایا تھا وہ میرے لئے کافی تھا ۔

میں کمرے میں واپس آگیا اور یہاں آ کر گھڑی دیکھی تو تقریباً بارہ بجے تھے ۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے، وضو کیا اور نماز عشاء ادا کر کے سجدۂ شکر ادا کیا۔

دوشنبہ

دوشنبہ جو جمہوریۂ تاجیکستان کا صدر مقام ہے، فروغ صنعت و حرفت کے اعتبار سے بہت مشہور ہے ۔ یہاں سوتی اور اونی کپڑے کے کئی کارخانے ہیں ۔ ایک سلک ملز ہے ۔ جوتے بنانے کی فیکٹری ہے، جہاں فوجی جوتے بھی تیار ہوتے ہیں ۔ سیمنٹ بنانے کا کارخانہ ہے جو روزانہ کئی ہزار ٹن سیمنٹ تیار کرتا ہے ۔ بناسپتی تیل بنانے کا کارخانہ بھی قائم ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب صنعتیں اسی شہر کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ یہاں کی مصنوعات دوسرے شہروں، علاقوں بلکہ غیر ملکوں کو بھی بھیجی جاتی ہیں ۔ دریائے درزوب کے کنارے پن بجلی بنانے کا ایک بڑا پلانٹ لگا ہوا ہے جو شہر کو روشن رکھتا اور جملہ مشینوں کو حرکت میں لاتا ہے ۔ قدرتی گیس بھی دریافت ہو چکی ہے ۔ اس کی پائپ لائنیں سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ ایک جانب پہاڑی علاقہ ہے جس کی ڈھلانوں پر مکانات بنے ہوئے ہیں ۔ وھاں بھی خوب روشنی ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاروں بھرے آسمان کا ایک حصہ جھک کر زمین سے ہم آغوش ہو رہا ہے۔

تاجیکی مسلمان

تاجیکی باشندوں کی اکثریت خوش مزاج ہے ۔ ان میں مسلمانوں کی صحیح خصوصیات واقعی موجود ہیں جبکہ ہم پاکستانیوں

نے واقعی ان خصوصیات سے محرومی کا اعلان کر رکھا ہے ۔ مساجد ہیں، لوگ روزے بھی رکھتے ہیں، مگر نمازیوں اور روزہ داروں کی تعداد کم سے کم تر ہو رہی ہے ۔ نوجوانوں میں اسلام کو زیادہ درجۂ قبول حاصل نہیں ہے ۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر باپ مسلمان ہے تو بیٹا دھریا بن رہا ہے ۔ مسلمانوں کی پانچوں ریاستیں روس کے زیر نگیں ہیں اور انتظام یہ ہے کہ ایک ریاست کا مسلمان دوسری ریاست میں اجازت نامے کے بغیر نہیں جا سکتا ۔ اجازت حاصل کرنی عملاً مشکل ہے ۔ اس لئے پانچوں ریاستوں کے مسلمان نہ تو متحد ہو سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے بارے میں ان کو علم ہے ۔ لہذا ان کی کوئی مشترک منزل نہیں ہے ۔ آبادی بڑی تیزی کے ساتھ روس کے اثرات قبول کررہی ہے ۔ روسیوں کو لا لا کر ان علاقوں میں تنظیم کے ساتھ آباد کیا جا رہا ہے اور اس طرح اسلامی اثرات غیر محسوس طور پر ختم ہو رہے ہیں ۔ چین روس پر بھی تو الزام لگاتا ہے کہ اس نے مسلمان ریاستوں کو کالونی بنا دیا ہے ۔ مگر خود چین میں بھی مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا ہے ۔

به ایں همه روس اپنی عظیم مسلم اقلیت سے صرف نظر نہیں کرتا ہے ۔ وہ ان کے جذبات کا احترام کرتا ہے اور علمی میدان میں اسلامیت کے کارناموں کا قدردان ہے ۔ سنٹرل ایشیا کے مسلم صاحبان حکمت کے علمی کاموں کو زیادہ سے زیادہ روسی زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے اور مسلم اکابر کے علمی جشن منانے میں وہاں کوئی کوتاهی نہیں ہو رہی ہے اور آثار اسلاف کے تحفظات کا سامان بھی ہورہا ہے ۔ اس کے شانہ بہ شانہ روس کی لا مذہب پالیسی بھی جاری و ساری ہے جسے وہ مسلم

اقلییت پر تھوپ دینے کی پالیسی سے گریزاں ہے ۔ تا ہم نظام تعلیم میں یکسر تبدیلی بالآخر قدیم نظریۂ اسلام کو مغلوب کر رہی ہے۔ فارسی زبان روسی رسم الخط میں اب لکھی جا رہی ہے اور اس میں تدریج کے ساتھ روسی الفاظ داخل ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں میری رائے یہ ہے کہ اگلے ۲۰ ، ۲۵ سال میں ہر مسلم ریاست سے اس کی مادری زبان ختم ہوکر صرف روسی زبان باقی رہ جائے گی۔

مختلف انداز فکر

۱۹۷۵ء میں جشن امیر خسرو دهلوی کے موقع پر بابا جان غفوروف صاحب نے اپنی تقریر میں تین بار اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا لفظ استعمال کیا تھا ۔ جبکہ ہمارے جمیل الدین عالی صاحب پاکستان کو ایک سوشلسٹ مملکت ثابت کرنے کے در پے تھے اور خود میزبان ہم کو اسلامی کہ رہے تھے ۔ اس مزاج کو سمجھنے کے لئے فکر و عقل کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ میں نے اپنے اس سفر میں ایک بار بھی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا ۔ اس کے برعکس میں نے اپنے عمل سے (یعنی روزہ و نماز کی پابندی سے) پاکستانیوں کو خالص مسلمان ثابت کرنے کی سعی کی تھی ۔ میں نے روزہ اور نماز کی واضح پابندی اور اظہار کا اہتمام کیا تھا تا کہ روسی حضرات کو یہ احساس ہو کہ پاکستان میں معتبر و معروف لوگ مذہب اسلام کی حمایت برملا کرتے ہیں اور یہ کہ اسلام کے اصولوں پر عمل بھی کرتے ہیں۔

بابا جان غفوروف صاحب مجھ سے اس درجہ متاثر تھے کہ اجلاس کے اختتامی لمحات میں مجھ سے فرمایا کہ آخر میں آپ کو تقریر کرنی ہے ۔ میں نے کہا کہ سفیر پاکستان کی تقریر کے بعد

میری کیا ضرورت ہے مگر ان کا اصرار تھا کہ تقریر ہوگی - انہوں نے اپنے خطاب میں کئی بار میرا ذکر کیا اور میری علمی خدمات کو سراہا تھا -

١٩٧٥ء کے شروع میں بابا جان غفوروف صاحب پاکستان آئے تھے - انہوں نے مجھ سے اس بار رابطہ خصوصی قائم کیا - گو ١٩٧٣ء میں جب یونیسکو میں میں نے ان کے ساتھ خصوصی دعوت پر سنٹرل ایشیا اسٹڈی ڈویژن میں تین دن کام کیا تھا تو اس وقت بھی انہوں نے بڑی خصوصیت برتی تھی - پھر پاکستان میں ان کے خصوصیت برتنے کا تو یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم بھٹو صاحب اور اس وقت کے وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب سے میرے بارے میں بات کر کے امیر خسرو نیشنل کمیٹی کی سرنو تشکیل دلوائی اور اس میں میرا نام شریک کیا - پھر انہوں نے تاریخ کانفرنس (منعقدہ اسلام آباد) میں خطاب کرتے ہوئے پانچ بار میرا ذکر کیا اور پاکستانی سامعین نے حیرانی کے ساتھ شام کو جب میں کراچی سے اسلام آباد پہنچا، تو اس صورت حال کا ذکر کیا - اس کے بعد پورے دورے میں انہوں نے مجھے اہمیت دی - میں نے بھی ان کے لئے ایسا ہی برتاؤ کیا تھا اور ان کی مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی -

مجھے یقین ہے کہ ان کو پورا اندازہ ہے کہ میں پاکستان کے عوام میں بہت مقبول ہوں - وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں علمی کاموں میں پیش پیش ہوں اور رائے عامہ پر اثر انداز ہوں - خود بابا جان صاحب کو مجھ سے تعلق خاطر بھی ہے - وہ خود ایک اچھے مسلمان ہیں اور شریف النفس ہیں - روس میں ان

کا علمی مقام بلند ہے - نیز وہ ایک وزیر کے عہدے کے برابر حکومت میں اثر انداز ہیں - علمی دنیا میں باہر جا کر روس کی نمائندگی ان کی ذمہ داری ہے - یونیسکو میں بھی وہ قوی اثرات رکھتے ہیں- ١٩٧٣ء میں وہ مصر تھے کہ کنگرس آف اوریئنٹالسٹس کا جلسہ ١٩٧٦ء میں ماسکو میں ہونا چاہئے - وہ اس کے حق میں تقریر کرنے اسٹیج پر چڑھ گئے - منتظمین نے لاؤڈ اسپیکر کا تار کاٹ دیا مگر ان کے حامی بکثرت وہاں موجود تھے اور ہاؤس کو ان کا خطاب بالآخر سننا ہی پڑا - اس طرح روس کا موقف منوا لیا گیا-

باز گشت

ذکر اس بات کا تھا کہ تاجیکی باشندے کس مزاج کے ہیں لیکن سلسلۂ خیال کہاں سے کہاں لے گیا اور میں خواہ مخواہ سیاسی الجھنوں میں پڑگیا

جمہوریہ بننے اور سوویت یونین میں ایک ریاست کی حیثیت سے شامل ہونے سے پہلے تاجیکستان زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا اور خاص طور سے دو شنبہ ایک معمولی گاؤں تھا - اب تاجیک جمہوریہ کی آبادی بتیس لاکھ ہے - رقبہ ایک لاکھ تینتالیس ہزار ایک سو مربع کلومیٹر ہے - دو شنبہ کی زیادہ آبادی کاریگروں اور مزدوروں پر مشتمل ہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں اعلا تعلیمیافتہ لوگوں کی کمی ہے - تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز کا صدر دفتر اسی شہر میں ہے جہاں سائنسی تجربات کے علاوہ ادبی تخلیقات کا کام بھی ہر وقت ہوتا رہتا ہے - مختلف موضوعات کی کتابوں کا خاص انتظام ہے - غیر ملکی اور روسی مصنفین کے شاہکاروں کے ترجمے تاجیکی زبان میں کئے جاتے ہیں - اب تک پشکن، گورکی، شیکسپئر،

بلزاک اور علامہ اقبال کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں - ادارے کے اولین سربراہ مشہور شاعر اور لینن انعام یافتہ ادیب مرزا ترسون زادہ تھے - وہ اپنی ادب نوازی کی وجہ سے ایشیا بھر میں مقبول تھے - تقسیم برصغیر سے ایک سال قبل وہ ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کے لئے دھلی آئے تھے - اس وقت ان سے سرسری ملاقات ہوئی تھی لیکن اس سرسری ملاقات ھی کا گھرا نقش میرے دل و دماغ پر اب تک موجود ھے۔

دو شنبہ روئی کی پیداوار کے لئے مشہور ھے - لاکھوں ایکڑ زمین پر اس کی کاشت ھوتی ھے - پہاڑیاں پستہ، بادام، خوبانی اور اخروٹ کے درختوں سے ڈھکی رھتی ھیں - ڈھلانوں پر سبزہ بے قیاس ھے - اس لئے عمدہ نسل کے گھوڑے پرورش پاتے ھیں - بھیڑ بکریوں کی بھی چرا گاھیں ھیں - مرغ بانی کا کاروبار بڑے پیمانے پر ھوتا ھے - اس ضمن کی کوئی چیز باھر سے منگانی نہیں پڑتی بلکہ بھیجی جاتی ھے -

تاجیکستان میں تعلیمی سرگرمیاں

دوشنبہ یونیورسٹی میں ماھرین طبقات الارض ، ماھرین طبیعیات و لسانیات، مورخین اور ارباب قانون کی تعلیم و تربیت کا خاص اھتمام ھے۔ یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر سولیخ راجا بوف پہلے تاجیکی باشندے ھیں جو مغربی درسگاھوں سے ڈاکٹر آف ھسٹاریکل سائنسز کی سند لے کر آئے تھے - ان کے دو بھائی بھی شعبۂ تعلیم سے وابستہ اور اعلا عھدوں پر فائز ھیں - ان کی بہنیں بھی اسی منزل میں گامزن ھیں -

انقلاب سے پہلے تاجیکستان کے ھر دو سو باشندوں میں

سے صرف ایک فرد تعلیم یافتہ تھا - اس وقت امیر بخارا کا اس علاقے پر بھی تسلط تھا - اب جمہوریہ میں ناخواندگی کا نام و نشان تک نہیں ھے - شیرخوارگی کی منزل سے نکلتے ھی ھر بچے کو لازمی طورپر کنڈر گارٹن کی قسم کی سرکاری درسگاھوں میں داخل کردیا جاتا ھے اور فارغ التحصیل ھونے تک اسے دوسری کسی نہ کسی درسگاہ سے وابستہ رھنا پڑتا ھے - تعلیم و تربیت ماں باپ کے نہیں ، حکومت کے فرائض میں شامل ھے - صرف اسی جمہوریہ مس نہیں بلکہ سوویت یونین کی ھر جمہوریہ کا یہی حال ھے -

ھوا کی سائیں سائیں نے لوری کا کام دیا ، میری آنکھیں بند ھونے لگیں اور تاجیکستان کی خوشحالی کا تصور ذھن میں لئے میں اپنے بستر پر دراز ھو گیا اور نماز فجر کے وقت تک بے خبر سوتا رھا - ھوا کے دوش پر بہت دور سے مجھے اللہ اکبر کی صدا سنائی دی - اس کا مطلب یہ تھا کہ قریب کوئی خانۂ خدا نہیں تھا۔ لہذا میں نے فریضۂ نماز و تسبیح مہمان خانے کے کمرے ھی میں ادا کیا -

کانفرنس کے ابتدائی مراحل

پروگرام کے مطابق آج یعنی ١٠ اپریل بروز ھفتہ صدرالدین عینی کے جشن صد سالہ کا آغاز ھونا تھا - منتظمین متحرک تھے - ھر شخص کو یہ فکر بھی تھی کہ کوئی کوتاھی نہ ھو جائے - محترم محمد عاصموف مجلس انتظامیہ کے صدر تھے مگر وہ حسب معمول بہت مطمئن تھے - یہ ان کی عادت ھے کہ وہ سمجھتے ھیں کہ ھر کام بہ حسن و خوبی انجام پذیر ھوگا اور یہ حقیقت ھے کہ

ایسا ہوتا ہے - کبھی کسی قسم کی پشیمانی نہیں ہوئی - ان کے حرکات و سکنات متوازن تھے - ہر چند کہ وہ بڑی با اثر شخصیت ہیں اور اپنے علمی مرتبے کی بنا پر معززین میں شمار ہوتے ہیں، تاہم وہ ہر چھوٹے بڑے کا احترام کرتے ہیں - شب گزشتہ کہ جب ماسکو سے چند بڑے اس جشن میں شرکت کے لئے پہنچے تو میں نے ان کو ذرا متغیر دیکھا تھا - وہ ان کے مناسب قیام کے لئے تگ و دو کر رہے تھے - ایسی ہنگامی پریشانیوں کا وہ بہت کم اثر لیتے ہیں -

صبح وہ میرے کمرے میں آئے تو میرے مطبوعہ مقالے کی کاپی ان کے ہاتھ میں تھی - انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا :

”من مقالۂ جناب عالی دزدیدہ ام،،

میں نے سوال کیا :

”از کجا جناب عالی ؟،،

جواب ملا : ”خانم مریم سلگانگ بکمال عنایت و لطف و مروت مرا دادہ اند،،

اکیڈیمیشین عاصموف نے مقالۂ مطبوعہ کے بارے میں میرا شکریہ ادا کیا اور رسماً مجھ سے اجازت لے کر روانہ ہوگئے - ظاہر ہے کہ چھپے ہوئے مقالے سے ان کی ایک پریشانی کم ہو گئی - وہ یہ کہ انہیں ٹائپ کرانے کی زحمت نہیں ہوئی - دوسرے مندوبین کے مقالے ٹائپ کرانے بڑی تعداد میں کاپیاں تیار کرنی پڑیں تاکہ تمام شرکائے اجلاس میں تقسیم کی جا سکیں - اپنے زیر اہتمام کانفرنسوں میں مجھے ایسی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے - اسلئے



کنگرس عالمی صدرالدین عینی - یوم افتتاح پر جناب صدر علمائے عالمی مندوبین اور اہل فضل و کمال سے مخاطب ہیں -




پروفیسر محمد عاصموف صدر تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز ، کنگرس عالمی صدر الدین عینی سے مخاطب ہیں -

میں کم سے کم اپنا مقالہ کراچی سے چھپوا کر لے آیا تھا ۔

ایسی کانفرنسوں میں ایک اور بڑا مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مندوبین کو ان کے کمروں سے نکال کر موٹروں میں بٹھایا جائے تا کہ اجتماع میں وقت کی پابندی ہو سکے ۔ یہ ایک بڑا کٹھن کام ہے۔ جس پر گزر چکی ہو وہی جانتا ہے ۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ مغربی علماء پابندیٔ وقت کا زیادہ خیال کرتے ہیں ۔ مگر ایشیائی اور افریقی علماء مزاجاً خود بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں اور منتظمین سے زیادہ توجہ کے خواہاں ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے پہلے پاکستان میں ایک بڑی عالمی کنگرس کا انتظام و انصرام میری خوشگوار ذمہ داری تھی ۔ اس میں دنیائے عرب کے دو بڑے میرے مہمان تھے اور ان دونوں میں احساس برتری موجود تھا ۔ ایک کا احساس برتری یہ تھا کہ وہ دنیائے علم کے آفتاب و ماہتاب ہیں ۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی ۔ دوسرے کا احساس برتری یہ تھا کہ وہ بلند مرتبہ امام دین تھے ۔ ان دونوں کو بیک وقت کمروں سے لاکر موٹروں میں بٹھانا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور میں دو دن تک اس جتن میں لگا رہا کہ ان دونوں میں کوئی اختلافی مسئلہ پیدا نہ ہونے پائے اور خیریت سے یہ اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو جائیں۔

شب گزشتہ میرے کمرے میں میرا بیگ آگیا تھا ۔ یہ کنگرس بیگ خاصا وزنی تھا ۔ میں نے صبح روانگی کے وقت اس کا جائزہ لیا۔ اس میں کئی کتابیں "حدیثہ" موجود تھیں ۔ کانسی کا بنا ہوا صدرالدین عینی بیج تھا اور منجملہ دوسری چیزوں کے پروگرام کی ایک مطبوعہ کاپی بھی رکھی تھی ۔ پروگرام کا بڑا حصہ روسی زبان میں تھا جسے میں پڑھ نہ سکا۔

قومی زبان کا احترام

پاکستان کے سوا تمام ملکوں کی یہ وضعداری ہے کہ ان کے لوگ اپنی قومی زبان کا احترام کرتے ہیں - زیادہ تر اسی میں تقریر کرتے اور لکھتے ہیں - ہم پاکستانی اپنی قومی زبان کو نظر انداز کر کے انگریزی زبان میں' جو عہد غلامی کی نشانی ہے اور اب تک ورثہ میں شامل ہے ، اظہار خیال کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں - تاجیکستانی زبان بھی ذرا سے فرق و امتیاز کے ساتھ فارسی ہے مگر گزشتہ کئی سالوں سے فارسی رسم الخط ترک کیا جارہا ہے اور فارسی زبان روسی رسم الخط میں لکھی جارہی ہے - رسم الخط کی یہ تبدیلی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہوسکتی ہے - اندازہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ آج سے کوئی پچیس سال بعد فارسی کی جگہ روسی زبان لے لیگی کیونکہ موجودہ فارسی میں روسی الفاظ اور محاورے داخل ہورہے ہیں اور خالص کلاسیکی فارسی ختم ہورہی ہے - تاجیکستان سے شائع ہونے والے اخبارات میں سے بعض کی زبان فارسی ہے مگر فارسی رسم الخط میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا - حتیٰ کہ ایسی تقریبات میں جیسی کہ یہ تقریب عینی ہے ، اس کے پروگرام پر گو فارسی زبان غالب ہے مگر پروگرام تک فارسی رسم الخط میں نہیں ہے - تاجیکستان میں اب تعلیم بھی بڑی تیزی سے بدل رہی ہے جو آنے والی نسلوں پر اثر انداز ہوگی - ذریعۂ تعلیم اب روسی زبان ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں فارسی جاننے والے ختم ہوجائیں گے اور تاجیکستان کی زبان بھی روسی زبان ہوجائے گی - مصطفیٰ کمال نے بھی ترکی میں یہی کیا تھا - رسم الخط تبدیل کردیا - ترکی کے نئے رسم الخط کے وہی موجد ہیں - آج صورت حال یہ ہے

کہ ترکی میں عربی اور فارسی رسم الخط کی کتابیں کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں - کباڑیوں کی دکانیں ان سے بھری پڑی ہیں - کوئی خریدنے والا نہیں ہے - موجودہ ترکی میں ان کو پڑھنے اور سمجھنے والے ناپید ہیں - عربوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک کیا یہ اس کا رد عمل ہے جس کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ ترکی سے عربی رسم الخط تک کو خیرباد کہ دیا گیا - روس میں بھی رد عمل کی کیفیت موجود ہے - مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ لامذہب و لادین مملکت ہے - یہاں ہر مذہب کو ختم کردینا فطری عمل ہے الا یہ کہ وہ وقت آئے کہ موجودہ لامذہبیت سے لوگ عاجز و تنگ آجائیں ، اور پھر کسی دین و مذہب میں تلاش حق کریں - روس میں انفرادی دین پر کوئی پابندی نہیں ہے - لوگ صوم و صلواۃ میں آزاد ہیں - تاہم جس فضا میں وہ سانس لیتے ہیں، وہ دین و مذہب کی نشو و نما کیلئے سازگار نہیں ہے - صرف رسمی طور پر آزادی ہے - اب سے کچھ عرصے پہلے یہ بات نہیں تھی - چنانچہ لبنان کے مفتی اعظم شیخ حسن خالد نے روس کا دورہ کرنے کے بعد ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ''پہلا سفر'' - اس میں اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ سوویت یونین میں مذہبی آزادی ہے اور ان کے خیال میں یہ لینن کی اس پالیسی پر عمل درآمد کا نتیجہ ہے جس کے تحت یونین میں قومی اور مذہبی پابندیوں کو دور کیا گیا ہے - یہاں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ صورت حال کیا تھی اور سوویت حکومت کے بانی نے کیا کردار ادا کیا -

لینن اور مسلمان

اکتوبر کے عظیم اشتراکی انقلاب کے بعد ''روس اور مشرق کے تمام محنت کش مسلمانوں کے نام،، ایک اپیل شائع کی گئی۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا :

''آج سے آپ کے عقائد اور رسم و رواج، آپ کے قومی اور مذھبی ادارے سب کے سب آزاد اور قابل حرمت ھیں۔ اپنی قومی زندگی آزادی سے اور بلا کسی رکاوٹ کے گزارئیے۔ یہ آپ کا حق ھے،،۔

اس اپیل کی اھمیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک یہ معلوم نہ ھو کہ زار شاھی روس میں مذھب کی حالت کیا تھی۔ عیسائی مذھب حکومت کا سرکاری مذھب تھا اور باقی دوسرے مذاھب، جن کی تعداد دس تھی، اور جن میں اسلام بھی شامل تھا، محکوم حیثیت کے حامل تھے۔ اس اپیل میں جو سوویت حکومت نے مسلمانوں سے کی، عیسائی مذھب کی برتری کو ختم کردیا اور اس برتری کے سبب دوسرے مذاھب پر جو پابندیاں عائد تھیں، انھیں دور کردیا۔

۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو لینن کے ایما پر ایک خاص سرکاری فرمان کا اجرا عمل میں آیا۔ اس فرمان کی روح سے ھر شہری کو ضمیر کی مکمل آزادی دی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت سے سوویت یونین کے ھر شہری کو یہ آزادی حاصل ھوگئی کہ وہ جو مذھب چاھے اختیار کرے اور اپنی مذھبی رسومات آزادی سے ادا کرے۔ یا کوئی مذھب اختیار نہ کرے۔ اس حکم میں یہ کہا گیا تھا کہ مذھبی عقائد کی بنا پر کسی کے ساتھ بےجا سلوک

کرنا، کسی کے مذھبی احساسات کو ٹھیس پہنچانا اور مذھبی رسومات کی ادائیگی پر کسی کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا قابل سزا جرم ھے۔ اس حکم میں ایسے قوانین اور فرمان جاری کرنے کی بھی ممانعت کی گئی تھی جو کسی کے ضمیر کی آزادی کو محدود کردیں یا مذھب کی بنا پر کسی کو فوقیت دیں۔ اس فرمان کے اجرا کے ساتھ ھی مذھب کو حکومت سے اور اسکولوں کو مذھب سے الگ کر دیا گیا۔ اس طرح سے سوویت یونین میں ھر مذھب کا مرتبہ یکساں ھوگیا۔ اس کے علاوہ حکومت نے مذھب کے معاملات میں دخل اندازی بند کردی اور ساتھ ھی یہ کہا کہ مذھب بھی حکومت کے معاملات میں دخل نہ دے۔

وسطی روس کے مسلمانوں کے سلسلے میں، جہاں مذھبی نا انصافی بہت زیادہ تھی، اس فرمان کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے لینن کی ذاتی ھدایت پر وسطی روس کے مسلم امور کی ایک خصوصی جماعت (کمیساریت) قائم کی گئی۔

ایک سیاست دان کی حیثیت سے لینن کی ایک نمایاں صفت یہ تھی کہ وہ تمام قوانین اور فرمانوں پر سختی سے عمل درآمد کرانے میں دوسروں کے سامنے ایک مثال قائم کرتے تھے۔ ان کی یہ صفت ان کے اس طرز عمل سے بھی ظاھر ھوتی ھے جو انھوں نے مذھب اسلام کی جانب اختیار کیا۔ اس کی ایک نمایاں مثال حضرت عثمان غنیؓ کے قرآن پاک کے نسخے کے واقعے میں ملتی ھے۔ روایت یہ ھے کہ حضرت عثمانؓ کے قرآن مجید کے اس نسخے کو امیر تیمور سمرقند سے لایا تھا۔ یہ تاریخی واقعہ سب لوگوں کے علم میں ھے۔ اس کے بعد جب وسطی ایشیا روس کے زیر اقتدار آگیا

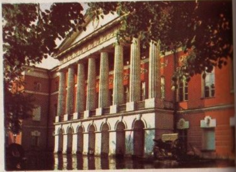
تو زار کے افسروں نے ایک سو روبل دے کر قرآن پاک کا یہ نسخہ حاصل کرلیا اور اس طرح سے مسلمانوں کو حضرت عثمان رضؓ کے قرآن مجید کے نایاب نسخے سے محروم کردیا گیا ۔ اکتوبر کے انقلاب کے بعد یہ متبرک نسخہ مسلمانوں کو واپس کردیا گیا ۔ پیٹرگراڈ کے مسلمانوں کی درخواست پر یہ واپسی لینن کی ذاتی ہدایت کے مطابق عمل میں آئی ۔ پھر قرآن مجید کا یہ نسخہ ازبکستان کے عوامی عجائب گھر کے انتہائی قیمتی قلمی نسخوں میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

لینن نے مسلمانوں کی اس درخواست پر بھی بہت توجہ دی جو اسلامی ثقافت کی ایک تاریخی یادگار یعنی سمرقند کی جامع مسجد کی مرمت کے متعلق تھی ۔ خانہ جنگی ، معاشی بد حالی اور دوسری مشکلات کے باوجود لینن نے اس درخواست پر عمل در آمد کیا اور اس کام کو پورا کر دیا ۔

سالہا سال گزرتے رہے مگر لینن کی پالیسی کے اصول قائم رہے ۔ پہلے کی طرح آج بھی سوویت حکومت قدیم یادگاروں کی مرمت اور حفاظت ثقافتی نقطۂ نگاہ سے کراتی رہتی ہے ۔ یہ کام بہت بڑے قومی پیمانے پر ہوتا ہے ۔ یونین کا دورہ کرنے والا ہر شخص یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے ۔ مرمت اور تعمیر کا کام، جس سے اسلامی ثقافت کی یادگاروں میں اصل کی طرح دوبارہ خوبصورتی آگئی ہے، بہت سے دیکھنے والوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے ۔ جن یادگاروں کی اس وقت مرمت کی جارہی ہے، ان میں گور امیر، ریگستان کا سلسلۂ تاریخی عمارات، پہلوان محمود گاواں کا مزار، بی بی خانم کی جامع مسجد اور محمود



ماسکو میں فتح کی یادگار محراب



روسی انقلاب اکتوبر کا عجائب گھر

یوسفی کا مقبرہ شامل ہیں ۔

پہلے کی طرح اب بھی حکومت یا اس کا کوئی ادارہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتا اور نہ وہ کسی دینی عقیدے یا رسوم سے سروکار رکھتا ہے ۔ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا انصرام چار آزاد مذہبی بورڈوں کے سپرد ہے ۔ سوویت یونین کے یورپی حصے اور سائبیریا کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز اوفا میں ہے) ، شمالی قفقاز اور داغستان کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز بوئی ناکس میں ہے) ، ماورائے قفقاز کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز باکو میں ہے) اور وسط ایشیا اور کزاخستان کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز تاشقند میں ہے) ۔

ہر مذہبی بورڈ ان قواعد و ضوابط کے مطابق کام کرتا ہے جن کی منظوری اسلامی کنگرسیں دیتی ہیں ۔ کنگرسوں کے جلسوں میں اور ان کے درمیانی وقفوں میں مسلمانوں کے تمام مسائل کو مذہبی بورڈ کی مجلس صدارت طے کرتی ہے جس میں بڑے بڑے مسلمان راہنما اور بڑی مسجدوں کے امام منتخب کئے جاتے ہیں ۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ان حالات میں سوویت یونین کے مسلمان اپنے تمام دینی فرائض اچھی طرح سے بجالاتے ہیں ، مذہبی تہوار مناتے ہیں اور حج کرنے بھی جاتے ہیں ۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ حکومت ان کو حج پر جانے سے روکتی ہے ۔ صرف اتنی بات ہے کہ ان کو قاعدے اور قانون کے مطابق سفر کرنے کی تاکید کی جاتی ہے ۔ یہ دوسرے ملکوں میں دوسرے مقاصد کے لئے جانے کے وقت بھی دی جاتی ہے ۔

" کمیونسٹ ممالک میں مذہب " کے نام سے ایک

رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس میں ایک مضمون حال ہی میں پروفیسر الیکزنڈر بینگس اور شترال لامر کار کیونک پوجے کے قلم سے لکھا ہوا شامل اوراق ہوا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سارے روس میں مسلمانوں کی کل تعداد آٹھ کروڑ ہے جو اس صدی کے آخر تک دس کروڑ ہوجائے گی۔ باقی روسیوں کی تعداد پندرہ کروڑ کے قریب ہوگی۔ گویا مسلم اور غیر مسلموں میں ایک اور ڈیڑھ کی نسبت ہوگی۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ صرف تریسٹھ فیصد مسلمان ارکان اسلام پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ نماز اور روزے کے پابند ہیں۔ حج بیت اللہ کے لئے سفر بھی کرتے ہیں۔ باقی میں سے اکیس فی‌صد کسی پابندی اور دلی عقیدت کے بغیر فرائض مذہب ادا کرتے ہیں اور باقی سولہ فیصد صرف نام کے مسلمان ہیں۔ وہ فرائض تو کجا، عام رسومات اسلامی کا بھی لحاظ نہیں رکھتے۔ اس تشکیل و تفریق سے حکومت نے کھلی آزادی دے رکھی ہے۔ عقائد پر کوئی قدغن نہیں ہے۔

اس طرح ثابت ہوسکتا ہے کہ سوویت یونین میں دین اسلام کے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ نہیں ہوا۔ میرا نقطۂ فکر یہ ہے کہ اسلام کی آفاقیت کو سب سے زیادہ نقصان خود اہل اسلام نے پہنچایا ہے۔ اس وقت عالم اسلام کج رویوں کے باعث جس راہ پر گامزن ہے وہ اسے نہ قرآن کی طرف لے جاتی ہے اور نہ سنت کی جانب۔ درحقیقت اس کی فی‌الحال کوئی منزل مقصود ہے ہی نہیں۔ مرکز سے فرار کوئی انفرادی عمل بھی نہ تھا۔ بلکہ فکری غلامی اور سیاسی اسیری نے التزام و انصرام کے ساتھ اور تدریج و تسلسل کے ساتھ گزشتہ دو سالوں میں اسے لا مرکزیت کے حوالے کیا ہے۔

اس لامرکزیت کے بعد اسے بہرحال کسی منزل مقصود کا تصور کرنا ہی ہے۔ اب وہ اس کی تلاش میں نکلا ہے اس طرح کہ اس کے چاروں طرف ایک نہیں متعدد نظریات و افکار کی یورش ہے اور ان پر مستزاد یہ کہ اس کے لئے سامان عیش و عشرت کی فراوانیاں ہیں۔ وہ تمام طاقتیں کہ جو اسلام کی نشو و نما کے ہر سامان کو تباہ کردینا چاہتی ہیں، ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اگر اپنے افکار کے دامن میں ان مسلمین کو نہیں لاسکتیں تو فی‌الحال ان کو عیش و عشرت کے جال میں پھنسا کر رکھا جائے اور اس جال سے اس وقت تک ان کو باہر نہ نکلنے دیا جائے جب تک ان کے دل و دماغ میں اپنے ماضی کی ذرا بھی رمق باقی ہو اور اپنے دین کی ننھی سی بھی چنگاری ہو۔

آج دنیائے اسلام میں یہ عمل جاری ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ وقت کتنا قریب ہے کہ جب کسی کے لئے خود کو مسلمان کہنا وجۂ شرمندگی ہوگا۔ ایسی بے بسی کی صورت میں روس کے دس گیارہ کروڑ مسلمانوں کیلئے عالم اسلام میں وجۂ کشش آخر کیا ہوسکتی ہے؟ اور ان کو تحفظ دینے کے محرکات آخر کیا ہو سکتے ہیں؟ اس کے برعکس وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کی حکومت یعنی روس کے اثرات اسلامی ممالک میں نفوذ کررہے ہیں۔ عراق و شام کو وہ مزاجاً روسی بنا چکے ہیں۔ مصر کو تہ وبالا کیا جاچکا ہے۔ لیبیا میں اثرات دائم ہو چکے ہیں۔ افغانستان ان کی پوری گرفت میں ہے۔ ایران نے مذہبی بنیادوں میں شگاف ڈال دئے ہیں۔ پاکستان میں بھٹو صاحب نے سوشلزم کے لئے عملاً راہیں ہموار کردی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں

چین نے مسلمانوں کو دین سے دور کردیا ہے ۔ مشرقی پاکستان روس اور پھر چین کی آماجگاہ بن چکا ہے ۔

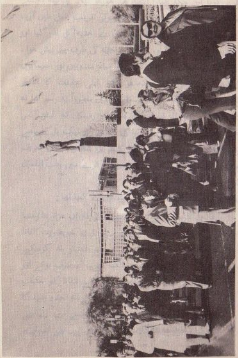
مسلمانانِ عالم کا مستقبل

میری رائے میں ابھی آنے والے پچاس سال تک یہ عمل جاری رہیگا ۔ اگر اس عرصے میں کوئی زبردست تحریک اسلامی نہ اٹھی اورلوگ اپنےکٹے پر نہ پچتائے تو پھر اسلام کے لئے فضا تنگ تر ہوکر رہیگی اور وہ لادینی ہی کو اپنا مذہب قرار دینگے ۔ میں ذاتی طور پر اور اپنے عمیق مشاھدوں کی بنا پر یہ کہ سکتا ہوں کہ مسلمانان عالم اب ہمت ہار چکے ھیں ۔ اب صرف پاکستان ھے جس پر ساری دنیا کی نگا ھیں لگی ہوئی ھیں ۔ دین اسلام نے پاکستان سے اسلامی تحریک کی توقع قائم کی ھے اور تمام غیر اسلامی قوتوں نے پاکستان میں اس قسم کی تحریکات کو سرد کردینے کا عمل قائم کرنے پر کمر باندھ لی ھے ۔ مذھب و دین اور لامذھبیت و لادینی کے مابین ایک ایسی جنگ جاری ھے جو بہ ظاھر لادینی کی فتح پر منتج ہوتی نظر آتی ھے ۔ گزشتہ دنوں میں ڈھاکہ میں تھا ۔ وھاں تحریک دین کا جو حال دیکھا ، اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی ۔ وھاں تبلیغی جماعت کا اجتماع کم از کم دس لاکھ انسانوں پر مشتمل تھا ۔ تاجیکستان میں لادینی نظریہ، حیات لادینی کی فتح ھے جس کی قیادت آج بھی ماسکو کے ریڈ اسکوئر میں مقبرہ، لینن میں لینن کی لاش کو بالکل زندہ انسانوں کی طرح محفوظ رکھ کر کی جارھی ھے ۔

اُف ! بات کہاں سے کہاں جاپہنچی ۔

لینن کو خراجِ عقیدت

ھم سب مہمان خانے سے قطار اندر قطار روانہ ہوئے ۔

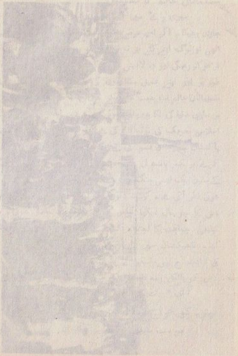


مجسمۂ لینن پر مندوبین کانگرس عالمی صدرالدین عینی کی حاضری ۔

کم از کم پچیس موٹریں تو ہونگی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک مقام پر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ یہ مجسمہ' لینن تھا۔ ہم سب یہاں اتر گئے۔ گویا اس جگہ ہمارا انتظار ہی ہورہا تھا۔ چنانچہ مجسمے کے قدموں میں ہدیہ' گل پیش کرنے کی موثر تقریب عمل میں آئی۔ سب سے پہلے رئیس جمہوریہ' تاجیکستان نے ہدیہ' گل نذر کیا اور دوسرا ہدیہ' گل سفیر ہند اور ان کی اہلیہ کی طرف سے پیش ہوا۔ یہاں چند مقامی خواتین موجود تھیں جو تمام مندوبین اور مہمانوں کو گل دستے دے رہی تھیں تاکہ ہر ایک اپنی عقیدت کا اظہار کرسکے۔ مجھے گل دستہ نہ مل سکا اور میں مجبوراً یہ رسم ادا نہ کرسکا۔ مگر میں یہ اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا کہ لینن کس قدر عظیم انسان تھا کہ اس نے دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اپنے افکار میں رنگ دیا تھا۔ دنیا کا ہر بڑا شخص اس کی تعریف و توصیف میں اور اسے خراج عقیدت پیش کرنے میں رطب اللسان رہا ہے اور اب بھی ہے۔

چین کی قومی حکومت کے سابق صدر سن یات سین نے کہا تھا:

"عالمی تاریخ کی بے شمار صدیوں کے دوران ہزار ہا رہنما اور عالم پیدا ہوئے جنہوں نے بڑے خوبصورت الفاظ استعمال کئے جو کبھی عملی صورت اختیار نہ کرسکے۔ لیکن لینن! تم ان سب سے الگ تھے۔ تم صرف بولتے اور سکھاتے ہی نہیں رہے بلکہ تم نے اپنے الفاظ کو حقیقت کا روپ دیدیا۔ تم نے انسان کو مشترکہ جدوجہد کا راستہ دکھادیا۔ تم نے اس راستے پر، جسے میں نے بھی اختیار کیا، ہزار ہا مشکلات کا سامنا کیا۔ میں بھی تمہارے



ھی راستے پر گامزن ھوں۔ اگرچہ میرے دشمن اس کی مخالفت کرتے ھیں۔ لیکن میرے عوام مجھے اس کے لئے سلام کرینگے۔ تم جلد فوت ھوگئے۔ قسمت نے تمہیں طویل زندگی عطا نہیں کی لیکن محکوم عوام کے حافظے میں تم صدیوں تک زندہ رھو گے، کیونکہ تم ایک عظیم انسان ھو"۔

شہنشاہ ایران محمد رضا خاں پہلوی نے کہا :

"اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ لینن کا فلسفہ ھی سوویت عوام کی ثابت قدمی اور حوصلے اور سوویت یونین کی تمام تر کامیابیوں کی بنیاد تھا۔ لینن کا رول بہت عظیم ھے۔ صرف روس کے عوام ھی لینن کے لئے محبت اور تشکر کے احساسات نہیں رکھتے ایران کے عوام بھی ان کا احترام کرتے ھیں۔ لینن ھی وہ شخص تھے جنھوں نے ایران کے ساتھ زار شاھی حکومت کے غیر مساوی معاھدوں اور استحصال کے خاتمے کا سرکاری طور پر اعلان کیا"۔

برطانوی دانش ور اور مشہور ڈرامہ نویس برنارڈ شا نے کہا :

"ھم کو یہ نہیں سوچنا چاھئے کہ لینن چونکہ اب فوت ھوچکے ھیں، اس لئے ان کا تعلق ماضی سے ھے۔ لینن کی اھمیت اس قدر زیادہ ھے کہ اگر ان کی تحریک اشتراکیت کی ترویج ناکام ھوجائے تو ھماری موجودہ تہذیب کو زوال ھوجائیگا"۔

مشہور جرمن سائنس داں البرٹ فنس تین نے کہا :

"میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے لینن کی عزت کرتا ھوں

جنھوں نے اپنی ساری توانائی مکمل بےلوث قربانی کے ساتھ سماجی انصاف کے لئے وقف کردی تھی۔ ان جیسے انسان نوع انسان کے ضمیر کے محافظ اور رکھوالے ھیں"۔

فرانس کے شہرہ آفاق مصنف رومین رولاں نے کہا :

"انھوں نے انسانی سمندر کی بحرانی لہروں میں ایک مضبوط اور پر اعتماد ھاتھ سے اپنی قوت ارادی کی پتوار کو حرکت دی اور انھوں نے اپنے پیچھے جو نقوش چھوڑے ھیں، وہ صدیوں تک نظر آتے رھیں گے۔ وہ اپنے جہاز کو پوری رفتار سے چلاتے ھوئے تمام طوفانوں سے گزر کر نئی دنیا میں لے آئے۔ لینن ھمارے عہد کے سب سے بڑے باعمل انسان ھیں اور وہ بے غرض ترین انسانوں میں سے ھیں"۔

عوامی جمہوریہ ویت نام کے سابق صدر ھوچی منہ نے کہا :

"عظیم لینن کی بتائی ھوئی شاھراہ پر، انقلاب اکتوبر کی شاھراہ پر، پیش قدمی کرتے ھوئے ویت نامی عوام نے زبردست فتوحات حاصل کی ھیں۔ یہی وجہ ھے کہ شاندار انقلاب اکتوبر کے لئے، عظیم لینن کے لئے اور سوویت عوام کے لئے ویت نامی عوام کے محبت اور تشکر کے احساسات نہایت گہرے ھیں"۔

جمہوریہ کیوبا کے وزیراعظم فیڈرل کاسترو نے کہا :

"ھم ھمیشہ لینن کے زبردست مداحوں میں شامل رھے ھیں۔ تاھم جب ھم نے یہ دیکھا کہ ان کے عوام نے کیا کامرانیاں حاصل کی ھیں اور جب ھم نے سوویت یونین سے

واقفیت حاصل کی تو ہماری نظر میں لینن کی عظمت کئی گنا زیادہ ہوگئی۔ لینن ہمارے لئے لافانی بن گئے"۔

جاپان کی سوشلسٹ پارٹی کے چیرمین تومومی ناریتا نے کہا :

"لینن ہمارے ملک میں انقلاب روس کے وقت سے ایک عظیم ترین شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لینن شاندار دور بینی کے حامل ایک سنجیدہ نظریہ داں کے ساتھ ساتھ ایک پر جوش عملی کارکن بھی تھے۔ دنیا کی پہلی اشتراکی ریاست ان کی قیادت میں وجود میں آئی۔ ہمارے عہد میں اشتراکیت دنیا کے ایک تہائی حصے میں فتح مند ہوچکی ہے"۔

الجزائر کے محاذ قومی آزادی کی مرکزی مجلس کے رکن محمد شے بیلا نے کہا:

"لینن نے افریقہ میں واقعات کے نشو و نما کی جانب خصوصی توجہ دی اور سامراجیوں اور نوآبادکاروں کی ریشہ دوانیوں کی ہمیشہ مذمت کی۔ عظیم انقلاب اکتوبر سے پہلے بھی اپنی بہت سی تحریروں میں انہوں نے افریقہ اور ایشیا کے محکوم عوام کی بیداری کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ عوام کے مضبوط و مستعد اتحاد پر لینن کے اعتماد نے تاریخی عمل کے دوران عوامی انقلاب کی فتح کے لئے فیصلہ کن حیثیت اختیار کرلی۔ الجزائر اور دیگر بہت سے ممالک کی مثال اس کا واضح ثبوت ہے"۔

لینن کے مجسمے کے قریب تقریب بڑی پر شکوہ اور شاندار تھی۔ ایک صاحب نے بڑھ کر سوال کیا : "سفیر پاکستان یہاں موجود نہیں ہیں؟"۔ چونکہ مجھے حقیقت کا علم تھا ، اس لئے میں

نے جواب دیدینا مناسب بلکہ ضروری سمجھا۔ میں نے کہا کہ وہ اپنے سفارتی فرائض کی انجام دہی کے لئے فن لینڈ گئے ہوئے ہیں۔ جواب تو میں نے دیدیا لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ جشن صد سالہ عینی میں سفیر پاکستان کو یا کم از کم ان کے نائب کو ضرور شریک ہونا چاہئے تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ جناب فیض احمد فیض صاحب کی موجودگی پاکستان کی نمائندگی کرتی ہے مگر فیض صاحب اول تو "روسی" ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ "حکومت پاکستان" نہیں ہیں۔ اور یہ عاجز و حقیر نہ کسی شمار میں ہے نہ قطار میں۔ میری شرکت محض ادبی اعتبار سے ہے ، سیاسی رنگ میں نہیں ہے۔

شاہراہ عینی پر تقریب عینی کی مناسبت سے روسی زبان میں سرخ رنگ کے بینر آویزاں کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی کم از کم تین بینر فارسی زبان میں تھے جن کا رنگ سفید تھا اور فارسی رسم الخط بڑا ہی مایوس کن بلکہ ذہن کے لئے تکلیف دہ تھا۔ میرے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ فارسی زبان کے یہ بینر کہ جو کلام عینی پر مشتمل تھے، سرخ کیوں نہیں ہیں؟ اس کا جواب نہ مل سکا۔

ابوعبداللہ رودکی

ہماری دوسری منزل مجسمہ ابوعبداللہ رودکی تھی کہ جہاں اسی انداز سے نذرانہ گل پیش ہوا کہ جو لینن اعظم کے مجسمے پر ملحوظ رکھا گیا تھا۔ میں جب تہران میں تھا تو کنگرس عالمی البیرونی جس ہال میں ہوئی تھی ، وہ رودکی ہال تھا۔ اس وقت میں یہ معلوم نہ کرسکا تھا کہ رودکی کیا ہے ، آج ذہن صاف ہوا۔ رودکی عظیم شاعر ہے۔ اس کا مجسمہ یہاں دوشنبہ میں ہے اور اس

کے نام پر بڑا اہم مقام رودکی ھال تہران میں ہے۔

تیسری سے چوتھی صدی ھجری یا نویں سے دسویں صدی عیسوی تک شمالی مغربی ایشیا میں سا سانیوں کا عہد بڑا شاندار رہا ہے ۔ اگرچہ مدت فرمانروائی ایک سو تیس سال رہی لیکن اس دوران میں بڑے نامور شہنشاہ تخت نشین ہوتے رہے جنھوں نے نہ صرف حکومت کی باگ ڈور سنبھالی بلکہ ادب و شعر ، تاریخ و فلسفہ اور دوسرے علوم کی بھی سر پرستی کی ۔ ساسانی خاندان کا مورث اول اسد بن ساسان تھا جس نے اپنے باپ کے نام پر شاھی خاندان کا نام ساسانی رکھا ۔ اسی خاندان کا ایک فرمانروا نصر بن احمد تھا جس کے دربار میں رودکی نے ملک الشعراء کا خطاب پایا ۔ وہ فارسی شاعری کا بانئی اول کہا جاتا ہے اور وہ پہلا صاحب دیوان شاعر بھی تھا ۔ رودکی کے علاوہ اس دور کے چند اور شاعر بھی بڑے نامور تھے جن میں ایک خاتون رابعہ فرواری بطور خاص قابل ذکر سمجھی گئی ہے ۔ اس عہد کے شاعر اور ادیب شاھی دارالترجمہ سے بھی وابستہ رہے ۔ رودکی ان کا سربراہ تھا ۔ اس کا اصل نام محمد جعفر تھا اور چونکہ نخشب ضلع کے ایک گاؤں رودک کا رہنے والا تھا، اس لئے رودکی کہلانے لگا اور شاعری میں یہی اس کا تخلص بھی ہوگیا ۔ بعض مورخین نے اس تخلص کی وجہ تسمیہ دوسری لکھی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد جعفر اچھا مغنی تھا اور ایک باجہ خوب بجا تا تھا جسے رود کہتے تھے ۔ اس سبب سے لوگ اسے رودکی کہنے لگے ۔ لیکن پہلی وجہ زیادہ قرین قیاس ہے ۔ اس کے نام میں بھی اختلاف رائے ہے ۔

رودکی کے بارے میں ایک عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ یونانی النسل شاعر ہومر کی طرح پیدائشی اندھا تھا لیکن ہومر سے کہیں زیادہ علوم و فنون کا ماہر ثابت ہوا ۔ آٹھ برس کی عمر میں اس نے قرآن مجید حفظ کرلیا تھا ۔ پھر علم قرأت کی تکمیل کی اور اسی وقت سے شعر بھی کہنا شروع کردیا ۔ وہ نہایت لطیف الطبع ، حاضر جواب اور بزلہ سنج تھا ۔ کلیہ و دمنہ کو ، جس کا ترجمہ سنسکرت زبان سے کیا گیا تھا ، منظوم کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے ۔ اس کی قدر و منزلت اور جاہ و ثروت کا یہ عالم تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تو دوسو زریں کمر غلام رکاب کے ساتھ چلتے تھے اور جب دور دراز علاقے کے سفر پر جاتا تو چار سو اونٹوں پر اس کا سامان لاداجاتا تھا ۔

رودکی نہایت پرگو شاعر تھا ۔ رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے ، البتہ بیشتر حصہ آج نایاب ہے ۔ اقسام سخن میں سے اس کے ھاں سب کچھ موجود ہے ۔ قصیدہ ، رباعی ، قطعہ ، غزل ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ ۔ اس کے کلام میں مثنوی کی مثال ذرا مشکل سے ملیگی ۔ لیکن حکایت کلیلہ و دمنہ ، جسے سنسکرت کے ترجمے سے منظوم کیا گیا ہے ، مثنوی ھی کی صف میں شمار ہوسکتی ہے ۔

اس کی شاعری کا عام انداز واقعہ نگاری ، پند و موعظت اور حسن تاثیر تھا اور یہی عربوں کے عہد جاهلیت کا اصل جوھر سمجھا جاتا تھا ۔ اس نے عشق و محبت کی داستان سرائی سے اجتناب نہیں کیا بلکہ اس ضمن میں درجۂ کمال حاصل کیا ۔ اس نے ایسی ایسی تشبیہات وضع کیں جو بعد میں فارسی شاعری کے لئے

طرۂ امتیاز ہوگئیں ۔ اس کی ایک غزل کا مطلع ہے :

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را
شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را

عنصری جیسے ماہر فن شاعر تک نے رودکی کے کمالات کا اعتراف کیا ہے ، خصوصاً اس کے قصائد کا لوہا مانا ہے۔ قصیدے کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے جسے تشبیب کہتے ہیں ۔ رودکی اس انداز بیان کا خاص ماہر تھا ۔ مثلاً ایک باغ کی تعریف کی جارہی ہے ، محبوب باغ کو دیکھکر کہتا ہے کہ تو بہشت ہے ۔ اس کے جواب میں رودکی کہتا ہے کہ بہشت نہیں باغ ہے لیکن خدا کی بہشت کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے اور یہ علانیہ ہم سب کے سامنے موجود ہے ۔ گویا یہ نقد ہے ، وہ ادھار ہے ۔ یہ ظاہر ہے وہ مخفی ہے ۔ وہ نماز پڑھنے سے ملتی ہے اور یہ اس کی مدح کرنے سے ۔ وہ خدا کا عطیہ ہے اور یہ بادشاہ کا ۔ اس سے ہم اپنی زندگی میں لطف اندوز ہوسکتے ہیں اور اس سے مرنے کے بعد۔ اس نے تینتیس شعروں کا ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس کا ہر شعر مطلع ہے ۔ یہ طرز سخن کسی کو نصیب نہیں ہوا ۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بصارت بالکل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا مشاہدہ اتنا تیز تھا کہ دیدہ‌ور بھی اس کے سامنے مات کھاجاتے تھے۔ شراب کی تعریف میں کہتا ہے کہ شراب اور عقیق دونوں ایک ہی چیز ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ ایک سیال ہے ، دوسری منجمد ۔ شراب کے رنگ اور کیفیت کا یہ عالم ہے کہ اسے چھوئے بغیر ہی ہاتھ رنگین ہوجاتے ہیں اور بے چکھے دماغ پر اثر کرتی ہے ۔ عقیق میں یہ خوبیاں کہاں ہیں ۔

اس کے کلام کی بے پناہ تاثیر ضرب المثل ہوگئی تھی ۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ قلم بند کیا ہے ۔ لکھتے ہیں:

نصر بن سا سانی نے ایک دفعہ ہرات کا سفر کیا اور بادغیس میں جوکہ ہرات کی مشہور نزہت‌گاہ ہے ، پڑاؤ ڈالا ۔ بہار کے دن تھے اور تمام دشت و صحرا چمن زار بن گیا تھا ۔ نصر ان دل فریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گزر گئی ۔ جاڑے آئے تو میووں کی بہتات ہوئی ۔ ان اطراف میں ایک سو بیس قسم کے انگور ہوتے ہیں جن میں ترنیاں اور کلنجدی نہایت خوش مزہ ، شاداب اور نرم ہوتے ہیں ۔ نصر صحرا سے اٹھکر آبادی میں آیا اور درواز میں ، جو ایک مشہور مقام ہے ، قیام کیا ۔ یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے ۔ ہرطرف عالی شان قصر و ایوان اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائیں باغ ہوتا تھا ۔ اسی زمانے میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی ۔ نصر نے جاڑے بھی یہیں گزارے ۔ ہر دفعہ قصد کرتا تھا کہ اب کی بہار گزرنے پر روانہ ہوجاؤں گا لیکن جب ایک موسم گزرجاتا تھا تو دوسرا زنجیر پا بن جاتا تھا ۔ اسی طرح پورے چار سال گزرگئے ۔ امراء اور فوج کے لوگ تنگ آگئے ۔ تاہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے ۔ آخر رودکی کے پاس گئے اور پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں کہ بادشاہ یہاں سے بخارا واپس چلا جائے ۔ اگلے روز رودکی دربار میں گیا ۔ نصر شراب پی رہا تھا ۔ رودکی نے ساز کے ساتھ عشاق کی دھن میں یہ اشعار گائے :

بوئے جوئے مولیاں آید همے — یاد یار مہرباں آید همے
ریک آموی و درشتیہائے او — زیر پایم پرنیاں آید همے
آب جیحوں باهمه پهناوری — خنگ مارا تامیاں آید همے
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاه سویت مهماں آید همے
شاه سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید همے
شاه ماه است و بخارا آسماں — ماه سوئے آسماں آید همے

یہ سن کر نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اسی وقت سوار ہو کر بگ ٹٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا پوری ایک منزل پر جا کر دم لیا ۔

رودکی نے ۳۰۴ ہجری میں وفات پائی ۔ اس کا دیوان پہلی بار ایران میں چھپا اور پھر چھپتا ہی رہا ۔ اب بھی اس کی بڑی مانگ ہے ۔ دوشنبہ میں اگر اس کا مجسمہ نصب کیا گیا تو وہ اس کا مستحق تھا ۔

ترسون زادہ کے مزار پر

اس کے بعد تمام مندوبین مرزا ترسون زادہ کے مزار پر ہدیۂ گل پیش کرنے اور فاتحہ پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے ۔ فیض احمد فیض صاحب نے مجھے بتایا کہ مرزا ۱۹۴۹ء میں پاکستان آئے تھے ۔ میری ملاقات ان سے تقسیم برصغیر سے ایک سال قبل دہلی میں ہوئی تھی جب وہ ایشین کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے ۔ لیکن وہ ملاقات سر سری تھی اور جب پاکستان آئے تو میں خود پاکستان سے باہر شاید قاہرہ (مصر) میں تھا ۔ میں ان کی شخصیت اور ان کی تحریروں یا شاعری سے زیادہ واقف نہیں ہوں ۔



مزار ترسون زادہ پر گل ہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے مندوبین جارہے ہیں ۔



مجسمۂ فردوسی سے قریب مندوبین

ان کے مزار پر پہنچ کر مجھے اپنی علمی کم مائگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔

مزار عینی پر

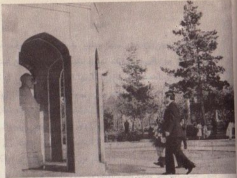
اس کے بعد ہم سب لوگ باغ عینی میں پہنچ گئے۔ یہاں صدرالدین عینی کا مزار ہے۔ مزار پر ان کا مجسمہ بھی ہے۔ یہاں لوگوں کی عقیدت کا کیا ٹھکانا تھا۔ ہم سب جشن عینی کے سلسلے میں وہاں جمع ہوئے تھے۔ بڑا جوش و خروش ظاہر ہورہا تھا۔ یہاں بھی خواتین گلدستے لئے کھڑی تھیں اور مندوبین کو دے رہی تھیں۔ میں نے ایک نہیں دو تین گلدستے لے لئے۔ جب تمام سرکاری گل پاشی ختم ہوگئی تو میں نے سب سے آخر میں ان کے مزار پر پھول رکھے اور پھر میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ پوری عقیدت اور قاعدے کے مطابق فاتحہ خوانی کی۔ ظاہر ہے کہ مجھے مجسمے کے مقابلے میں مزار کو ترجیحی حیثیت دینی چائیے تھی۔ اور ایک مسلمان کے مزار پر گل پوشی سے زیادہ فاتحہ خوانی ضروری ہوتی ہے۔ شاید ٹیلے وژن والوں کے لئے میری یہ حرکت عجوبہ روزگار تھی۔ انہوں نے مجھے دل بھر کر فلما لیا۔ میرے علاوہ کسی نے اس انداز سے فاتحہ خوانی نہیں کی۔ البتہ محترمہ عصمت چغتائی کا انداز فاتحہ خوانی کا تھا مگر اس وقت ان کے طریقے میں ایک حیا تھی اور حجاب تھا اور یہ ان کے اصل مزاج اور افتاد طبع سے مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

باغ عینی میں صدرالدین عینی کی بیوہ بھی موجود تھیں۔ ان کے بیٹے کمال صدرالدین عینی بھی ساتھ تھے۔ ان کے نواسے

نواسیاں ، پوتے ' پوتیاں ، بہو اور داماد سبھی تھے - بیوہ' عینی بڑی ضعیف ہیں - میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا - ان سے ہاتھ ملایا - ان کی بہو اور بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا - مندوبین یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور فلم برابر کھنچتا رہا - میں نے دل میں سوچا کہ یہ خاتون کس قدر خوش قسمت ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کے شریک حیات کی یہ قدر و منزلت ہوئی ہے - میں نے ان کے چہرے پر نور مسرت دیکھا - میں نے خواہش ظاہر کی کہ ایک تصویر اس خاندان کے ساتھ کھنچ جائے تو اچھا ہو - استاد عبداللہ جان غفاروفے صاحب نے بالآخر اس کا انتظام کردیا -

اس موقع پر وہاں شجر کاری کی رسم بھی ادا ہوئی - میں اس میں حصہ نہ لے سکا - میری توجہ کا مرکز خاندان عینی تھا - بالآخر یہ تقریب ختم ہوئی -

ہاں اس باغ عینی میں ہمارے دوست عالیجناب با با جان غفوروف بھی ابدی نیند سو رہے ہیں - آج کے پروگرام میں ان کے مزار پر فاتحہ خوانی کا کوئی ذکر نہیں تھا اور جب میں نے کہا کہ مجھے تو فاتحہ خوانی ضرور کرنی ہے تو کہا گیا کہ ہم آپ کو یہاں کسی اور دن الگ لے آئیں گے - لیکن میں نے دیکھا کہ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ با با جان کا مزار یہاں ہے تو سب ہی مندوبین اس طرف متوجہ ہوئے اور گل فشانی کی رسم بھی ہوئی - میں نے تین گلدستے اسی خیال سے لئے تھے - چنانچہ ان میں سے ایک با با جان کے مزار پر چڑھانے کے لئے بچا لیا تھا - گزشتہ بار جب میں دوشنبہ آیا تھا تو اکیڈمی آف سائنسز میں سب سے نمایاں تصویر و تعارف جس شخصیت کا کرایا گیا،



مزار صدر الدین عینی -

مزار صدرالدین عینی پر گل ہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے مندوبین کنگرس عالمی صدر الدین عینی پہنچ رہے ہیں - گل ہائے عقیدت جناب سلیموف (سکریٹری ، از بکستان کمیونسٹ پارٹی) اورجناب مارخوف اٹھائے ہوئے ہیں-

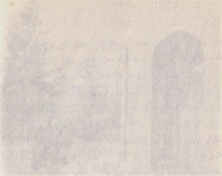


وہ صدرالدین عینی کی تھی ۔ پھر جناب با با جان غفوروف صاحب نے بھی، جو اس وقت زندہ تھے، ماسکو میں صدرالدین عینی کے بارے میں بڑی اھمیت کے ساتھ بتایا تھا اور ان کی تعریف کی تھی ۔ معاً مجھے یاد آیا کہ اس وقت میں نے با با جان سے کہا تھا کہ مناسب معلوم ھوتا ھے کہ عینی کی نگارشات کے ترجمے اردو زبان میں ھوجائیں ۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مٹیریل مجھے بھجوائیں گے مگر بعد میں یہ کام نہ ھوسکا ۔ اب مجھے بڑی شدت کے ساتھ احساس ھورھا تھا ۔ اگر میں اس کام پر توجہ کرلیتا تو پاکستان میں عینی اب سے بہت پہلے روشناس خلق ھوجاتے ۔

غفوروف کے اھل خاندان کے ساتھ

با با جان غفوروف کے مزار پر ان کی اھلیہ اور ان کی ھمشیرہ سے ملاقات ھوئی ۔ میں نے اظہار افسوس کیا ۔ بیوی اور بہن دونوں متاثر ھوئیں ۔ ان کو میرے بارے میں معلوم تھا کہ با با جان سے میرے تعلقات کیا تھے ۔ گزشتہ بار (۱۹۷۰ء) میں نے ان کے گھر جانے کی سعی کی تھی، مگر انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی، کیونکہ وہ خود پہل کرنا چاھتے تھے ۔ چنانچہ وہ ھوٹل میں دوبارہ ملاقات کے لئے آئے ۔ میں ان کے گھر نہ جا سکا ۔

مجھے یاد ھے ۔ ھوٹل میں وہ ایک دن آئے تو آتے ھی کہا : ''میں آج آپ کے ساتھ کھانا کھاؤنگا'' با با جان ھوٹل کے ھنگاموں سے بہت گھبراتے تھے اور سگریٹ کے دھوئیں سے ان کو سخت نفرت تھی ۔ جمیل‌الدین عالی صاحب سے میں نے مشورہ کیا ۔





مسئلہ یہ تھا کہ ہم اس شام سفیر پاکستان جناب محترم سجاد حیدر صاحب کے ھاں کھانا کھارہے تھے ۔ میں نے فوراً سفیر صاحب کو فون کیا ۔ اس اثنا میں جمیل‌الدین عالی صاحب نے با با جان کو باتوں میں مصروف رکھا ۔ سفیر صاحب نے اجازت دی کہ بابا جان غفوروف صاحب کو بہ خوشی سفارت خانے میں لے آئیں ۔ وہ بھی ھمارے ساتھ کھا نا کھائیں گے ۔ یہ طے ھوجانے کے بعد ہم نے با با جان کو بتادیا کہ ھم تو آج اپنے سفیر پاکستان کے ھاں مدعو ھیں ۔ انہوں نے فرمایا : ”کیا میں وھاں چل سکتا ھوں ؟ “ میں نے کہا : ” بہ سرو چشم ۔ سفیر پاکستان آپ کا وھاں استقبال کرینگے ۔ “

روس میں پابندیاں

روس میں لوگوں پر شدید پابندیاں ھیں ۔ کسی سفارت خانے میں اجازت کے بغیر کوئی نہیں جاسکتا اور کوئی دعوت قبول نہیں کرسکتا ۔ دعوت نامے روس کی وزارت خارجہ کو دئے جاتے ھیں اور اگر مناسب ھوتا ھے تو اس کی معرفت مدعوئین کو ملتے ھیں ورنہ ضائع کردئے جاتے ھیں یا پھر داخل دفتر ھوجاتے ھیں۔ ھم واقعی بڑے حیران ھوئے کہ با با جان کس طرح فوراً راضی ھوگئے ۔ یہ ان کا بلند مرتبہ تھا کہ وہ اس قسم کی پابندیوں سے لاپروا تھے ۔

محترمہ روح افزا کی مہماں نوازی

ھمارے سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر اور ان کی بیگم

محترمہ روح افزا نے با با جان کا پر جوش استقبال کیا ۔ سفیر صاحب با با جان غفوروف کی عظمت کے پہلے سے معترف تھے اور ان کے بلند مقام سے پوری طرح واقف تھے ۔ جناب سفیر صاحب نے ان کی جس قدر تواضع کی میں اسی قدر مسرور ھوا ۔ کیوں نہ ھوتا ، با با جان میرے دوست تھے ، بزرگ تھے اور مربی و محسن تھے ۔ یونیسکو میں انجمن سنٹرل ایشیا کے جلسوں میں وہ مجھے بلائے جانے کے محرک ھوا کرتے تھے ۔ آخری بار میکسیکو میں یونیسکو کی اس انجمن کا جلسہ ھوا تھا اور وھاں سے مجھے شرکت کی دعوت ملی تھی ۔ اس جلسے میں یونیسکو کے ڈاکٹر نجم‌الدین بامات صاحب نے کہا تھا : ”ھم نے حکیم سعید اور ھمدرد کا قرار واقعی شکریہ ادا نہیں کیا ھے کہ جو انہوں نے یونیسکو سے تعاون کیا ھے“ ۔ با با جان صاحب صدر جلسہ تھے ۔ انہوں نے بھی میری پوری تعریف کی تھی ۔ مجھے خوب یاد ھے کہ میکسیکو میں با با جان نے اپنے ھوٹل میں ملاقات کے لئے مجھے بلایا اور مجھے کئی ھدیے دئے ۔ ان میں ایک گھڑی بھی تھی جو میں نے لندن میں اپنے مطب میں رکھ دی ھے ۔

تاجیکی پلاؤ

جب کھانے کا وقت آیا اور ھم سب کھانے کی میز پر گئے تو با با جان نے ایک گٹھڑی اٹھالی جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے ۔ کھانے کی میز پر گٹھڑی ان کے ساتھ رھی ۔ پھر انہوں نے کان میں مجھسے پوچھا : ” اگر میں کھانے کی کوئی چیز یہاں پیش کروں تو قابل اعتراض تو نہیں ھوگا“۔ میں نے

کہا : ''ہرگز نہیں'' ۔ سفیر صاحب نے بھی تائید کی ۔

بابا جان نے وہ گٹھڑی کھولی اور فرمایا : ''میں آپ کے لئے تاجیکی پلاؤ پکوا کرلایا ہوں'' یہ بابا جان کا انداز خلوص و محبت تھا ۔ ہم سب نے بڑے لطف کے ساتھ تاجیکی پلاؤ کھایا ۔ بابا جان کو کیلے بڑے مرغوب تھے ۔ سفیر صاحب کے ہاں شاید امریکی کیلے تھے ۔ بابا جان نے صرف دو کیلے نوش جان کئے ۔ ذرا سی مٹھاس بھی کھائی ۔ کھانے کے بعد ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ میں بابا جان کے لئے ہدایا لایا تھا ۔ ایک سوٹ کا کپڑا ان میں شامل تھا ۔ یہ میں نے جناب سفیر صاحب کی موجودگی میں ان کو پیش کردئے ۔ اس طرح یہ تقریب بہت اچھی ہوگئی ۔

باغ عینی میں جب مزار بابا جان پر ان کی اہلیہ ملیں تو میں نے اپنے ہاتھ پر بندھی ہوئی وہ گھڑی ان کو دکھائی کہ جو ان کے شوہر نے مجھے کوئی چار پانچ سال ہوئے دی تھی ۔ وہ پاکستان کے سرکاری دورے پر تھے اور حکومت پاکستان ان کی میز بان تھی ۔ کراچی میں درحقیقت میں ان کا میز بان تھا ۔ میں نے اسلام آباد میں بھی ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ مرتب کیا تھا ۔ یہ وہ موقع تھا کہ وہاں سائنٹی فک سوسائٹی پاکستان کا جلسہ تھا ۔ بابا جان نے بھی اس میں شرکت کی تھی ۔ میں نے لاہور میں بھی دفتر ہمدرد کو بابا جان کے لئے مستعد کر دیا تھا ۔

خسرو کمیٹی میں شرکت

امیر خسروئے دہلوی سے بابا جان کو بڑا خصوصی تعلق



حکیم محمد سعید اکیڈیمیشین بابا جان غفوروف کے مزار پر ، ان کی اہلیہ اور بہن اور دوسرے مندوبین کے ساتھ ۔

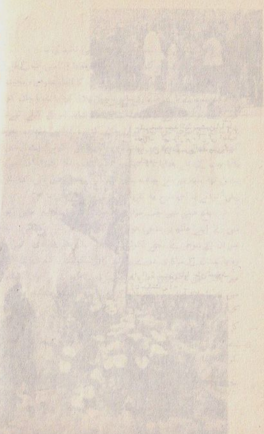


مزار اکیڈیمیشین بابا جان غفوروف (تاجیکستان) ۔

تھا - پاکستان میں جشن خسرو کے لئے ایک نیشنل کمیٹی کی تشکیل ہوئی تھی - اس میں اراکین وہ تھے کہ جن کو حضرت امیر خسرو دہلوی سے دور دور کا کوئی واسطہ نہ تھا - بس کمیٹی ان لوگوں سے مرتب ہوئی تھی کہ جو پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے - حیرت ہے اس کمیٹی میں پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تک نہ تھے اور تعجب ہے کہ اس کمیٹی میں پرو فیسر وحید مرزا صاحب بھی نہ تھے جو امیر خسرو پر ایک بہترین کتاب کے مصنف کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں اور یہ کہ پاکستان میں امیر خسرو دہلوی پر ان سے زیادہ کوئی اتھارٹی نہیں ہے - اس کمیٹی میں میرا وجود کیوں ہوتا - با با جان نے پوچھا : " آپ کیوں اس کمیٹی میں نہیں ہیں ؟"

میں ان کو کیا جواب دیتا - میں نے احتیاط سے بات کو ختم کردیا مگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ با با جان نے جب وزیر اعظم پاکستان سے ملاقات کی تو ان پر زور دیا کہ خسرو کمیٹی میں حکیم محمد سعید کو رکھا جانا چاہئے - چنانچہ بعد میں کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور میرا نام شامل تو کرلیا گیا، مگر ہوا یہ کہ اس کمیٹی کے کسی جلسے میں مجھے نہیں بلایا گیا اور نہ ہی مجھے کسی جلسے کا دعوت نامہ ملا - سنا ہے کہ اس جشن خسرو پر کوئی ستائیس اٹھائیس لاکھ روپے خرچ ہوئے اور کتابیں جو چھپیں، وہ اس درجہ غلط تھیں کہ آج تک پریس میں پڑی ہیں -

پھر اس بین الاقوامی کنگرس کے انتظام کا حال یہ تھا کہ روسی وفد آکر کراچی میں پڑگیا - اس کا کوئی سواگت کرنے والا نہ تھا - فرینڈ شپ ہاؤس کے مسٹر شن شین نے مجھ سے رابطہ



قائم کیا اور میں ھوائی میدان گیا ۔ وفد کا استقبال کیا ۔ اس کو ٹھیرایا اور میں نے ھمدرد فاؤنڈ یشن کے مہمان کی حیثیت سے آسے اسلام آباد روانہ کیا ۔

اس کنگرس کے آخری اجلاس میں ایک دانش ور بزرگ و پیر نے یه گوھر افشانی کی — امیر خسرو شاعر ھی کب تھا ۔ اس نے فارسی کے چند اشعار کہے اور وہ بھی غلط ۔ امیر خسرو تو شاھوں کی خوشامد کرتا تھا ۔

اس گوھر افشانی پر فیض احمد فیض جیسے سخت شاعر بھی جلسے سے اٹھکر چلے گئے ۔ اس وقت کے سفیر ایران نے مجھ سے کہا که امیر خسرو کی آپ کے ھاں بس یه قدر ھے جو آج شام ھوئی ھے ۔ میں سخت شرمندہ ھوا اور شرمسار بھی ۔

روس میں با با جان غفوروف کے زیر اهتمام دوشنبه اور ماسکو میں جشن امیر خسرو ئے دھلوی منایا گیا ۔ میں اس میں شریک ھوا تھا ۔ با با جان نے مجھے یه اعزاز دیا تھا که جب اختتامی اجلاس ماسکو کی انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈ یز میں ھورھا تھا تو مجھے انھوں نے اپنے ساتھ اسٹیج پر جگه دی اور اصرار کیا که میں اختتامی تقریر کروں ۔ پاکستان میں جشن خسرو میں میرے ساتھ سلوک یه ھوا که کنگرس میں مدعو نهیں کیا گیا ۔ روس نے میرے ساتھ یه سلوک کیا که نه صرف مجھے دعوت دے کر بلایا بلکه جشن خسرو کا اختتام بھی مجھ سے کرایا ۔ اس تقریب میں سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر صاحب بھی موجود تھے ۔

پاکستان میں یه ستائیس اٹھائیس لاکھ رپے کس مد میں خرچ ھوئے ؟ ۔ امیر خسرو کو ایک گویا بنانے پر !

سمجھ میں آتی اور میں ساری کتاب سے استفادہ کرسکتا ۔ میں نے کتاب کے شروع میں خالی صفحات پر تمام مندوبین کے دستخط لینے کی مہم شروع کردی ۔ رئیس جمہوریه اور وزیر اعظم بنی یوف وغیرہ سے لےکر هر مندوب نے دستخط کر دیئے ۔ اس طرح اس جلسه کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ھو گئی ۔

رات ساڑھے دس بجے میں واپس مہمان خانے میں آ گیا اور کتاب کو اچھی طرح دیکھنا شروع کردیا ۔ انگریزی زبان میں لکھا ھوا عاصموف صاحب کا پیش لفظ بھی پڑھ ڈالا ۔ میں نے صدرالدین کے بارے میں کافی مطالعه کرلیا تھا اور اسی مطالعے کی بنیاد پر اپنا مقاله تیار کیا تھا لیکن اس پیش لفظ نے میری معلومات میں مزید اضافه کیا اور مجھ کو متاثر بھی کیا ۔

صدرالدین عینی

فارسی تاجیکی ادب عالیه نےدری (قدیم فارسی) زبان میں فروغ پایا ۔ اس ادب عالیه کے نام لیوا سوویت تاجیکستان کے مصنفین ھیں ۔ گذشته ایک هزار سال سے زیادہ مدت میں اس علاقے کی قیمتی فنی روایات نے اتنی ترقی کی که ممالک شرقیه میں رهنے والی قوموں نے اپنی ثقافت کو ان سے مالا مال کرلیا اور اس کا اثر مغربی ادب تک جا پهنچا ۔ سب جانتے ھیں که عظیم اطالوی شاعر گوئٹے فارسی تاجیکی ادب عالیه کا سب سے بڑا قدر دان تھا ۔ اس نے اس کا صرف مطالعه ھی نهیں کیا بلکه اس سے پوری طرح استفادہ کرتے ھوئے اپنے خیالات میں رنگ بھی بھرا ۔ اس ضمن میں اور بھی مغربی مصنفین کے نام لئے جاسکتے ھیں ۔ ان کی نگارشات عالمی ادب کے خزانے کی قدر و منزلت بڑھاتی ھے ۔

صدر الدین عینی نے اپنے ثقافتی ورثے کی روایات کا محض سلسلہ جاری رکھنے ھی میں اعانت نہیں کی بلکہ اس میں نئی زندگی کی روح پھونک کر اسے چار چاند لگا دیئے۔ اس کے معمولی کاشتکار باپ کی دلی تمنا یہی تھی کہ اس کا ہونہار بیٹا عالم و فاضل ہوکر دنیا میں نام پیدا کرے اور وہ ابنائے وطن میں کسی طرح بلند مقام حاصل کرلے۔ چنانچہ وہ اپنے زمانۂ طفولیت ھی سے ان روایات کا قدردان ہوگیا۔ محض ایک معمولی باپ کے بیٹے کی حیثیت سے وہ جب عوامی تہواروں میں شریک ہوتا اور لوک گیت سنتا تو اس کے دل میں ایک آہنگ پیدا ہوتی کہ وہ خود بھی شاعر بنے اور بہتر گیت ترتیب دے۔ وہ بارہ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اور زندگی بسر کرنے کا کوئی قریبی سہارا باقی نہ رہا تو وہ اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہہ کر بخارا چلا گیا جو ان دنوں جملہ علوم و فنون کا مرکز تھا اور جہاں علم و ادب کی تلاش میں سرگرداں رہنے والوں کی ہمت افزائی عوام کی طرف سے کی جاتی تھی۔ امیر مملکت کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

ذوق و شوق کی فراوانی نے بہت جلد عینی میں خوشہ چینی کی صلاحیت پیدا کردی۔ وہ غزلیں اور نغمے لکھنے لگا۔ پھر جدت طرازی نے نئی راہ عمل دکھائی اور اس کے کلام میں انفرادیت پیدا ہوتی گئی، جس پر ہر طرف سے خراج تحسین ملنے لگا۔ ارباب علم نے بھی اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو سمجھ لیا تھا۔ اسی دوران میں عینی کو احمد دانش کی قابل قدر تصنیف "نوادر الوقائع" دیکھنے کا موقع ملا جس میں امیر بخارا کے

ظلم و ستم کو اور مذموم طریق کار کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ اس مطالعہ سے عینی نے پہلی بار اپنے دل و دماغ میں روحانی انقلاب کو فروغ دینے کا سلیقہ پالیا اور وہ ایک نئی راہ عمل پر چل پڑا۔

اس نے خیال ظاہر کیا کہ نئی کتب نصاب کی ترتیب اس انداز سے کی جائے کہ نئی نسل کے نوجوان اپنے مذہب سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاست کو پوری طرح سمجھنے کے لائق ہوجائیں۔ پھر روس میں اکتوبر کا عظیم اشتراکی انقلاب رونما ہوا تو گویا عینی کی مراد بر آگئی۔ اس نے بلا تامل اس تغیر کو لبیک کہا اور اسے فروغ دینے میں برابر کا شریک ہوگیا۔ اس وقت وہ سرکاری موقف کے بموجب باغیانہ سرکشی کی پاداش میں جیل کے اندر بند تھا۔ نئے انقلاب نے نہ صرف اجتماعی طور پر ساری قوم کو بلکہ انفرادی طور پر اسے آزادی دے دی اور وہ کھل کر سامنے آگیا۔ جیل میں روا رکھے جانے والے غیر آئینی تشدد نے جو بد نما داغ اس کے جسم پر چھوڑے تھے، وہ آخر عمر تک برقرار رہے۔ یہ ذاتی تلخ تجربات بھی اس سے ساری عمر شعلہ نوائی کراتے رہے۔

انقلاب کے بعد روسی ادب سے عمیق اثرات حاصل کرنے کا موقع ملا، جنکی جھلک عینی کی بعد کی تحریروں میں نمایاں رہی اور جس نے دنیا کے عظیم مصنفین کی صف میں اسے لا کھڑا کیا۔ اس نے اپنے خیالات کو سب سے زیادہ میکسم گورکی سے ہم آہنگ کیا اور اس نے تلوار کی دھار سے زیادہ قلم کی روانی کو کارگر سمجھ لیا۔ اس نے زور دیا کہ زبان سے نکلے ہوئے یا قلم سے

لکھے ہوئے الفاظ کی کاٹ تیر و نشتر کی جراحت سے زیادہ سریع الاثر اور دور رس ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے تاجکی صحافت کی صحیح خطوط پر داغ بیل ڈالی اور قومی اخبارات کو آزاد خیالی کی راہ پر چلنے کی تلقین کی جس میں وہ خاطر خواہ کامیاب رہا۔ اس کی کوئی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

خود اس کے منظوم و منثور رشحات قلم نے ایسے نقوش کا پرچم بلند کیا۔ اس کی تمام تصانیف میں یہی ایک جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اس نے نہایت پرجوش الفاظ میں غریب عوام کو اپنی حقیقت اور قدر و قیمت سمجھنے اور اپنے پندار کو رفعت دینے کا سبق دیا۔ اس کی یہ سعی و کاوش کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی، جس کے ذریعہ سے اس نے، اپنے درد دل کو عوام پر مسلط کرکے، انہیں ایک لمحۂ فکر دیا تھا۔

اس کے ناولوں کے کردار جیتے جاگتے انسان ہوتے تھے اور انہیں پڑھنے والا اپنے حالات کی جھلک ان میں پا کر سمجھتا کہ خود اس کے خیالات کی ترجمانی عینی نے اپنے الفاظ میں کی ہے۔ اس طرز پر لکھنے والے جلال اکرامی اور رحیم جلیل وغیرہ اس کے ہم عصر تھے لیکن درجۂ کمال کی جاذبیت، جو عینی نے اپنی تحریروں میں پیدا کی، وہ کسی کو نصیب نہ ہوسکی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ عینی نے وفور جذبات کے تحت ہر بات دل کی گہرائی سے نکال کر خون دل سے گرما کر اپنی معجز بیانی سے کام لے کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دی تھی۔ اس اعتبار سے کوئی بھی اس کا مد مقابل نہ ہوسکا۔ وہ اپنی انفرادیت کا رنگ دے کر جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر گیا۔

ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے۔ حال ہی میں اس کی نگارشات کا ایک مکمل مجموعہ پندرہ جلدوں میں شائع ہوا ہے جسے صد سالہ تقریبات کے پروگرام کا سب سے اہم جزو بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس کی قدر و منزلت کا ایک مناسب اعتراف ہے۔

یہ نوٹ لکھکر میں ایک بجے شب سوگیا اور صبح اٹھا تو کلینڈر پر نظر پڑی۔ یہ دیکھکر حیران رہ گیا کہ اتوار کا دن ہے۔ گویا پرسوں جمعہ گزر گیا تھا اور جمعہ کی نماز کا خیال تک نہ آیا تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ اپنی ڈائری میں بھول کر غلط دن لکھ دیا۔ جس دن ہم ماسکو سے روانہ ہوئے، وہ جمعہ ہی تھا۔ نماز جمعہ ہوائی جہاز میں کیسے پڑھی جاتی۔ روانگی کے وقت خیال تھا کہ ہم وقت پر پہنچ گئے تو میں جمعہ کی نماز دوشنبہ کی کسی مسجد میں ادا کرونگا۔

نوریک کی سیر

اب نوریک کی سیر کا پروگرام تھا۔ میرے لئے یہ سیر نئی نہیں تھی۔ میں ایک بار پہلے یہاں آچکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس علاقے کو دوبارہ دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ فیض احمد فیض صاحب اور سردار جعفری صاحب دونوں اپنے بستروں میں دبک گئے۔ یہ دونوں کل کے پروگرام کے بعد تھکن محسوس کر رہے تھے۔ موسم کم از کم میرے لئے بڑا شاندار تھا۔ کل تمام دن بڑی گرمی رہی تھی اور آج موسم بدلا ہوا تھا۔ کل عاصموف صاحب نے پوچھ ہی لیا تھا کہ ”آپ کو گرمی تو نہیں

لگ رہی‘‘ ۔ میں نے جواب دیا : ’’میں سرد و گرم چشیدہ ہوں ، آپ پروا نہ کریں !‘‘

شب گزشتہ جب ہم ڈنر سے فراغت پاکر واپس آرہے تھے تو سفیر ہند نے اصرار کیا کہ ماسکو میں ضرور میرے ہاں کھانے پر آئیے گا ۔ آپ سے باتیں ہونگی ۔ سفیر صاحب اندرا حکوت میں وزیر رہ چکے تھے ۔ وہاں یہ ہندستان کی غالب اکیڈمی کے صدر بھی تھے ۔ اس لئے میرے بڑے بھائی جناب حکیم حاجی عبدالحمید سے قریب تھے ۔ غالب اکیڈمی کے بارے میں بھائی جان محترم اور حکومت ہند میں اختلاف ہوگیا تھا ۔ بھائی جان غالب اکیڈمی قائم کرچکے تھے ۔ حکومت ہند اسے روکنا چاہتی تھی ۔ بھائی جان نے پہل کردی ۔ رات دن میں عمارت تعمیر کرادی اور جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ، صدر جمہوریہٴ ہند سے اس کا افتتاح بھی کرادیا ۔ سرکاری اکیڈمی منہ دیکھتی رہ گئی ۔

رات سے جو بارش ہورہی تھی ، اس کا سلسلہ صبح تک جاری رہا ۔ اس طرح موسم قدرے سرد ہوگیا تھا ۔ سب تیاری مکمل ہوگئی تو دس بجے دو شنبہ سے نوریک روانہ ہوگئے ۔ سات آٹھ موٹریں تھیں ۔ آگے آگے موٹر ہائی وے انسپکشن کی کار تھی جس کا کام حفاظتی اقدامات تھا ۔ اس کار کے گزرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دوسری تمام گاڑیاں جو سڑک پر چل رہی ہیں ، ایک طرف ہوکر رک جائیں بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاں فائر بریگیڈ کے انجن کے گزرتے وقت ٹریفک رک جاتا ہے ۔ یہاں نوعیت ذرا مختلف تھی ۔ یہ تنظیم اور احترام قانون کی بدیہی علامت ہے ۔

میں نے روانگی سے قبل احتیاطاً اپنا اوور کوٹ لے لیا تھا ۔ یہ بہت مناسب تھا ۔ بارش میں میرا اوور کوٹ برساتی کا کام دیتا ہے اور سردی میں گرم رکھتا ہے ۔ اگر یہ کوٹ ساتھ نہ ہوتا تو کم سے کم ماسکو میں قلفی جم جاتی ۔

پچھلی بار میں نے دیکھا تھا کہ دو شنبہ میں دنیا کا ایک بڑا ڈیم تیار ہو رہا ہے ۔ گزشتہ دو سال میں یہ اب تکمیل کی منزل تک پہنچ جانے کے قریب تھا ۔ اس ڈیم سے تاجیکستان کے علاوہ دوسری ریاستوں کو بھی بجلی فراہم ہوسکے گی ۔ اس سے مقامی اقتصادی بحالی میں بڑی مدد ملیگی ۔ یہ کام بڑا قابل قدر ہے ۔

دو شنبہ سے نوریک تک کا راستہ بڑا ہی خوبصورت ہے اور خود نوریک کا تو کیا کہنا ۔ یہ تاجیکستان کا ایک ایسا قصبہ ہے جس کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر شاید ہی کوئی شخص اس کی تعریف کئے بغیر رہ سکے ۔ وہ ہر موسم میں کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی دل آویزی کا سکہ زائرین پر بٹھا دیتا ہے ۔ تاجیکستان کے صدر مقام دوشنبہ سے یہ صرف اڑسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں دریائے رخش کے کنارے واقع ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود قدرت نے بڑی سعی و کاوش سے پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع وادی میں ایک بے مثل مقام اس کے لئے پسند کیا ہے ۔ دوشنبہ سے وہاں تک پہنچنے کے لئے جدید وضع کی ایک وسیع پختہ تارکول کی سڑک بنائی گئی ہے جو سیاہ ناگ کی طرح لہراتی بل کھاتی دکھائی دیتی ہے جس کے دونوں طرف حد نظر تک زمردیں رنگ سبزہ زمین کا چہرا ڈھانکے رہتا ہے اور اس کا سلسلہ اگلے شہر تک برقرار رہتا ہے ۔

یعنی درمیان میں کوئی سنگلاخ یا چٹیل میدان نظر نہیں آتا۔ موسم بہار میں تو اس کا حسن دوبالا ہوکر عجیب نظارہ پیش کرتا ہے، خصوصاً جب بادام اور انجیر کے درخت پھولوں اور پھلوں سے لد جاتے ہیں۔ پھر موسم سرما میں جب دھوپ خوب کھلی رہتی ہے اور تیز ہوائیں چلتی ہیں تو قدرت کی دیوی صحت کے انمول موتی بکھیرتی نظر آتی ہے۔ کوھسار کی شمالی ڈھلانوں پر برف جم کر سبزے کے ساتھ سفیدی کا حسن تضاد پیش کرتی ہے جس پر محض نظر ڈالنے سے بصارت بڑھ جاتی ہے۔ موسم گرما میں بھی یہ وادی حسین دکھائی دیتی ہے کیونکہ موسم خزاں شروع ہونے سے پہلے ھی پتے پیلے پڑجاتےھیں اور جب وہ گرچکتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دست نازک نے زمردیں فرش پر سونے کے پترے بکھیر دئے ہیں۔

اسی وادی میں ایک بستی چرمازاک کہلاتی ہے جو ایک وسیع درے کے درمیان واقع ہے۔ وہاں سے لمبی لہکاری سیاہ سڑک دوشاخہ ہوکر آگے قدم بڑھاتی ہے۔ دونوں کی سمتیں اور منزلیں جدا ہوتی ہیں۔ لیکن وادی کا حسن لازوال تقسیم ہوکر ماند نہیں پڑتا بلکہ مختلف الالوان پھولوں کی آما جگاہ بن جانے کے باعث دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس مقام کی دلآویز کشش ہر موسم میں اتنی شدت کے ساتھ دامن گیر ہوتی ہے کہ سیاح مسافروں سے بھری ہوئی بس میں سوار ہوں یا شاندار بے بہا ذاتی کار میں، ایک لمحے گاڑی ٹھیرا کر اس کا عمیق نظارہ کرلینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم مندوبین کی گاڑیاں جب اس مقام پر پہنچیں تو کچھ دیر کے لئے رکے بغیر نہ رہ سکیں۔ سب ھی

اراکین اتر پڑے تاکہ اس حیات آفرین فضا میں چند لمحے سانس لے کر معجزۂ فطرت دیکھ سکیں۔

قصبے کی کل آبادی تقریباً ۲۳ ہزار نفوس پر مشتمل ہے لیکن ان میں مختلف قومیتوں کے نمائندے نظر آتے ہیں اور اکثریت ان سرکاری کارکنوں کی ہے جو بجلی پیدا کرنے والے کارخانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی موسمی پھلوں اور میووں کی کاشت کرنے والے ہیں جن کے چہروں کا رنگ اپنے تیار کردہ پھلوں سے زیادہ سرخ و سفید کہا جاسکتا ہے۔ بلند و بالا شاندار عمارتوں کے آس پاس کچھ بوسیدہ وضع کی جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جو امارت و غربت کا رنگ تضاد ظاہر کرتی ہیں۔ آبادی کا سلسلہ پہاڑی کے دامن سے چوٹی تک چلا گیا ہے اور چونکہ یہ علاقہ تقریباً ۲۷ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کرنے کا بڑا مرکز ہے، اس لئے یہ تصور کرنا آسان ہے کہ گھپ اندھیرا چھا جانے کے بعد جب برقی قمقمے ہر گھر میں اور ہر راستے پر روشن ہوتے ہونگے تو یقیناً یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ آسمان کا ایک ٹکڑا زمین کے قدم چومنے کے لئے ذرا سا جھک گیا ہے۔ یہاں ستر کلو میٹر طویل اور پانچ کلو میٹر عریض ایک قطعۂ آب بھی ہے جس پر برف سے زیادہ سفید کشتیاں مچھلی کا شکار کرتی نظر آتی ہیں۔ میرے دل ناداں نے ترغیب دی کہ صد سالہ تقریبات سے فراغت پاکر چند دن یہاں قدرت کی آئینہ سامانی میں گزارے جائیں مگر اپنی مصروف زندگی کی مجبوریوں نے محتسب بن کر اس ارادے سے باز رکھنا ھی مناسب سمجھا اور میں سب کے ساتھ دوبارہ گاڑی میں سوار ہوکر منزل کی طرف چل پڑا، حالانکہ دل

نہیں چاھتا تھا کیونکہ بارش نے سماں اور بھی بھلا کردیا تھا ۔ میرے تو دل کی کلیاں کھل کر چٹکنے لگی تھیں ۔

نوریک میں سب سے پہلے ایک ھال میں استقبالی اجتماع ھوا ۔ غالباً میونسپل کمیٹی کے صدر صاحب نے کلمات استقبالیہ ارشاد فرمائے اور پھر نوریک ڈیم کے انجینئر صاحب کو دعوت دی کہ وہ اس تاریخ ساز ڈیم کے بارے میں تفاصیل بتائیں ۔ وہ بے چارے شاید قلب کے مریض تھے ۔ نوجوان تو تھے مگر ڈیم کی تفاصیل بتاتے وقت پسینہ پسینہ ھوئے جارہے تھے ۔ حال آں کہ موسم خاصا سرد تھا ۔ اس کے بعد مندوبین کو لے جاکر ڈیم دکھایا گیا ۔ میں نے بھی دیکھا ۔ وھاں ایک صاحب نے مجھے پہچان لیا ۔ آپ تو دو سال قبل بھی آئے تھے ۔ میں نے بھی ان کو پہچان لیا ۔ ڈیم پر فوٹوگرافرس اور ٹیلے وژن کے کارکن بھی موجود تھے ۔ میں ان سے دور ھی تھا مگر پھر ان کے اصرار پر میں نے ذرا سی ایکٹنگ بھی کرلی ۔ وہ چاھتے تھے کہ ھم باتیں کریں اور وہ پس منظر میں ڈیم کی مشینری رکھ کر ھماری فلم تیار کرلیں ۔

دو بجے ھم ایک مرکزی ھال میں آ گئے ۔ سینکڑوں آدمیوں سے ھال بھرا ھوا تھا ۔ دراصل یہ نوریک میں جشن عینی تھا ۔ یہاں افتتاحی تقریر کے بعد محفل شعر و ادب برپا ھوگئی ۔ کئی تقریریں ھوئیں ۔ متعدد شعرا نے کلام سنایا ۔ میرا خیال تھا کہ تاجیکستان میں بیدل ، حافظ اور اقبال معروف تر ھیں مگر آج ایک صاحب نے عمر خیام پر تضمین سے حاضرین سے داد لی ۔ تمام شاعری روسی زبان میں تھی اور فارسی میں ایک بھی شاعر

نے کوئی نظم نہیں کہی ۔ میرے قریب تاجیکستان کے مشہور شاعر جناب میر سعید میر شاکر تشریف فرما تھے ۔ وہ مجھے فارسی میں سمجھاتے رہے ۔ یہی شاعر تاجیکی امیر خسروئے دھلوی کی تقریبات میں شرکت کے لئے پاکستان گئے تھے ۔ یہاں ان سے ۱۹۷۵ء میں تاجیکستان دو شنبہ میں مل چکا تھا ۔ پاکستان میں ان کی خاطر تواضع ممکن حد تک کردی تھی اور ان کو ھدایا بھی دئے تھے ۔ وہ مسز ڈی سلوا (میری سکریٹری) کا حال پوچھتے تھے ۔

صبح جب ماسکو گزر گاہ سے ھوکر گزرا اور اب شام کو بھی واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ جو پھول ھم نے مجسمۂ لینن پر رکھے تھے ، وہ بدستور رکھے ھوئے تھے ۔ ان کو کسی نے ھاتھ تک نہیں لگایا تھا ۔ حال آں کہ شام کے وقت یہاں سیلانی جمع بھی تھے ۔ یہ ملی تنظیم کا حال تھا ۔ اگر پاکستان ھوتا تو شاید قبر کے اندر کا کفن بھی غائب کردیا جاتا ۔ نوریک سے واپسی پر میں نے دو شنبہ تک دیہی علاقوں میں آبادیوں کو غور سے دیکھا ۔ اب تک دیہی علاقوں میں لباس قدیم تاجیکی ھی استعمال ھو رھا تھا ۔ عورتیں تنگ (حیدرآبادی) پاجامے اور لمبے کرتے پہنے ھوئے تھیں اور سر پر چوکور ٹوپی اوڑھ کر اس پر کساوا کس لیا تھا ۔ بچے بھی تاجیکی لباس میں تھے ۔ مردوں میں داڑھیاں رکھنے کا رواج ھے اور بوڑھے لوگ روئی کے کوٹ اور صدریاں پہنے ھوئے تھے ۔ صورت شکل میں ان لوگوں کو برصغیر سے مماثل کیا جاسکتا ھے ۔ ایک زمانہ تھا کہ تاجیکستان وغیرہ علاقوں سے ھندستان تک قافلے آتے جاتے تھے ۔ گویا یہ رشتہ بڑا قدیم ھے ۔ دو شنبہ سے کابل بھی زیادہ دور نہیں ھے ۔ ھوائی

جہاز کے ذریعہ سے زیادہ ۴۰-۵۰ منٹ کا راستہ - اگر دوشنبہ ہموار کردیا جائے اور سڑکیں تعمیر کردی جائیں تو روس کی یہ مسلم ریاستیں افغانستان ، پاکستان اور ایران سے قریب تر ہیں ، جبکہ ماسکو سے یہ دور تر ہیں -

چین کی ڈپلومیسی

اس حقیقت کے پیش نظر ھی تو چین روس سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان پانچوں مسلم ریاستوں کو آزاد کرو مگر خود چین کا حال کیا ہے ؟ آدھا پاکستان اس کے زیر نگیں ہوگیا ہے ! کیسے ؟ امریکہ ، روس اور چین — ان سب کی نگاہیں مشرقی پاکستان پر تھیں اور ہر ایک اس علاقے کو اپنے زیر نگیں کرنا چاہتا تھا - روس کا اساسی مقصد و منشا یہ تھا کہ مشرقی پاکستان چین کے زیر نگیں نہ جانے پائے - خود روس کو وہاں حکومت کرنے کی بہ ظاہر چنداں خواہش نہیں تھی - اس لئے روس نے گزشتہ دس سال تک اپنے افکار کی وہاں روشنی پھیلائی اور لوگ کہتے ہیں کہ اس جذبے کے ساتھ کہ پاکستان کو کمزور کردیا جائے - روس نے مشرقی پاکستان کو ہندستان کے زیر نگرانی کردیا - اور ہندستان نے اس پر آمادگی ظاہر کردی - اگر میرا یہ خیال صحیح ہے اور بہ ظاہر اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو درحقیقت ان دونوں بڑی طاقتوں نے غلطی کی ہے - اس غلطی کے نتائج آج سے دس پندرہ سال بعد ظاہر ہونگے کہ جب ہندستان لازمی طور پر مغربی بنگال اور آسام سے محروم ہوگا اور روس کو یہ دیکھنا ہوگا کہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) لازماً چین کے زیر نگیں ہوگیا ہے - میری رائے میں دنیا کی کوئی طاقت ایسا

ہونے سے نہیں روک سکتی - میں چین کی ڈپلومیسی کی داد دونگا کہ اس نے ایک زبان ہلائے بغیر اور پاکستان سے دوستی کو ذرہ برابر نقصان پہنچائے بغیر آدھا پاکستان اپنے زیر نگین کر لیا ہے - اس سیاست میں روس اور امریکہ دونوں صریحاً ناکام ہوگئے ہیں - میرے دل میں ضرور یہ شبہ ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کا حادثہ تنہا بیرونی سیاست کی وجہ سے پیش نہیں آیا ہے - اس میں خود ہمارا کردار بھی مشتبہ ہے اور یہ شبہ کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ہم نے ہندستان کے لئے راستہ ہموار کردیا ہے - فی الحال یہ ضرور راز ہے مگر آخر کب تک یہ راز رہیگا - بایں ہمہ اگر یہ راز کسی وقت افشا ہو بھی گیا تو گردن زدنی جن کی ہونی ہے وہ دونوں اب موجود نہیں ہیں - بنگالیوں نے اپنی آزادی قربان کرھی دی ہے اور اب ان کو چین کی گرفت سے کم از کم دو سو سال نجات نہیں ملیگی اور جب وقت نجات آئیگا تو بنگالی دراصل بنگالی نہ ہوگا - اس کی زبان وہ ہوگی جو بنگالی ، برمی اور چینی کا آمیزہ ہوگی - یعنی وہ بنگالی زبان جس نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے جدا کیا وہ زبان آخرکار ختم ہوجائے گی -

ہم سب مندوبین ساڑھے چھ بجے باغ میں واپس آگئے - میں نے ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف کو خستہ پایا - وہ میرا بڑا ھی خیال رکھ رہے تھے - میں اس عالم شخصیت کا احترام ہر لمحہ کرتا ہوں - مگر وہ مجھے اپنے خلوص و انس سے گرویدہ تو کرھی رہے تھے ، مجھے شرمندہ بھی کرنے لگے - مہمان خانے کے دروازے پر ڈاکٹر اکبر خان مستعدی کے ساتھ موجود تھے - انہوں نے ارشاد فرمایا کہ سات بجے روانہ ہونا ہے - آج ایک

ڈرامہ ہے جو خاص طور پر اس موقع کے لئے مرتب کیا گیا ہے ۔ میں اس قسم کے پروگراموں سے کبھی نہیں گھبراتا ۔ تاہم اگر صبح پتہ چل جاتا کہ پروگرام کی نوعیت کیا ہے تو ذہنی طور پر آدمی تیار ہوجاتا ہے ۔ پروگرام مطبوعہ موجود ہے مگر ان حضرات کو اب تک یہ ادراک نہیں ہوا تھا کہ ہم روسی زبان نہیں پڑھ سکتے تھے ۔ ہمارا سارا انحصار مترجمین پر ہوتا ہے ۔

تعارف

میں نماز عصر ادا کرکے وقت معینہ پر تیار ہوگیا ۔ موٹر نمبر ۸ پر ہم تھئٹر پہنچ گئے ۔ وہاں ڈاکٹر منیرہ موجود تھیں ۔ وہ ایک نوجوان کو لائیں اور کہا : '' ان سے ملئے ۔ یہ آج کے ڈرامے کے مصنف ہیں ۔ طالب شہیدی ان کا نام ہے'' ۔ میں اس نوجوان سے ملا ۔ پرتپاک شیک ہینڈ ہوا ۔ اس کا لطف لے کر ڈاکٹر منیرہ نے کہا : '' اور یہ میرے بھائی ہیں'' ۔ میں نے طالب شہیدی کو گلے اور سینے سے لگا لیا ۔ اس بغل گیری کا لطف منیرہ نے زیادہ اٹھایا ۔ ڈاکٹر منیرہ اکیڈمی میں میرے دوست ڈاکٹر میرزا یوف کے ساتھ کام کرتی تھیں ۔ گزشتہ بار ان سے ملاقات ہوئی تھی ۔ افسوس ہے کہ میرے دوست میرزا یوف اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ وہ بڑی عالم فاضل شخصیت تھے ۔ کنگرس عالمی ابو ریحان البیرونی پاکستان میں روس سے تاجیکستان کی نمائندگی کررہے تھے ۔ میرے مہمان تھے ۔ ان سے بڑا قلبی تعلق ہوگیا تھا ۔ ڈاکٹر منیرہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں کام کررہی تھیں ۔ اس بار وہ محترمہ عصمت چغتائی کی مترجمہ تھیں اور ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہیں ۔

ڈرامہ

پروگرام روسی زبان میں ملا ۔ ڈرامے کے نام کا پتہ ہنوز نہیں چلا ہے مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پینٹو مائم اور بیلے کا یہ مرکب ایک سود خوار کے کردار کا مظہر ہے ۔ ڈرامے میں سارے بدکردار وہ لوگ تھے جو داڑھیاں لگائے ہوئے تھے اور روپیہ پیسہ جن کا مقصد زندگی تھا ۔ سود خوار مولوی آخر تک روپے پیسے کو مقصد زندگی بنائے رہا اور ڈرامے میں جو چار دوسرے مرلوی آئے' وہ بھی محبت زر سے خالی نہ تھے ۔ سود خوار نے ایک سکہ ہوا میں اچھالا تو چاروں مولوی گتھم گتھا ہوگئے اور پانچواں سود خوار ۔

اس اعتبار سے پاکستان کے ملاؤں میں اور تاجیکستان کے ملاؤں میں قدر مشترک ہے ۔ ہمارے ہاں بھی ملا ٹکے کے بھاؤ بک جاتا ہے اور معاشرے کو سب سے زیادہ یہی تباہ کرتا ہے ۔ بایں جبہ و دستار جب وہ بدکرداری کا مظاہرہ کرتا ہے تو معاشرے کے ذہن جوان کو داغدار بنا دیتا ہے ۔

رات دس بجے سب مہمان واپس آگئے ۔

میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا ۔ نوریک میں ساڑھے چار بجے دھی روٹی کھائی تھی اور وہ ضرورت کے لئے کافی تھی ۔

میرا مقالہ جشن عینی میں

صدرالدین عینی کے جشن صد سالہ کے ذیل میں ١٧ اور ١٨ اپریل کو یعنی مسلسل دو دن سائنسی اجلاس منعقد ہوئے ۔ میں نے ١٧ اپریل کی صبح کو اپنے مقالے کی نوک پلک درست

کی ۔ بڑی شدت کے ساتھ اس کا احساس ہو رہا تھا کہ میرا مقالہ زبان فارسی میں ہونا چاہئے تھا ۔ دراصل میں نے فارسی ترجمے کا فیصلہ کیا تھا مگر بعد میں نہ جانے کیوں میں نے انگریزی کا فیصلہ کرلیا ۔ یہاں اکثریت فارسی زبان جاننے والوں کی تھی ۔ دوسرے ممالک کے جو اسکالرز آئے تھے وہ بھی فارسی داں تھے ۔ اور ماسکو وغیرہ سے جو روسی شرکاء آئے وہ بھی فارسی شعبوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ تاجیکستان کی زبان فارسی ہے مگر یہاں بھی اکثریت روسی زبان سمجھتی ہے ۔ بہر حال میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے مقالے سے قبل چند کلمات فارسی میں کہونگا اور بغیر لکھے کہونگا ۔ میں اپنا مقالہ چھاپ کر لایا تھا ۔

دس بجے ہم کانفرنس ہال میں پہنچ گئے ۔ یہ نیا تعمیر ہوا ہے ۔ اس میں موجودہ ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے ۔ دوشنبہ کے اعتبار سے یہ ایک بہترین مقام ہے کہ جہاں بڑی سے بڑی عالمی کانفرنس منعقد کی جاسکتی ہے ۔ ابھی زیر تعمیر ہے ۔ شاید ایک سال بعد اس میں ضروری اضافات بھی حسب ضرورت ہوجائیں گے ۔

اکیڈیمیشین محمد عاصموف صاحب موجود تھے ۔ اب تک جو تقریبات ہوئیں، ان میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ۔ اس علمی اجلاس میں بھی وہ پیش پیش تھے اور صدر جلسہ بھی تھے ۔ پروگرام کے مطابق میرا مقالہ کل ہونا تھا ، مگر پروفیسر عاصموف صاحب نے فیصلہ کیا کہ حکیم صاحب کا مقالہ آج ہی ہوگا اور سب سے پہلے ہوگا ۔ تاہم سب سے پہلے دو مقالات ملکی اسکالرز کے ہوئے ۔ تیسرا مقالہ ہندستان کے جناب علی سردار جعفری

صاحب کا تھا ۔ انہوں نے اپنا مقالہ دوشنبہ آکر ہی لکھا ۔ درحقیقت یہ عینی اور حکومت کے لئے کلمات خیر تھے جن کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا ۔ ان کی زبان بہت پاکیزہ ہے ۔ ان کے خیالات ایک پختہ شاعر کی طرح ہیں ۔ میں نے ان کو پہلی بار سنا ۔ علی سردار جعفری صاحب ترقی پسند ادب کے ترجمان ہیں ۔ روس میں ان کا مقام متعین ہے ۔ ان کے کلام کا روسی زبان میں ترجمہ بھی ہوا ہے ۔ ان کا مقام وہ ہے جو فیض احمد فیض کا پاکستان میں ہے ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فیض صاحب کی روس میں قدر و منزلت زیادہ ہے ۔ وہ لینن پرائز ونر بھی ہیں کہ جو روس کا سب سے بڑا اعزاز ہے ۔

علی سردار جعفری صاحب کے بعد اکیڈیمیشین عاصموف نے نہایت موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا ۔ غالباً وہ اس سے پہلے سینکڑوں حاضرین سے تعارف نہیں کراسکے تھے ۔ مجھے انہوں نے مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی ۔ میں نے چند منٹ فارسی میں خطاب کیا اور معذرت چاہی کہ میرا مقالہ غیر فارسی زبان میں ہے ۔ میں نے وضاحت کی کہ میں طب کے میدان میں حقیر محقق ہوں اور انگریزی زبان میں طب قدیم کو متعارف کرارہا ہوں ۔ اس لئے میری علمی اور تحقیقی زبان انگریزی ہے ۔

مادام مریم سلکانگ صاحبہ فوراً میرے ساتھ آگئیں اور انہوں نے انگریزی سے روسی میں ترجمہ کی ذمہ داری سنبھال لی ۔ محترمہ مریم سلکانگ ادارۂ مصنفین روس میں شعبۂ ممالک خارجہ کی صدر ہیں ۔ اردو بھی جانتی ہیں ۔ انگریزی پر عبور و قابو ہے ۔

میرے مقالے میں فارسی کے اشعار جگہ جگہ تھے جن کو میں نے اچھے فارسی انداز سے پڑھا - بارے یہ مرحلہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا -

میرے مقالے کا متن

میرے مقالے کا مختصر اردو ترجمہ درج ذیل ہے - اس کا عنوان تھا : صدرالدین عینی — انسان ، اس کا عہد ، اس کا پیغام -

'' باشندگان عالم کی زندگی کے ہر پہلو میں ، خصوصاً معاشرتی فروغ کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے میدان عمل میں ایک انقلاب اس وقت رونما ہوتا ہے کہ جب جہالت ، غربت و افلاس اور بیماریاں کسی ملک میں ، جس کا عہد ماضی شاندار اور درخشاں رہا ہو ، اپنا نقش جمالیتی ہیں - تاجیکستان انقلاب اکتوبر سے قبل ایسا ہی ایک ملک تھا - اب سے چند صدی پہلے ، وسطی ایشیا نے نہ صرف ماہرین فن تعمیرات اور فنکاروں کو جنم دیا بلکہ رودکی ، فردوسی ، ناصر خسرو اور کمال خجندی جیسے شعرائے کرام نیز ، فلسفی ، دانشور اور اطبا بھی پیدا کئے - موخرالذکر کی صف میں ابو علی ابن سینا جیسے متبحر اور عقل کل انسان کا شمار ہوتا ہے - انقلاب اکتوبر کو نہ صرف عوام کی اکثریت نے قبول کیا بلکہ بہ رضا و رغبت اور بہ مسرت و شادمانی اس کا خیر مقدم کیا - ایسے لوگوں کی صف میں صدرالدین عینی کا شمار ہوتا ہے جو اپنے عہد کے ایک ممتاز نثر نگار ، شاعر اور مفکر تھے جو آگے چل کر تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر، ڈاکٹر آف فلولوجی (ماہر لسانیات) اور اسٹالن انعام یافتہ ہوگئے-

کرہ' ارض کے اس حصے کی تاریخ عہد وسطیٰ کی ورق گردانی کی جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں امارت بخارا کا قیام عمل میں آیا تھا - اس میں موجودہ تاجیکستان کا کچھ علاقہ شامل تھا - عرصہ' دراز تک اس وسیع علاقے کا نظم و نسق سنبھالنے والے امیر فہم و فراست اور حسن و خوبی کے ساتھ فرمانروائی کرتے رہے ، یہاں کی زبانیں ، رسم و رواج ، عادات و اطوار اور ادیان و مذاہب باہم شیر و شکر رہے اور اپنے نقوش ایک دوسرے پر جماتے رہے - لیکن انیسویں صدی عیسوی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی جس نے اس سرزمین کے حالات کا ہر نقش بدل ڈالا اور سلطنت کی خود مختاری بھی ختم ہوگئی -

وسطی ایشیا میں روسی لشکروں کا منظم صورت میں داخلہ ۱۸۶۱ء میں شروع ہوا اور امارت بخارا زار روس کے تحت ایک باجگزار ریاست بن گئی - امیر وقت کو مجبور ہوجانا پڑا کہ وہ ان غاصبوں کی مرضی کے خلاف کوئی عمل نہ کرے جنہوں نے معصوم انسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور مصائب و آلام کا نشانہ بنانے کے لئے لامحدود اختیارات حاصل کرلئے تھے - اپنی رعیت کی نجات کے لئے امیر کے پاس نہ ہمت تھی ، نہ اقتدار اور نہ وسائل و ذرائع - لہذا زار کے ظلم و استبداد کے تحت سارا ملک آہ و فغاں کرتا اور تڑپتا رہا -

حریت و آزادی ، حتیٰ کہ تعلیم و تربیت کے ضمن میں بھی، بہت ہی گراں اور ناممکن الحصول تھی - علاج معالجے کی خصوصی مراعات صرف طبقہ' امرا کو حاصل تھیں - غریب لوگ

صرف اتائیوں اور نیم حکیم شعبدہ بازوں کے رحم و کرم پر رہتے تھے جو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے ذریعہ سے ان کا روگ مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوئی ایسا مستند طبیب نہیں ہے جو جڑی بوٹیوں کا عرق نکال کر ہی کسی مریض کو پلا سکتا ہو۔ اس صورت حالات کے لئے امیر ایک حد تک ذمہ دار تھا لیکن کلیتہً اسے الزام دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ جب بھی کسی دوسرے ملک کا اقتدار قائم ہو، مفتوح قومیں مصائب و آلام کا شکار ہوجاتی ہیں۔

جہالت، غربت و افلاس اور بیماری کے مذموم چکر کے ہاتھوں بگڑنے والے ان حالات میں صدر الدین ۱۰ اپریل ۱۸۷۸ء کو بخارا کے ضلع گژدوان کے ایک قصبے سوقطر میں پیدا ہوئے۔ اس سے سترہ سال پہلے زار روس ان کے مادر وطن کی آزادی کو غصب کرچکا تھا — اس سر زمین کی آزادی کو جو سر سبز و شاداب وادیوں، روشن و پر فضا گھاٹیوں، پہاڑوں کی اونچی نیچی اور ازل سے برف پوش چوٹیوں سے مل کر بنی تھی، جس کی فضا خوشگوار اور ہر طرف کھلی ہوئی دھوپ سے صحت بخش تھی۔

صدرالدین کے والد کے مالی وسائل محدود تھے، اس لئے وہ کسی مدرسے میں زانوئے ادب طے کر کے باقاعدہ تعلیم شروع نہ کرسکے۔ کبھی یہاں داخل ہوئے، کبھی وہاں۔ گویا کسی مد سے جہاں بھی امداد ملی، اسے قبول کرلیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ان مدرسوں کا نظام ہی واحد آسرا تھا۔ غریب نوجوان اعلا تعلیم یا فنی تربیت کا خواب تک دیکھنے سے محروم تھے۔ چنانچہ صدر الدین کو دس سال کی عمر تک اپنا نام بھی صحیح انداز

میں لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم غربت و افلاس کے لبادے میں لپٹ جانے والی جوانی کی تشنگیٔ علم کسی عنوان سرد نہ پڑسکی۔

جب ان کے والد سعید مراد خواجہ مرنے کے قریب تھے تو انھوں نے اپنے اس بیٹے کو بستر مرگ کے قریب بلایا اور آخری وصیت کے طور پر کہا:

"مدرسے ضرور جایا کرو، خواہ تمہیں کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا ہو۔ پڑھو، لکھو اور ایک انسان بن جاؤ۔"

اس طرح ابدی سکون اور امن باپ کو ملا اور دائمی پریشانیاں بیٹے کو اور اس کے ساتھ ہی یہ عزم صمیم بھی کہ ہر قیمت پر تعلیم حاصل کرنی ہے۔ باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ ان کا بوڑھا باپ اور ان کے جھونپڑے میں رہنے والے جملہ افراد ہیضے کا شکار ہوگئے تھے جس نے دو سو گھروں والے اس گاؤں میں وبائی مرض کی صورت اختیار کرلی تھی، صرف صدرالدین خوش نصیب تھے کہ بہت جلد اس موذی بیماری سے نجات پا کر تندرست ہوگئے۔ چنانچہ خود ان کے قول کے مطابق اس چھوٹے سے مکان میں وہ ایک ڈاکٹر، ایک میٹرن، ایک نرس اور ایک وارڈ بوائے کے انداز میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ان تمام فرائض کی ذمہ داری اس ایک جان ناتواں پر آپڑی تھی۔

باپ کی وفات کے بعد تمام مصیبتوں کا پہاڑ ایک دم ٹوٹ پڑا۔ گیارہ سال کے بچے نے آذوقۂ حیات حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی محنت و مشقت گوارا کرلی۔ انھوں نے ایک مزدور، ایک باورچی، ایک دھوبی اور ایک گھریلو ملازم کی طرح کام شروع کیا اور ایک بار تو وہ دق و سل کے ایک مریض کے تیمار دار بن گئے

اور جب وہ مریض ، جو ایک دولتمند شخص تھا ، مر گیا تو اس کے بھائی نے تیمار دار سے کہا کہ حق خدمت کے طور پر مرحوم کے اثاثے میں سے جو چیز چاھو ، لے لو اور کہو تو نقد رقم ادا کردی جائے ۔ مگر آئندہ شاعر اور ادیب بننے والے اس یتیم لڑکے نے صرف دیوان صائب پسند کیا ۔ ایک کتاب پر اکتفا کرنا ھر شخص کے لئے حیرت انگیز تھا ، اس معنی خیز انداز سے صدر الدین عینی کے اصل کردار ، شاعری سے ان کے دلی لگاؤ اور علم و ادب سے ان کے ذوق و شوق کا پتہ چلتا ھے ۔

اسی طرح ایک اور موقع پر معاوضۂ خدمت کے طور پر انھوں نے کلیات بیدل اور دیوان حافظ قبول کرنے کو ترجیح دی اور جب ایک شخص حج بیت اللہ کے لئے عازم سفر ہونے لگا اور اس نے چاھا کہ اپنے فاضل سامان کا کچھ حصہ واقف کاروں میں تقسیم کردے تو صدر الدین نے دیوان جامی کے سوا کوئی اور غیر شاعرانہ چیز پسند نہیں کی ۔ اس انوکھے انداز میں انھوں نے کوشش کی کہ اپنے مختصر سے کتب خانے میں اضافہ کرتے رھیں ، حالانکہ اپنی کتابوں کو مناسب صورت میں رکھنے کی جگہ بھی ان کے جھونپڑے میں نہیں تھی ۔

یہ بالکل حقیقت ھے کہ اس زمانے میں ان کے مسائل بے شمار تھے ۔ اشیائے خوراک کی کمی ، رہائشی سہولتوں اور ستر چھپانے والے لباس کا فقدان سب سے زیادہ پریشان کن تھا ۔ اکثر راتیں انھوں نے کچھ کھائے پیے بغیر گزار دیں ۔ اکثر موقعوں پر وہ کسی مسجد کے گوشے میں یا کسی دوست کی کھولی میں لیٹ کر سوگئے ۔ اپنے اس طرز زندگی کے بارے میں ایک رباعی کہی

جو ان کے احساسات کی ترجمانی کرتی ھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ اس قماش کی زندگی بسر کرنا میرا مسلک نہیں ھے، نہ دوستوں کا دست نگر رھنا میرا شعار ھے ۔ بدقسمتی پر آنسو بہانا بھی زیب نہیں دیتا لیکن اب شکایت کی جائے تو کس سے کی جائے ۔

اس کے برعکس یہ بھی ایک حقیقت ھے کہ روسی اقتدار کے زیر اثر تاجیک ادب کا آغاز ۱۹۱۸ء میں صدر الدین عینی کی ایک نظم سے ھوا جس کا عنوان تھا : "سرود آزادی ۔ "، اس نظم کو حفظ کرکے باآواز بلند گاتے ہوئے مدرسوں کے بچے باھر نکل آئے اور انقلاب اکتوبر کی پہلی سالگرہ کی تقریبات میں شریک ھوگئے ۔ نظم کا مفہوم تھا :

"اے بدقسمت انسانو ! اے غلامو ! تمہاری آزادی کا وقت قریب آپہنچا ھے ۔ مجھے خوش خبری سناؤ ، اے میرے ساتھیو ! دنیا میں صبح مسرت نمودار ھورھی ھے ۔"

اپنی نظموں کے لئے صدر الدین نے یکے بعد دیگرے چار تخلص اختیار کئے : "سفلی"، — "محتاجی"، — "جنونی"، اور آخر میں "عینی"، — لغت میں اس آخری لفظ کے اڑتالیس معنے درج ھیں جن میں "آنکھ"، "منبع"، اور "سورج"، بھی شامل ھیں ۔

چونکہ فن شعر گوئی میں انھیں بڑا ملکہ اور سلیقہ حاصل تھا، اس لئے اپنے فالتو وقت میں وہ ھمیشہ کوشش کرنے لگے کہ کوئی نظم موزوں کرلیں اور جب ان کی کوئی نظم اچھا ذوق رکھنے والے سامعین کے سامنے پڑھی جاتی تو نعرہ ھائے تحسین کے ساتھ داد دیتے ہوئے اسے شاہکار نظم اور معیاری ادب کہا

جاتا ۔ ایک حد تک انہوں نے طرز سخن میں بیدل کا تتبع کیا تھا ۔

موسم سرما میں سردی سے بچنے کے لئے ان کے پاس روئی بھرا ہوا صرف ایک کوٹ تھا جسے پہن کر وہ دن بھر حسب ضرورت پھرا کرتے اور رات کو اسی میں لپٹ کر سوجاتے ، ان کے پاس نہ رضائی تھی ، نہ لحاف ، نہ کمبل ۔ ان کے پاس چمڑے کی جرابیں بھی نہیں تھیں ۔ ان کے سب دوست جراب کے بغیر گھر سے نکل نہیں سکتے تھے ۔ لیکن مجبوری کے ساتھ خود داری بھی ہو تو انسان ہر محرومی کو خاموشی سے گوارا کرلیتا ہے ۔ وہ اپنے ہی ھاتھ سے بنائے ہوئے سلیپر پہن کر جاڑے کے موسم میں گزارا کرتے جن سے ان کے پاؤں کی جلد جگہ جگہ سے چٹخ جاتی تھی ۔ لیکن انہوں نے کبھی کسی سے بھیک مانگنے کے انداز میں کوئی چیز طلب نہیں کی اور نہ زندگی سنوارنے کے لئے کوئی بے جا مطالبہ کیا ۔ انہوں نے مخیر حضرات کی فیاضانہ پیش کشوں کو بھی قبول کرنے سے انکار کردیا ۔ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ یہ لوگ امارت بخارا کے دلال ہیں اور اس طرح ناجائز فائدہ اٹھانا چاھتے ہیں ۔ اس رویہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر کتنے وسیع النظر تھے ۔ زندگی کے ان لاتعداد نشیب و فراز میں بکھرے رہنے کے باوجود ہمیشہ ایک مقصد حیات ان کے سامنے رہا اور وہ دیانت داری اور سچائی کے ساتھ ہر منزل سے گزرتے رہے ۔

پھر ایک وقت آیا کہ جب مناسب تعلیم کی جستجو میں انہیں اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ دینا پڑا اور وہ بخارا کے مشرقی علاقے میں چلے گئے جہاں مشتاق طلبہ کے لئے مفت تعلیم

کا انتظام تھا ۔ دن کے وقت وہ درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے جو معمولی معاوضے کے بدلے میں انہیں طلبائے قدیم سے مستعار مل جاتی تھیں اور رات کے وقت وہ کسی ریستوراں میں جاکر برتن دھونے یا چوکیداری کرنے کے فرائض انجام دیتے ۔ وہ کسی بھی کام سے جی نہ چراتے تھے ۔ محنت و مشقت کی عظمت ان کے دل میں جاگزیں تھی ۔ حصول علم کا جذبہ ان کے دل و دماغ پر اس طرح طاری تھا کہ وہ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرسکتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے چند سال میں اپنی تمنا پائے تکمیل کو پہنچادی اور امتیاز کے ساتھ فارغ التحصیل ہوگئے ۔ ان کے مطالعے کے موضوعات میں سائنس کی تمام شاخیں ، ادب و انشا اور دوسری زبانیں شامل تھیں ۔

وہ اپنی تمام عمر پرامن طریق کار کے مطابق محنت کش عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر نبرد آزما رہے کیونکہ ان کے خیال میں قوموں کی اقتصادی خوش حالی اس طور سے ممکن ہے ۔ انہوں نے عوام سے بھی کہا کہ کسی قسم کی تخریبی کارروائی سے خالی الذھن ہوکر ہم آہنگی اور یک جہتی کے ساتھ متحد رہیں ۔ انہیں سب سے زیادہ ناپسند بات یہ تھی کہ کوئی بھی قدم غیرجمہوری انداز میں اٹھایا جائے ۔ ان کی رائے میں جمہوریت کا مطلب یہ تھا کہ ایک خیر سگالی جذبے کے تحت تمام شہری معاشرتی مساوات کے حصول کی کوشش کریں ۔ انہوں نے یہ بانگ دھل کہا کہ ہر سطح پر انسان دوستی کے اصولوں میں یکسانیت پیدا کی جائے ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوئی بھی غیر منصفانہ عمل ، خواہ وہ حکومت ھی کے خلاف کیوں نہ

هو اور خواه اس کا جواز موجود کیوں نه هو ، قطعی طور پر کوئی عذر برداشت نهیں کیا جائیگا ۔ انهوں نے اس بات پر زور دیا که اخلاقیات کے مسلمه اصول محنت کش طبقے کے لئے بھی یکساں هونے چاهئیں ۔ ایسی عملی سرگرمیوں اور پند و نصیحت کی بنیاد پر انهیں عظمت عمال کا ایک عالمی نشان تسلیم کیا گیا اور انهیں صنعتی فراخدلی کے ضمن میں ایک عظیم علمبردار اور امداد باهمی کے نظم و نسق کے لئے روشن خیالی کی ایک علامت سمجھ لیا گیا ۔ اس طرح انهوں نے اپنے ابنائے وطن میں معاشرتی شعور کا احساس ، کام کرنے کی لگن اور عزت نفس کے حصول کا جذبه بیدار کردیا ۔

عینی نے انقلاب اکتوبر کے بعد هی نثر میں لکھنا شروع کیا جس کے جلو میں آزادی اور انصاف کی لهریں ابھر آئیں ۔ هر قسم کی کمینگی ، بے غیرتی ، معاشرتی بے انصافی ، نیز افسروں ، اهلکاروں اور طبقهٔ امراء کی خون آشامیوں کو بے نقاب کرنے میں انهیں غیر معمولی شهرت حاصل هوئی ۔ ان کے الفاظ بے پناه غم و غصے ، برهمی اور نفرت میں ڈوبے هوئے سنائی دیتے تھے ۔ ان کی نگارشات میں استعمال هونے والے افراد کی اکثریت جیتے جاگتے انسان هیں ۔ ان کی تخلیقات کا ایک هلکا سا نقش حسب ذیل هے :

(۱) " بخارا کے جلاد " مطبوعه ۱۹۲۰ء ، جس میں ازبکستان کے ایک قبیلے کی انتهائی درد ناک حالت کی ترجمانی کی گئی هے ۔ اس میں پیش هونے والے هر کردار کی قسمت خوف و هراس کی جھلک دکھاتی

هے ۔ نیز طبقهٔ امراء اور سرکاری اهلکاروں کی اخلاقی پستی کے ناٹک کا آخری پردا اٹھتا نظر آتا هے ۔ ان صفحات میں عینی کی حقیقت پسندی کے کچھ اور ظاهری نقوش نمایاں هوجاتے هیں جو ان کے خیالات کی اصل بنیاد هے اور جس سے ان کے آئنده ظهور میں آنے والے کارناموں کو تقویت پهنچتی هے ۔ ایک موقع پر خود انهوں نے کها تھا :

" میرے عهد ماضی کی یاد داشتیں میرے بیشتر ناولوں ، تحریروں ، تاریخی مقالوں اور کهانیوں کی اصل بنیاد ثابت هوئی هیں "۔

(۲) " اودینه " مطبوعه ۱۹۲۴ء ایک ایسی طویل کهانی هے جس میں ایک محنت کش انسان یعنی ایک کاشتکار لڑکے کی زندگی اور دل کی کیفیات ایک فنکارانه تجزیه کے ساتھ آشکار هوتی هیں ۔ تاجیک ادب میں پهلی بار اس کے ذریعه سے روز مره حالات کی روشنی میں ایک عام محنت کش طبقے کے افراد پر توجه مبذول کی گئی هے جن میں ساده لوح انسانوں کی خصوصیات اپنی جھلک دکھاتی هیں ۔ اس اعتبار سے نه صرف عینی نے به حیثیت ایک نثر نگار کے بلکه تمام تاجیک ادیبوں نے اس کهانی سے عمیق تاثر لیا هے ۔ کمزور طبع اور نازک مزاج اودینه اس تشدد اور ظلم و ستم سے نمٹنے کی کوشش کرتا رها جو اس زمانے کے سخت گیر انسانوں کا خصوصی کردار تھا اور جب اس کے

صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوا تو اس نے سوچا کہ اب فرار کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے -

(۳) " احمد — جنوں کا فاتح "، مطبوعہ ۱۹۲۸ء ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس کا ضمیر بعض عناصر کے تحت نا واقفیت اور دیرینہ تعصبات کے اثرات سے پاک صاف تھا - کہانی کا ہیرو اپنے وقت کے لحاظ سے بے مثل کارنامے انجام دیتا اور انسانی جذبے کی قوت و استعداد اور اختیارات کا مظاہرہ کرتا ہے - مصنف کے فنیاتی عقیدے کے مظہر یہ الفاظ ہیں کہ

" انسان خبیث روحوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے - پریاں اور جن بھوت اس قابل نہیں ہوتے کہ آدم کی اولاد کو کوئی نقصان پہنچا سکیں "-

(۴) " دو خند "، مطبوعہ ۱۹۳۰ء عینی کا پہلا ناول ہے اور عام طور سے تاجیک ادب میں اس نوعیت کا پہلا کارنامہ سمجھا جاتا ہے - ناول کے سب سے بڑے کردار " یودگور "، کی تقدیر " اودینہ "، کی قسمت سے ملتی جلتی ہے - لیکن اول الذکر ایک ایسا مثالی نمونہ ہے جو معاشرتی آزادی کے لئے سختی سے نبرد آزما ہوتا ہے - یعنی انسان دوستی کے عظیم خیالات کے لئے جدوجہد کرتا ہے تاکہ سب کو فتح و نصرت نصیب ہو سکے -

(۵) " غلامان وطن "، مطبوعہ ۱۹۳۴ء جو حالات زمانہ کو پورے تزک و احتشام کے ساتھ پیش کرنے کا ایک

شاہکار ہے - اس ناول کے تاروپود میں ان حملوں کی جھلک نظر آتی ہے جو غلامی اور غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے ، جاگیردارانہ تعلقات کے مذموم بحران کو فنا کرنے ، انقلاب اکتوبر کو کامیاب بنانے اور اشتراکیت پسندی کے فیصلوں کو مضبوط و استوار کرنے کے لئے کئے گئے تھے- حصول آزادی کے لئے عام لوگوں نے جو راہ اختیار کی ، وہ صرف انفرادی کوششوں کے ذریعہ سے ہی متعین نہیں ہوتی بلکہ پتہ چلتا ہے کہ من حیث القوم کس کس طرح اس تحریک میں حصہ لیا گیا - عینی نے اپنی توجہ صرف اس تاریخ ساز انداز فکر ہی پر مبذول نہیں کی جو غلامی اور انکسار پسندی کو مٹانے کے لئے محنت کش عوام نے اختیار کیا بلکہ اس عملی کشمکش کو بھی جو مکمل نجات پانے کے لئے کی گئی اور جس سے استحصال کرنے والوں کے مذموم کردار اور عزائم کی ترجمانی ہوتی ہے -

(۶) " سود خوار کی موت "، مطبوعہ ۱۹۳۷ء ایک طنزیہ کہانی ہے جس میں عینی واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ میری ستم شعار حقیقت پسندی اصلیت کو بے نقاب کرنے کے لئے ایک زبردست معاشرتی طاقت ہے - کہانی کا اصل کردار ایک لالچی ، خون چوس سود خوار ہے جس کی روح دل کی سیاہی سے داغدار ہے - اس کی کتے جیسی حرص اور دوسروں کے مال و متاع کو

غصب کرنے کے لئے اس کی لامحدود طمع واضح کرتی ہے کہ جاگیردارانہ معاشرے کے نظام میں انسانیت کے خلاف کیا کچھ ہوتا ہے۔ مصنف اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہیرو کے خلاف عوام میں کس قدر نفرت پائی جاتی ہے۔ اس لئے عوام اس نظام سے برہم ہیں جس میں ایک ایسا ذلیل انسان پیدا ہوا جسے عام لوگوں پر برتری بھی حاصل ہوگئی۔

(۷) ''یتیم،، مطبوعہ ۱۹۳۹ء ایک ناول ہے جس میں ماضی اور مستقبل کی تاریخ اور حقائق حاضرہ ایک ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ خاص طور سے نازی جرمنی کے خلاف وطن پرستی کی عظیم جنگ کے دوران مصنف کی خصوصی توجہ عوام کے جذبۂ حریت پسندی کے معنی خیز مظاہر کی جانب مبذول ہوتی ہے جن کے زیر اثر وہ غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف نبرد آزما ہوجاتے ہیں۔

(۸-۹) ''مقنع کی بغاوت،، اور ''تیمور ملک،، مطبوعہ ۱۹۴۴ء دو عظیم مطبوعات ہیں جو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ پہلی کتاب اس زبردست رجحان سے تعلق رکھتی ہے جو سائنسی انکشافات سے وابستہ ہے اور دوسری میں منگولیا کی یلغار کے دوران رونما ہونے والے واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کو سائنسی اور تاریخی مقالات کہا جا سکتا ہے۔

(۱۰) ''یادداشت،، مطبوعہ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۴ء، چار

جلدوں میں، جنہیں پڑھ کر قارئین حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ''جنوں کا فاتح،، جس نے باہمت احمد کے فرضی نام سے خود نوشتہ سوانح حیات پیش کی ہے، عینی بذات خود موجود ہیں۔ انہیں ایسا کرنے کا حق تھا کیونکہ ان کی اپنی زندگی انسانی شجاعت، بہادری، عظمت اور قوت کی بے مثال تصویر تھی۔ اسی لئے طاقت اور انسانی صلاحیت و استعداد کی جھلک ان کی اپنی شخصیت میں نمایاں نظر آتی ہے اور وہ واضح طور پر صاف الفاظ میں ایک محنت کش کے مصائب و آلام، مسرت و شادمانی غم و غصہ اور امید و یاس کے ملے جلے احساس کی ترجمانی کرتے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ معاشرے کی آزادی کی خاطر جد وجہد کرنے کے لئے پکے ارادے رکھیں۔ وہ شاندار الفاظ میں دولت مندی کے سب سے زیادہ اہمیت والے لمحات کی عکاسی بھی کرتے اور اس کے ساتھ ہی افسوسناک لب و لہجے میں اہل تاجیکستان کی دکھ بھری داستان بھی سناتے ہیں۔ صرف چوتھی جلد مصنف کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی جو ان کی حقیقت پسندانہ طبیعت کے انتہائی عروج کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کارنامے کو بجا طور پر بخارا کا خزانۂ معلومات کہا جاسکتا ہے۔

ان سب کتابوں کو تاجیکستانی ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ سمجھا گیا ہے۔ ان کی تعریف نہ صرف اہل وطن نے کی

بلکہ غیر ملکوں کے صائب الرائے محققین نے بھی ان کی قدر و منزلت کی ہے۔ چنانچہ چیکوسلوواکیہ کے ایک عظیم شخص ژولی فوجک نے، جو ۱۹۳۹ء میں تاجیکستان کے دورے پر گئے تھے، عینی کے بارے میں بجا طور پر کہا تھا:

''عینی صرف آپ ہی کے نہیں ہمارے بھی ادیب ہیں۔ ان کی کتابیں نہ صرف فن لطیف کی عمدہ مثالیں ہیں، بلکہ انہیں کتب نصاب میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں کے ذریعہ سے نہ صرف عہد ماضی کے مصائب و آلام اپنی جھلک دکھاتے ہیں بلکہ تاجیک قوم نے جو کامرانیاں حاصل کی ہیں، ان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ ان تفصیلات کا زندہ ثبوت ہیں اور اسی لئے عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لئے ہماری جدوجہد میں وہ براہ راست معاون ہوسکتی ہیں،،۔

اسی طرح تاجیکستان کے لوگوں نے اس حقیقت پر فخر و انبساط محسوس کیا ہوگا کہ جب ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں نے اپنی دوسری کانفرنس کے موقع پر، جو ۱۲ سے ۱۶ فروری ۱۹۶۲ء تک بمقام قاہرہ منعقد ہوئی تھی، اپنا قطعی منشور منظور کرتے وقت کہا تھا:

''ہم رہین منت ہیں نا معلوم مصنفین کے کارناموں کے نیز رابندرا ناتھ ٹیگور، لوحسین، صدرالدین عینی اور طہ حسین جیسے مصنفین کے بھی، جنہوں نے خیالات و تصورات اور کام کرنے کی امنگ کو ترقی دینے کی صورت پیدا کی تھی،،۔

تاہم عینی کی زندگی میں ایک زبردست موڑ پیدا ہوا جس نے ان کے اصولوں اور نظریات کو یکسر بدل دیا۔ یہ ۹ اپریل ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے کہ جب امیر بخارا کے زیر فرمان ان کے چھوٹے بھائی حاجی سراج الدین کو اس الزام پر پھانسی دیدی گئی کہ وہ ایک خفیہ انجمن کے رکن ہیں۔ یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس انجمن نے امیر کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ درحقیقت وہ انجمن تعلیم میں اصلاحات لانے، ہر گاؤں اور قصبے میں مزید اسکولوں اور مدرسوں کے قیام کا اہتمام کرنے اور اعلا تربیت پانے کے لئے اساتذہ کو باہر بھیجنے کی خاطر وجود میں آئی تھی۔ اس حادثے نے قدرتی طور پر عینی کو زبردست دماغی تکلیف پہنچائی۔ چنانچہ اس شدید پریشانی اور ذہنی انتشار کے عالم میں انھوں نے اپنے بھائی کے اندوہناک قتل پر ایک مرثیہ لکھا۔ انھوں نے دل کے ٹکڑے کردینے والے اذیت ناک الفاظ میں آہ و فغاں کی۔ طویل مرثیے کے آخری بند میں انھوں نے کہا:

''اے خدا! اس خانہٴ بیداد و ستم کو ویران کردے،
اے خدا! اس دفتر ظلم و استبداد کو قبرستان بنادے،
اے خدا! اس تخت شاہی کو جو ہماری بدبختی کا باعث بنا ہے، ٹکڑے کرکے، سیاہ خاک میں ملا دے،
اے خدا! اس تاج زریں کو جو خونخوار سر کی زینت ہے، سر سمیت قید خانے میں ڈال دے۔
اے خدا! اس محل کو جو جلادوں کا عشرت کدہ ہے، مسمار کرکے زیر زمیں دفن کردے۔

اور اس کے بعد دنیا میں حکمرانی رہے
آزادی، عدل و انصاف اور رفاقت کی۔

وہ سارا مرثیہ، جس کے ایک حصے کا ترجمہ اوپر درج ہے، فارسی ہفتہ وار ''شعلہ' انقلاب'' کے اکتوبر ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ان کے کچھ اور مضامین بھی، جو نفرت و حقارت سے پر تھے، اسی رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ اس طرح حکومت پر جو زبردست اعتراضات ہوئے، ان کی پاداش میں سخت ترین کارروائی کی گئی کیونکہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اظہار وجوہ کا کوئی نوٹس دئے بغیر یا قانونی عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر عینی کو ایک معینہ مدت کے لئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اور ان کی ننگی پیٹھ پر ڈنڈے سے پچھتر ضربات لگائی گئیں۔ لیکن چند ہی ماہ بعد روس کے انقلابی فوجی دستوں نے ان کی سر زمین پر قدم رکھا اور امیر کے جیل خانے سے انہیں رہا کرالیا۔ تاہم اس وقت تک ان کی صحت گر چکی تھی اور وہ دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ لہذا وہ اپنی صحت اور توانائی کو بحال کرنے کے لئے سمرقند چلے گئے تاکہ نئے سرے سے کام کرنے کی لگن پیدا ہوسکے۔

چونکہ وہ متعدد زبانیں اعلا استعداد کے ساتھ جانتے تھے اور انہوں نے تمام سائنسی علوم کا مطالعہ بھی کیا تھا، اس لئے انہیں ڈاکٹر آف فلولوجی (لسانیات) کی اعزازی سند دی گئی اور تاجیکستان کی اکیڈمی آف سائنسز کا صدر مقرر کردیا گیا۔ ان کی نثر نگاری کے پیش نظر، جن کو کئی جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا، اور جن میں ان کی ''یادداشت،، شامل ہے، انہیں ادب کا اسٹالن انعام بھی دیا گیا۔*

۱۵ جولائی ۱۹۵۴ء کو دو شنبہ میں ان کی وفات ہوئی۔ یعنی اسی جگہ جہاں تاجیکستان کے اس عظیم دانشور کو اس کی صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب منانے کے لئے دنیا کے ہر گوشے سے ہم سب جمع ہوئے تھے۔ خدا کرے، وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں۔

عینی کے بارے میں مزید معلومات

صدر الدین عینی ایک اعلا دانشور، مفکر اور مصنف ہی نہیں، پابند صوم و صلواۃ ایک دیندار متقی انسان بھی تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ جس سر زمین سے تعلق رکھتے تھے، وہ وسطی ایشیا کا ایسا علاقہ تھا، جہاں تقریباً تیرہ سال پہلے اسلام کے عہد اولین ہی میں اس دین متین کی شمع روشن ہوگئی تھی۔ خلافت راشدہ کا مبارک زمانہ، ۶۳۳ء سے ۶۶۰ء تک بظاہر بڑا مختصر تھا، لیکن خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رض کے عہد خلافت (از ۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) میں نور اسلام ایسا پھیلا کہ اس خطہ' ارض سے، جو بت پرستوں، مشرک ترکوں یا بدھ مت کے ماننے والوں کا مسکن تھا، تاریکی یکسر دور ہوگئی اور اس کی ضیاباریاں، کمتر درجہ پر سہی آج تک برقرار ہیں۔ عینی کے بزرگوں نے اسی فضا میں سانس لیا اور پیغمبر آخرالزماں صلعم کی ہدایات سے استفادہ کیا۔

وسطی ایشیا کا وہ علاقہ، جو جغرافئے کی تاریخ میں ترکستان کہلاتا تھا، آج بہت سی روسی ریاستوں پر منقسم ہے جن میں تاجیکستان، قفقاز، قازقستان اور ازبکستان وغیرہ شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت کے اور عصر حاضر کے بعض

مقامات کے ناموں میں تغیر و تبدل ہوگیا ہے ۔ حضرت عمر فاروق رض کے عظیم سپہ سالار احنف بن قیس رح نے مشہور شہر مرو فتح کیا تھا ۔ پھر حضرت امیر معاویہ رض کے دور حکومت (٦٦١ء تا ٦٨٠ء) میں ممتاز صحابی حضرت حکم بن عمرو غفاری رح کی قیادت میں مسلمانان عرب دریائے جیحون پار کرکے اسی علاقے میں داخل ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا جو خلفائے عباسیہ اور امویہ کے عہد میں بدستور جاری رہا ۔ دنیائے عرب کی سرحدیں ، چونکہ ایران اور افغانستان سے ملی ہوئی تھیں اور ترکستان کا علاقہ افغانستان کے عین شمال میں تھا ، اس لئے اسلام کے مبلغین کو اپنے لشکر لے کر صرف زمین کا سینہ طے کرکے یہاں پہنچنا ممکن تھا ۔

ترکستان میں فروغ اسلام

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد جب عربوں کی سر زمین پر طوائف الملوکی پھیلی تو مسلمانوں کے دوسرے مفتوحہ علاقے بھی اس لہر سے غیر متاثر نہ رہ سکے ۔ لیکن سیاسی موقف اور دینی عقائد عموماً الگ الگ رہے ہیں ۔ چنانچہ ترکستان کے وسیع علاقے میں حکومتیں تو بدلتی رہیں لیکن دین الٰہی کے ماننے والے اپنے مسلک پر جمے رہے ۔ ترکوں کے علاوہ منگولوں ، سامانیوں ، ساسانیوں اور غزنویوں کے قبیلے اقتدار حاصل کر کرکے اپنے اپنے پرچم لہراتے رہے لیکن اسلام کی شمع ہدایت کو مدھم کرنے کی جرأت کسی میں نہ ہوئی یا بصورت دیگر وہ اس حقیقت سے خالی الذہن نہیں رہے کہ مذہبی خیالات سیاسی مسالک پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں ۔ تاریخی واقعات کچھ بھی ہوں ، اس

حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس سرزمین پر بسنے والے مسلمان نسلاً بعد نسل کسی نہ کسی انداز میں پابند مذہب رہے ۔ انہوں نے ارکان اسلام پر خلوص نیت کے ساتھ عمل کیا ۔ نمازیں پڑھیں ، روزے رکھے ، طویل فاصلہ ہونے کے باوجود عازم سفر حج بھی ہوئے ۔ آج بھی صدیاں گزر جانے کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں روسی باشندے ، جو زیادہ تر جنوبی علاقے کی اشتراکی ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں ، ہر سال حج بیت اللہ کے لئے جاتے اور اس دینی فریضے کو انجام دیتے ہیں ۔ اس لئے یہ بات پورے یقین کے ساتھ تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اس ملک میں جسے اشتراکی نظام کے زیر اثر ہونے کے باعث لادینی کا مرکز کہا جاتا ہے ، کم سے کم اسلام کے ماننے والوں پر کوئی قدغن نہیں ہے اور جیسا کہ لینن کے اشتراکی منشور کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے ، ہر شخص کو اپنے عقائد کی حد تک آزادی میسر ہے ۔ صرف اتنی بات ہے اور اسے قابل اعتراض نہیں کہا جاسکتا کہ دین و مذہب کے نام پر سیاست میں یا نظام حکومت میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کی جاتی ۔ کوئی عیسائی رہے یا یہودی ، مسلمان رہے یا بودھی یا لادین ، ارباب اقتدار کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ اس سرزمین پر ہر چھوٹے بڑے شہر میں حتیٰ کہ قصبات اور دیہات میں بھی مسجدیں ، کلیسا ، مندر اور دوسری عبادت گاہیں موجود ہیں ۔ مسجدوں میں محراب و منبر کے زیر سایہ رکوع و سجود کرنے والے کثیر تعداد میں ملتے ہیں ۔ تاجیکستان اور ازبکستان کی ریاستوں میں تاشا خواجہ علمدار ، خواجہ عبیداللہ احرار ، ملا یعقوب چرخی ، خواجہ یعقوب جامی اور

حضرت اسمٰعیل بخاری کی مساجد بے حد شاندار اور مشہور ہیں ۔ یہ ان علاقوں میں ہیں جن پر مسلمانوں نے گیارہ سو سال تک باقاعدہ حکومت کی اور اپنے دینی اثرات ہر اعتبار سے اس طرح چھوڑے کہ ان کے لمعات آج تک نور اسلام پھیلا رہے ہیں ۔

ضیاء الدین بابا خانوف

ہر علاقے کے علمائے دین ، اعلا مذہبی پیشوا اور مفتی سمجھے جاتے ہیں جن میں جناب ضیاءُ الدین بابا خانوف بھی ایک نمایاں شخصیت کے حامل ہیں ۔ جنوبی حصہٗ سوویت یونین کی اکثر ریاستوں میں انہیں بیشتر لوگ اپنا روحانی باپ سمجھتے ہیں ۔ اور یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے کہ وسط ایشیا میں رہنے والے مسلمانوں کے ان سربراہ کا نام اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر دور دور تک احترام سے لیا جاتا ہے ۔ ایسے ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے ۔ موصوف دوبار پاکستان آئے ہیں اور ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی ہے ۔ انہوں نے ایک موقع پر کہ جب وہ ہمدرد لیبارٹری ، ہمدرد لائبریری اور ہمدرد مطب دیکھنے آئے تو پاکستان کو اپنا ہی وطن کہا تھا ۔ یہ ان کی بلند خیالی کا ثبوت ہے ۔ پاکستان کے لئے اس سے بڑی عزت افزائی اور کیا ہوسکتی ہے ۔

بابا خانوف ایک عالم دین کے خاندان میں پیدا ہوئے ۔ اس چیز نے بچپن ہی سے ان کی زندگی کا راستہ متعین کردیا ۔ ۱۹۱۳ء میں جب ان کی عمر صرف پانچ سال تھی ، انہیں مسجد طلحہ شیخ کے دینی مدرسے میں تعلیم پانے کے لئے بھیج دیا گیا ، جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پڑھنا لکھنا سیکھا ۔

اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں انہوں نے قرآن شریف پڑھا اور حفظ کرلیا ۔ اس کے بعد انہوں نے کوکل داش مدرسہ میں مشہور و معروف عالم دین یوسف خواجہ دوملا کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کی ۔ اسی زمانے میں وہ " بارک خانہ " کی جماعتوں میں جانے لگے جہاں مشہور عالم دینیات علاء الدین درس دیا کرتے تھے ۔ ۱۹۲۶ء میں وہ شیخ محمد سعید الاصالی کے مرید ہوگئے جو ایک ممتاز عالم دین تھے ۔ انہوں نے ان سے عربی تفسیر ، حدیث اور دوسرے مضامین پڑھے ۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے تربیتی نصاب مکمل کیا اور سند حاصل کی ۔ اگلے برس وہ تاشقند کی ایک مسجد میں امام مقرر ہوگئے ۔

۱۹۴۲ء میں ضیاءُ الدین بابا خانوف کے والد شیخ ایشان بابا خان ابن عبدالمجید خاں کی سعی و کاوش اور پہل کاری پر وسط ایشیا ، خصوصاً تاجیکستان اور قزاقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے قیام کا کام شروع ہوا اور اس طرح وہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کے مذہبی مرکز کے سرگرم منتظمین میں شامل ہوگئے ۔ انہوں نے اس زمانے کی مختلف مذہبی تنظیموں کے حاصل کردہ تجربے کا مطالعہ کیا ، نئے مذہبی ادارے کے تنظیمی اصول مرتب کئے اور اکتوبر ۱۹۴۳ء میں منعقد ہونے والی وسط ایشیا کے علمائے دین کی پہلی کنگرس کی تیاریوں میں حصہ لیا ۔ اس کنگرس نے وسط ایشیا اور قزاقستان کے مذہبی بورڈ کو مستقل بنیادوں پر قائم کردیا ۔ ان کے والد شیخ ایشان بابا خان اس مذہبی بورڈ کے چیرمین کثرت رائے سے منتخب ہوئے اور وہ خود قاضی مقرر کرلئے گئے ۔

اس وقت سے ضیاءُ الدین بابا خانوف کی دینی سرگرمیاں مذہبی بورڈ کے کاموں سے قریبی طور پر وابستہ رہیں - ۱۹۴۸ء میں وہ مذہبی بورڈ کے نائب صدر منتخب ہوگئے اور ۱۹۵۷ء میں ان کے والد کے انتقال کے بعد وسط ایشیا اور ملحقہ علاقوں کے مسلم نمائندوں کی کنگرس نے انہیں باتفاق رائے سے بورڈ کا چیرمین بنالیا - انہیں مفتی کے مصدقہ منصب پر بھی فائز کرلیا گیا -

مفتی بابا خانوف مذہب اسلام کے فروغ اور تبلیغ کے لئے بہت کچھ کام کر رہے ہیں - انہوں نے ” فقہُ السنه ،، نامی کتاب کا جو دنیائے اسلام میں بے حد مشہور ہے ، عربی سے تاجیک اور ازبک زبانوں میں ترجمہ کیا اور کتاب پر اپنی ذاتی رائے بھی پیش لفظ کی صورت میں لکھ دی - انہوں نے ایک رسالہ بھی مرتب کیا جس میں شریعت کے قوانین کی عمومی توضیح کی گئی ہے - انہوں نے عظیم مفکر اور طبیب بو علی سینا کی کتاب ” قانون ،، کو بھی مذکورہ بالا دونوں زبانوں میں منتقل کردیا - علم طب پر یہ ایسی مستند کتاب ہے جو آج تک درسی کتابوں میں شامل کی جاتی ہے -

مفتی ضیاء الدین بابا خانوف نے عملی طور پر سیاحت میں حصہ لیا تاکہ دور دراز علاقوں کے ہم مذہب بھائیوں سے ملیں - چنانچہ انہوں نے کراچی ، مکہ معظمہ ، بغداد ، قاهرہ اور دوسرے شہروں میں منعقد ہونے والی بہت سی اسلامی کانفرنسوں میں حصہ لیا اور مقالے پڑھے - وہ چھہ مرتبہ حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرچکے ہیں - سوویت یونین کی حکومت نے امن اور بین الاقوامی دوستی کی جد وجہد میں ان کی پرخلوص کاوشوں کا

اعتراف کرتے ہوئے انہیں ” تمغہُ اعزاز “ دیا ہے -

مفتی ضیاء الدین بابا خانوف اپنے خاندان کے ایک مثالی رکن اور ایک شفیق باپ ہیں - انہوں نے اپنے عزیزوں کو پاکیزگی ، صداقت اور محنت کی تعلیم دی اور کہا کہ اکل حلال کو ہمیشہ مدنظر رکھا جائے - ان کی سب سے بڑی لڑکی نفیسہ ایک گھریلو خاتون ، ایک مخلص شریک حیات اور چھہ پیارے بچوں کی ماں ہیں - ان کی دوسری بیٹی انیسہ ڈاکٹر ہیں - ان سے چھوٹے ان کے بیٹے شمس الدین اور بیٹی محسنہ عربی زبان سیکھ رہے ہیں - اور ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے مقالات لکھ رہے ہیں - سب سے چھوٹے دو بیٹے ابھی اسکول جاتے ہیں - اپنی نجی زندگی میں مفتی موصوف کو باغبانی کا شوق ہے - وہ روزانہ کچھ وقت نکال کر اپنے مکان کے باغیچے میں جاتے اور پودوں اور پھولوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں -

مفتی بابا خانوف ۱۹۶۸ء کے شروع میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کی تقریبات میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے تو وہ روسی مسلمانوں کے گیارہ رکنی وفد کے سربراہ تھے ، اسلئے کہ وہ اس وقت قاذقستان اور تاجیکستان کی اسلامی کونسل کے سربراہ تھے اور اسی نے انہیں نامزد کیا تھا - یہ کانفرنس نزول قران پاک کی چودہ سو ویں سالگرہ منانے کے سلسلے میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے بلائی تھی - اس موقع پر بابا خانوف نے سوویت یونین میں اسلام کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مفید معلومات فراہم کیں - انہوں نے بتایا کہ اس وقت روس میں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں اور ہر سال ان کی

تعداد بڑھ رہی ہے ۔ بڑی مسجدوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے اور اتنی آزادی ہے کہ اگر ایک بستی کے بیس مسلمان چاہیں تو اپنے لئے ایک مسجد تعمیر کرسکتے ہیں ۔ تاشقند کی بعض مساجد دو سو سال پرانی ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں ۔ مثلاً مسجد خوجہ اقرار پندرھویں صدی عیسوی میں اور خوجہ زوہراد سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں تعمیر ہوئی تھی لیکن ان کی دیکھ بھال اس طرح کی جاتی ہے کہ زائرین کو نو تعمیر معلوم ہوتی ہیں۔ یہی حال بخارا کی مسجد خوجہ زین الدین کا ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی ۔ قران پاک کے نسخے عام طور پر کتب فروشوں کی دکان پر فروخت نہیں ہوتے لیکن نجی ناشرین فرمائش پر مہیا کرتے ہیں ۔ اس طرح ہر مسلمان گھرانے میں اور مسجدوں میں قران پاک موجود رہتا ہے ۔ قران پاک کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جن میں علاقائی زبانوں میں ترجمے والے ایڈیشن بھی شامل ہیں ۔ یہ ان کے لئے ہیں کہ جو کلام پاک کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہیں ۔ قران کو حفظ کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے ۔ وہ ماہ رمضان میں تراویح میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں ۔ قران پاک کے علاوہ احادیث اور دوسری مذہبی کتابیں بھی چھپتی رہتی ہیں جن کی طباعت کا انتظام مذہبی بورڈ کرتے ہیں اور برائے نام قیمت پر فروخت کرتے ہیں ۔

بابا خانوف نے فرمایا کہ روسی مسلمان فریضہٴ حج ادا کرنے بھی جاتے ہیں ۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے کہ روسی جہازوں کو سر زمین عرب پر اترنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس

ضمن میں روسی مسلمان سعودی عرب کے فرمانروا پر زور ڈال رہے ہیں کہ کم سے کم حاجیوں کے جہازوں کو وہاں اترنے کی اجازت حج کے خاص موقع پر دیدی جائے ۔ بنیادی طور پر حکومت نے اس درخواست کو مان لیا ہے ۔ مسلمانوں کی شادیاں بھی اسلامی روایات اور احکامات کے مطابق ہوتی ہیں ۔ البتہ طلاق یا دوسرے تنازعات کی صورت میں جو شاذ و نادر ہوتے ہیں ، شادیوں کے اندراج سے متعلق مذہبی دفاتر کے علاوہ عدالتوں سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے ۔

انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے لئے مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ صلاحیت و استعداد رکھنے والے مسلمانوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا جائے ۔ بالفاظ دیگر مذہبی اعتبار سے باشندگان روس میں کوئی تخصیص نہیں کی جاتی ۔ بس اتنی بات ہے کہ مسلمان مذہبی تعلیم و تربیت سے قطع نظر قومی نظام تعلیم کے مطابق بھی سند حاصل کریں ۔ انھوں نے بتایا کہ روس میں تقریباً سو قومیتوں کے افراد آباد ہیں لیکن مذہبی عقائد سب کے یکساں ہیں جو زیادہ تر حنفی عقائد رکھتے ہیں لیکن اس لحاظ سے بھی ان میں کوئی امتیاز قائم نہیں ہے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ روسی مسلمان رابطہٴ عالمی اسلامی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ان کے نمائندے اس میں شریک ہوتے ہیں ۔

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے بارے میں انھوں نے اچھی رائے قائم کی اور پاکستان کی اس کوشش کو سراہا کہ اصل وقت سے بہت پہلے اس نے چودہ سو سالہ تقریبات منانے کے لئے اولین

قدم اٹھایا ہے۔ کانفرنس کی کامیابی پر گہرے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے امید ظاہر کی کہ پاکستان کے مسلمان بھائی آئندہ بھی اس ضمن میں پہل کرتے رہیں گے تاکہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔

جناب مفتی ضیاء الدین بابا خانوف جولائی ۱۹۷۸ء میں بھی پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کانفرنس کی نشستوں میں حصہ لینے کے علاوہ ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا جس میں تازہ ترین اعداد و شمار کی روشنی میں روسی مسلمانوں کی موجودہ تعداد اور ان کی موجودہ صورت حالات پر اظہار خیال کیا۔ ان کے بیان کے مطابق اب مسلمانوں کی تعداد چھہ کروڑ سے بھی بڑھ گئی ہے اور صدی ختم ہونے تک نو اور دس کروڑ کے درمیان ہوجائیگی۔ کانفرنس کی کاروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد مفتی موصوف نے کراچی میں ہمدرد کے دفاتر دیکھے اور ہمدرد کی لائبریری کے لئے قران پاک کا ایک نایاب تاریخی نسخہ پیش کیا جو راقم الحروف نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کا صدر ہونے کے اعتبار سے بصد شکریہ قبول کیا اور اپنی لائبریری میں بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ کرلیا ہے۔

''کافی بریک،، کے لئے مندوبین کے لئے کانفرنس ہال کی بالائی منزل پر بڑے سلیقے کا اہتمام تھا۔ شریک تو میں بھی ہوا، یہ دوسری بات ہے کہ لذت کام و دہن سے اجتناب کیا۔ البتہ باتیں دلچسپ ہوتی رہیں اور یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ ''کافی بریک،، ختم ہوا اور اجلاس دوبارہ شروع ہوگیا ہے۔ وہ تو مجھے چیکوسلواکیہ کے اسکالر نے بتایا کہ اب اجلاس میں چلنا

چاہئے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، تاہم فوراً اجلاس میں پہنچ گیا۔

نقاب کشائی مجسمۂ عینی و میکسم گورکی

لئے کانفرنس ہال کے ایک کونے میں دو مجسمے سفید برقعے اوڑھے تھے۔ دو بجے ان کی نقاب کشائی کی رسم ادا ہونی تھی۔ میں باہر آیا۔ جناب فیض صاحب میرے ساتھ آئے۔ میں نے کہا: ''جناب! یہاں تین مجسمے ہیں۔ دو وہ سامنے ہیں اور تیسرا میں ہوں،،۔

میرا لباس سفید تھا۔ مجسمے بھی سفید کپڑے اوڑھے ہوئے تھے۔ صرف وضع قطع مختلف تھی۔ فیض صاحب ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی بعض دفعہ بڑی معنی خیز ہوتی ہے۔

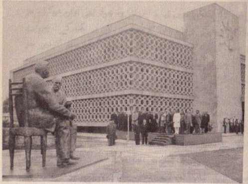
وزیراعظم تاجیکستان نے یہ رسم ادا کی۔ گرہ ذرا سخت ہوگئی تھی۔ ڈوری کھینچی، جھٹکا دیا مگر کسی طور کھل نہ سکی۔ ایک منتظم صاحب نے بھاگ کر گرہ ڈھیلی کردی۔ اس طرح نقاب گر پڑے۔ البتہ میری سفید شیروانی جوں کی توں رہی۔ سارے لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔ کانفرنس میں شامل ہونے والے مندوبین کے علاوہ سڑک پر بھی شائقین کا مجمع لگ گیا تھا۔ مگر اس قدر منظم تھا یہ مجمع کہ اس کا جواب نہیں۔ نہ کوئی دھکم پیل، نہ کوئی ہا ہو، یکسر خاموشی تھی۔ حالانکہ وہ گھنٹہ بھر سے زیادہ عرصے سے وہاں کھڑے تھے اور صبر و سکون کے ساتھ تقریریں سنتے رہے تھے۔

مجسمے میں دکھایا گیا تھا کہ میکسم گورکی اور صدر الدین عینی دونوں ایک جگہ کرسیوں پر برابر بیٹھے ہیں۔

گویا تبادل خیال کر رہے ہیں۔ بڑے دلکش مجسمے تھے۔ ان کا بت ساز بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی طرف سے ان کو مبارکباد دی اور طنز و مزاح کے ملے جلے انداز میں کہا کہ آپ نے دنیا کے بت کدوں میں ایک اور بت کا اضافہ کردیا ہے۔

صدر الدین کے بارے میں تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے ، البتہ میکسم گورکی کی شخصیت اس لحاظ سے قابل غور تھی کہ وہ عینی کے ہم عصر ہی نہیں ، ساری زندگی ہم جلیس ، ایک دوسرے کے غم میں شریک اور ہر کام میں ساتھی رہے تھے۔

میکسم گورکی دراصل قلمی نام تھا الیکسی میکسیمو فچ پیشکوف کا جو ۱۸٦۸ء میں پیدا ہوئے اور بہت سی کتابیں لکھ کر ۱۹۳٦ء میں فوت ہوگئے۔ وہ صغر سنی ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ ان کی پرورش اور گھر کے گزارے کے لئے کوئی سہارا نہیں تھا ، نہ کہیں سے امداد مل سکتی تھی۔ اس لئے ان کی بیوہ ماں نے ، جس کے لئے دوسری شادی بھی ممکن نہیں تھی ، حالات سے مجبور ہوکر کچھ غلط ناجائز طریقے اختیار کئے جن میں لغزشیں شامل تھیں۔ وہ ماں کی اس روش کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن ماں کے لئے زندگی کے سب سے اہم مسئلے کا کوئی اور حل بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں سے باز پرس کی اور اپنے طفلانہ انداز میں اسے سمجھایا بھی کہ وہ اپنے اطوار بدل دے لیکن ماں کے لئے دوسرا چارۂ کار نہیں تھا۔ کم سن بچہ بارہ سال کی عمر میں گھر سے فرار ہوگیا۔ اس کو اپنی اور اپنی ماں کی وہ زندگی پسند نہیں تھی۔ لیکن اس عمر میں کوئی اور بہتر زندگی گزارنا



تقریبات نقاب کشائی مجسمۂ عینی و گورکی۔



مجسمۂ صدرالدین عینی و میکسم گورکی۔ان ہم عصر دانشوروں کے حضور گل ہائے عقیدت پیش کئے جا رہے ہیں۔

بھی اس کیلئے ممکن نہیں تھا ۔ اس لئے وہ خود بھی آوارہ ہوگیا ۔ ہر قسم کی بد چلنی کے داغ اس کے معصوم دامن پر لگ گئے ۔ اس نے اس عہد کی تمام یاد داشتیں کتابی صورت میں جمع کردیں جو "میرا بچپن" کے نام سے شائع ہوئی ہیں ۔ وہ حقیقت پسندانہ اسلوب نگارش کا شاہکار ہے ۔

جب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ گورکی کا شعور بیدار ہوا تو انہوں نے ماں کی مجبوریوں کو محسوس کیا اور جواز پیدا کرلیا ۔ انداز فکر میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی ۔ اب اظہار ناراضگی کے بجائے ماں کا احترام ان کے دل میں پیدا ہوگیا اور وہ ان کے سامنے جھک گئے ۔ انہوں نے ہر شخص کی ماں کو، خصوصاً اپنی ماں کو لائق تعظیم کہنا شروع کیا ۔ اپنے انہی خیالات و احساسات کو انہوں نے ایک اور کتاب "ماں" میں، جو ناول کے انداز میں لکھی گئی، جمع کردیا ۔ یوں تو ان کی ہر تحریر کی قدر و منزلت ہوئی اور ان کے خیالات کو سراہا گیا لیکن "ماں" کو روسی ادب میں بڑا درجۂ قبول حاصل ہوا ۔ اسے گورکی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔ انہوں نے اور بھی کئی ناول، ڈرامے اور مختصر کہانیاں لکھیں، جو ان کی قوم کے لئے سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی ہیں ۔

وہ ٹالسٹائی کے ہم عصر تو نہیں کہے جاسکتے کیونکہ موخرالذکر عمر میں ان سے پچاس سال بڑے تھے لیکن گورکی نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور اسی لئے ان کا احترام کرتے تھے ۔ البتہ مشہور افسانہ نگار چیخوف اور ناول نگار صدرالدین عینی گورکی کے ہم عصر تھے ۔ ان کی عمروں میں محض چند سال کا فرق تھا ۔





شاید اسی اعتبار سے تاجیکستان کے ارباب اقتدار نے گورکی اور عینی کو ایک دوسرے کا هم جلیس ثابت کرنے کے لئے ایک هی مجسمے کی صورت میں قریب قریب بٹھا دیا ۔ اس اعتبار سے جس مشترک مجسمے کی نقاب کشائی ہوئی ، وہ میرے نزدیک تاریخی اهمیت کا حامل هے ۔

اسی سال ماہ ستمبر میں ٹالسٹائی کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ پیدائش کا جشن منایا جائیگا ۔ ٹالسٹائی نے عوامی ذهنوں کو جس طرح متاثر کیا هے ، اس کے بارے میں روسی ادیب بار بار زور دیتے رهے هیں ۔ ٹالسٹائی کی وفات سے دس سال پہلے آنتن چیخوف نے لکھا تھا :

" مجھے ٹالسٹائی کی موت کے تصور سے خوف آتا هے ۔ اگر ان کی وفات ہوگئی تو میری زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا هو جائیگا ۔ ان کے بغیر همارے ادیب کی حیثیت بھیڑوں کے ایک ایسے گلے کی سی رہ جائیگی جس کا رکھوالا کوئی نہ هو "۔

بیس سال پہلے روسی ناول نگار اور افسانہ نویس آئیوان ترگنیف نے بھی سوچا تھا اور ٹالسٹائی کی وفات کے دو سال بعد الیکساندر بلاک نے بھی یہی خیال ظاهر کیا تھا کہ ٹالسٹائی کی وفات سے ترقی پذیر دانشور اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگیں گے ۔

کانفرنس کے دوران هر موقع پر اور نقاب کشائی کے وقت اجتماع میں بھی میرا لباس سب کے لئے توجہ کا مرکز رہا ۔ سارا سفید لباس ، اچکن ، علی گڑھ شرعی پاجامہ ، سفید موزے اور سفید جوتے تک — لوگ اوپر سے نیچے تک دیکھتے تھے ۔ میں



مجسمہ صدر الدین عینی پر گل ہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے صدر جمہوریہ تاجیکستان اور رفقاء قدم زن هیں ۔



مندوبین کنگرس عالمی صدر الدین عینی ،مجسمہ عینی پرگل ہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع هیں ۔

بڑا خوش ہوتا تھا کہ میں نے اپنے لباس میں کوئی تبدیلی نہ کرکے اپنے لئے ایک انفرادیت پیدا کرلی ہے ۔ یہ میرے لئے موجب فخر و انبساط تھا ۔

پاکستان میں مجسمہ سازی ؟

ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف نے کہ جو میرے مترجم تھے نقاب کشائی کی رسم ادا ہونے کے بعد سوال کیا :

''کیا پاکستان میں مجسمہ سازی ہوتی ہے اور کیا مجسمے وہاں لگائے جاتے ہیں ،،۔

میں نے نفی میں جواب دیا اور فوراً سینکڑوں سال پہلے کا وہ واقعہ یاد دلایا کہ جب محمود غزنوی نے زر و جواہر کی پیشکش قبول کرنے کے بجائے سومناتھ کے مندر کا بت توڑ ڈالا تھا اور اس ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھ کر اس کا ترجمہ کر دیا :

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

انہیں خود بھی پاکستان کا مزاج معلوم تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی اساس اور بنیاد اسلام ہے اور اسلام میں مجسمہ سازی کی اجازت نہیں ہے ۔ اس کا مزاج بت شکنی ہے ، بت سازی نہیں ہے ۔ بت شکنی کے بعد ہی تو کعبہ وجود میں آیا تھا ۔ مگر یہ کعبہ کی چوکور عمارت مرکز عبادت نہیں ہے بلکہ اسے ایک سمت کی حیثیت حاصل ہے ۔ اصل مرکز عبادت تو ذات باری تعالیٰ ہے ۔ کعبہ تو مقام اجتماع مرکز ہے ۔ اس چوکور عمارت کے اوپر کھڑے ہوکر ہی





حضرت بلال حبشی رح نے اذان دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا :
" اللہ بڑا ہے ، اللہ بڑا ہے ، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں "۔
شاعر کی زبان میں یوں کہا گیا ہے :

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں ، لا الٰہ الا اللہ

روس میں سب سے زیادہ قابل تعریف مجسمے تو لینن کے ہیں۔ ہر جگہ ، ہر مقام پر ، ہر سڑک کے چوراہے پر ، ہر کتاب میں اور یہی نہیں ، ہر دماغ میں لینن کا مجسمہ موجود ہے یا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ کوئی ذہن اس سے خالی نہیں ہے۔ لینن کو انہوں نے خدا بنا دیا ہے۔ مرکزیت اسے ہی حاصل ہے۔ لینن ہی کے نقطۂ فکر سے چین میں انقلاب برپا ہوا تھا مگر وہاں کا خدا اب بدل چکا ہے۔ وہاں اب ماؤ چینیوں کا خدا ہے۔ روس و چین دونوں واحد نظریاتی سرحدیں رکھتے ہیں مگر سیاسی اختلاف نے ایک کے بجائے دو خدا کردیئے ہیں اور اس طرح نہ جانے کتنے خدا اور وجود میں آجائیں گے۔ کم ال سنگ نام کا ایک اور خدا کوریا میں زیر تعمیر ہے۔

نقاب کشائی کے بعد روس کا قومی ترانہ بجایا گیا۔ سب لوگ ست کھڑے رہے۔ نہ صرف شرکائے کانفرنس بلکہ سڑک پر موجود مجمع بھی ساکت و صامت رہا اور جب تک ترانہ ختم نہ ہوا کوئی اور آواز کان میں نہ آئی۔ پھر عام لوگ ان مجسموں کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھے۔ میں نے قریب جا کر فنی کار گزاری کے اعتبار سے بغور دیکھا۔ پھول ان کے قدموں میں احترام و عقیدت کے ساتھ رکھے جارہے تھے۔ محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ

بھی آگے بڑھیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر دونوں مجسموں کو پرنام کیا اور پھر ڈنڈوت کے انداز میں گورکی اور عینی کے چرنوں کی داسی بن گئیں۔ اسقدر جھکیں کہ چرنوں میں لیٹ گئیں۔

میرا لباس قابل غور

مجسموں کے برقعے اور میرے لباس سے متعلق بیان کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ مناسب ہے کہ اس کو میں یہاں لکھ ہی دوں۔ یہ ١٩٤٨ء کا ذکر ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے علاقائی مرکز یعنی ایسٹرن میڈی ٹرینین ریجن کے مرکز اسکندریہ کے زیر اہتمام قاہرہ میں علاقائی اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں شرکت کے لئے حکومت سندھ نے میرا نام تجویز کیا۔ واقعہ یہ ہے اور سچ بات یہ ہے کہ اس وقت سندھ کے وزیر صحت میرے جگری دوست سید میراں محمد شاہ صاحب تھے۔ میں نے ان سے بغیر غور و فکر کہ دیا کہ میں اس اجلاس میں جانا چاہتا ہوں اور سیدی شاہ صاحب نےمیرا نام بغیر غور و فکر منظورکردیا۔ بھلا ڈاکٹر لوگ اس فیصلے کو کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ مسئلہ خاصا الجھ گیا۔ سید میراں محمد شاہ کو بھی ضد ہوگئی۔ وہ اس وقت کے مرکزی وزیر صحت جناب عبدالستار پیرزادہ صاحب سے ملے اور بالآخر ان سے تحریری اجازت نامہ میری شرکت وفد کے لئے حاصل کرلیا اور میں قاہرہ روانہ ہوگیا۔ جناب حبیب اللہ بہار صاحب (مشرقی پاکستان کے وزیر صحت) وفد کے قائد تھے۔ کرنل آفریدی (عالمی ادارۂ صحت میں ملیریا کے ماہر) کرنل صدیقی (سرجن) اور جناب جی اے مدنی (ڈپٹی سیکریٹری،

مرکزی وزارت صحت ، پاکستان) تین اراکین تھے اور چوتھا رکن میں تھا۔ مدنی صاحب کے نام پیرزادہ صاحب نے کوئی خط دیا تھا۔ شاید یہ ھدایت کی گئی تھی کہ مجھے وفد میں شریک رکھا جائے۔ یا ممکن ھے کوئی اور ایسی ھی ھدایت ھو۔ آج تک مجھے یہ راز نہیں بتایا گیا۔

کرنل آفریدی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ جب ہم کانفرنس ھال میں پہنچے تو سب کو پروگرام اور متعلقہ کاغذات دئے جارھے تھے۔ کرنل آفریدی صاحب نے واضح طور پر منع کردیا اور کاغذات مجھے نہیں ملے۔ کرنل صدیقی صاحب کا رویہ بھی بڑا خراب تھا۔ طب مشرق کی وہ تحقیر کرتے تھے اور بار بار کرتے تھے۔ جناب مدنی معتدل تھے۔ انھوں نے یہ پتہ ھی نہ چلنے دیا کہ اس وفد میں میری حیثیت کیا ھے۔ ویسے ان کا انداز مشفقانہ تھا۔ اسکندریہ میں جب تمام وفود کے اعزاز میں لنچ ھوا اور لنچ اسی جگہ ھوا کہ جہاں **جنگ** عظیم میں اسٹالین ، روزویلٹ اور چرچل جمع ھوئے تھے تو اس لنچ میں سور کا گوشت بھی شامل تھا۔ میں بالکل تمیز نہیں کرسکتا تھا۔ جناب مدنی صاحب آپے سے باھر ھوگئے۔ انھوں نے احتجاجاً لنچ سے اٹھ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس احتجاج میں انھوں نے مجھے بھی شریک کرلیا۔ ھم دونوں اٹھ گئے۔ ھمارے باقی ساتھی بیٹھے رہ گئے۔ ھم دونوں نے شہر کا رخ کیا اور بازار میں کبوتر کا شوربہ پیا اور کسی جگہ سے روٹی لے لی۔ غرض جب تک اھرام مصر کے سامنے ھوٹل میں لنچ ختم ھوا ، ھم دونوں اسکندریہ کی گلیوں میں گھومتے رھے۔

مدنی صاحب کی یہ بات بڑی دل کو لگی اور میں ان کے احترام میں زیادہ مستعد ھوگیا۔ یاد آتا ھے کہ قصر شاھی میں ھمارا وفد بھی شاھی کتاب پر دستخط کرنے گیا۔ وھاں مدنی صاحب نے اپنے دستخط ”محمد علی جوہر“ کئے۔ یہ بات میری سمجھ میں جب بھی نہ آئی تھی اور اب بھی نہیں آئی ھے۔

کرنل آفریدی اور کرنل صدیقی دونوں میرے پیچھے پڑے ھوئے تھے۔ میں مدنی صاحب کی حفاظت میں تھا۔ ان کا یہ احسان مجھے یاد ھے۔ مدنی صاحب اس زمانے میں چمڑے کی فوجی اسٹک ھاتھ میں رکھتے تھے اور جب ضرورت پڑتی ، وہ اسٹک مجھے تھما دیتے تھے اور میں اس کی حفاظت کرتا تھا۔ اس سے میں تنگ آگیا۔ ایک جگہ انھوں نے اسٹک مجھے دی اور میں نے لے لی اور جہاں ھم تھے، وھیں میں نے چھوڑ دی۔ اور جب مدنی صاحب نے واپس مانگی تو میں نے کہ دیا کہ آپ نے جہاں دی تھی، میں وھیں چھوڑ آیا ھوں۔ مدنی صاحب کا میں نے یہ نقصان کیا۔ میں اسے آج بھی یاد کرتا ھوں مگر میری طرف سے یہ بغاوت تھی۔

کرنل آفریدی صاحب نے ایک دن کہا :

”آپ یہ کیا لباس پہن کر آئے ھیں۔ شیروانی سے قاھرہ کے لوگ نفرت کرتے ھیں (They look down upon this dress.)

مجھے کرنل آفریدی کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ میں نے ان کو کوئی جواب نہیں دیا مگر اس دن یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس اچکن اور شیروانی کی دنیا بھر میں عزت کراؤنگا

اور میں نے اپنا یہ لباس کبھی تبدیل نہیں کیا۔ دنیا بھر میں اسی لباس سے پھرتا ہوں۔ اب کوئی اس کی تحقیر نہیں کرتا۔ مجھے اس پر فخر ہے۔

جامعۂ تاجیکستان

آج کا پروگرام نہایت اچھا رہا کہ جامعۂ تاجیکستان جانے کا موقع ملا۔ رئیس الجامعہ بابا جان پولاد تھے۔ وہ تاجیکی ہیں اور بہت نفیس انسان ہیں۔ ان کے چہرے پر ڈاکٹر محمود حسینیت ہے اور ان کا انداز بڑا سنجیدہ ہے اور پر از محبت و شفقت۔ ان سے مل کر واقعی دل خوش ہوگیا۔ انہوں نے جامعۂ تاجیکستان کے بارے میں چند باتیں بتائیں جو میں نے ذہن میں بٹھالیں مثلاً:

(۱) آج سے تیس سال قبل جب سوال کیا جاتا تھا کہ کوئی پڑھا لکھا ہے، تو جواب دیا جاتا کہ "ملا" مگر اب یہ بات نہیں ہے۔ یہاں ہر شخص تعلیم یافتہ ہے۔

(۲) آج سے تیس سال قبل جب یہ جامعۂ تاجیکستان قائم ہوئی تھی تو اس میں صرف چودہ استاد تھے اور دو سو طالب علم۔ اب اس جامعہ میں چودہ تو پی ایچ ڈی ہیں اور درجنوں دوسرے استاد ہیں۔ طالب علم بارہ ہزار ہیں جن میں آدھے لڑکے اور آدھی لڑکیاں ہیں۔

(۳) اس وقت جامعۂ تاجیکستان میں سترہ فیکلٹیز ہیں۔

(۴) ہم منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ یعنی ہمیں تعمیر ملت و وطن کے لئے جس شعبے میں جس مہارت کی حاجت

ہوتی ہے، ہم طلبہ کو اسی انداز پر تعلیم دیتے ہیں تاکہ تعمیر کا کام بند نہ ہو اور خود طالب علم فارغ تعلیم ہوکر اپنے وقت و طاقت کو ضائع نہ کرسکے بلکہ اس کے لئے کام مہیا ہو۔

(۵) تعلیم دو زبانوں میں ہوتی ہے۔ روسی زبان اور تاجیکی یعنی فارسی زبان۔ اس وقت ستر فیصد طلبہ تاجیکی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صرف تیس فیصد روسی زبان میں۔

جامعۂ تاجیکستان کے بارے میں تمام معلومات پر مشتمل روسی زبان میں ایک کتابچہ دیا گیا جو میں نے محفوظ کرلیا۔ جناب رئیس الجامعہ سے ملاقات دلچسپ رہی۔ اس کے بعد طلبہ سے ملاقات تھی۔ جناب بابا جان پولاد صاحب کے معیت میں ہم سب جامعہ کے اسمبلی ہال میں گئے۔ یہاں کم از کم ایک ہزار طلبہ، لڑکے اور لڑکیاں، موجود تھے۔ انہوں نے زبردست تالیوں سے ہم سب کا استقبال کیا۔ بیشتر طلبہ و طالبات کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ وہ میرا لباس بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ مجھے کرنل آفریدی یاد آگئے۔ کئی سال گزرنے کے بعد وہ میرے اچھے دوست ہوگئے تھے۔ ان کی قاہرہ والی زیادتی میرے دل پر نقش تھی مگر میں نے اپنی طرف سے کبھی ان کے احترام میں فرق نہیں آنے دیا اور بالآخر حسن اخلاق سے ان کو ہر طرح جیت لیا۔ ہم مندوبین اسٹیج پر بیٹھ گئے۔ جناب رئیس نے فرداً فرداً سب کا تعارف کرایا۔ سب سے پہلے پاکستان کا نمبر آیا۔ انہوں نے جناب فیض احمد فیض صاحب کا تعارف کرایا۔ فیض صاحب اس

علاقے میں پہلے سے معروف ہیں ۔ ان کے لئے زبردست تالیاں بجائی گئیں ۔ دوسرا تعارف میرا تھا اور خوب تھا ۔ طلبه و طالبات نے میرا بھی اسی جوش و خروش سے استقبال کیا ۔ پاکستان سے ان سب کو خاص دلچسپی تھی ۔ هندستان کے بعد دوسرے ممالک کے وفود متعارف ہوئے ۔

اس تعارف کے بعد در حقیقت محفل شعر و ادب برپا ہوئی ۔ جناب رئیس نے انتخاب کر کے فرداً فرداً دعوت خطابت دی ۔ اولاً جامعۂ تاجیکستان کے ایک استاد اور ایک طالب علم نے خطاب کیا ۔ اس کے بعد مندوبین کو دعوت دی گئی ۔ جناب فیض نے اپنا کلام سنایا ۔ جناب علی سردار جعفری نے بھی اپنا ایک ترقی پسند کلام پیش کیا ۔ پھر چیکوسلوواکیه، بلغاریه ، افغانستان وغیرہ کی باری آئی ۔ پھر روسی ریاستوں وغیرہ کے نمائندوں نے نظم و نثر میں خطاب کیا ۔ مجموعی طور سے یه مجلس خوب رہی ۔ طلبه میں تنظیم قابل قدر تھی ۔ یہاں کسی طالب علم اور طالبۂ علم میں امتیاز نه تھا ۔ سب ملے جلے بیٹھے تھے ۔ اخلاقی اقدار بلاشبه بلند ہیں ۔

آخر میں طلبه نے اپنا پروگرام رقص و سرود پیش کیا جو مجموعی طور پر بڑا دلچسپ تھا ۔ اس دوران میں طلبه نے آٹوگراف کی مہم شروع کردی اور جب تک ہم جامعه سے رخصت ہوئے ، میں آٹوگراف بکس پر دستخط کرتا رہا ۔ موٹر میں سوار ہوتے ہوئے بھی کم از کم پانچ کتابوں پر ”جاگو جگاؤ“ لکھ کر دستخط کردئے اور پاکستان ہر جگه لکھا ۔ طلبه میں بڑا جوش و خروش تھا ۔ تصاویر بھی لی گئیں ۔ جناب رئیس الجامعه کے

ساتھ بھی میری کافی تصویریں لی گئیں ۔ شاید مجھے ایک دو مل جائیں ۔

ڈرامه ۔ زندگیٔ عینی

اس دن شہر میں دو جگه عینی ڈرامے ہورہے تھے ۔ ایک جگه ”زندگیٔ عینی“ موضوع تھا اور دوسری جگه عینی کی کتاب ”دو خند“ پر ڈرامه مرتب کرکے پیش کیا جارہا تھا ۔ ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب نے سوال کیا ، کہاں چلنا چاہتے ہیں ؟ میں نے جواب دیا ، جہاں آپ لے جانا چاہیں ۔ وہ مجھے عینی اوپیرا لے گئے ۔ روسی زبان میں عینی اوپیرا اس طرح لکھتے ہیں :

AHHH OΠEPA

آج کے ڈرامے کے مصنف جناب سیف الدین شرف الدین تھے ۔ وہ خود بھی وہاں موجود تھے ۔ ان سے ملاقات ہوئی ۔ جناب نذر صاحب ، وزیر ثقافت بھی موجود تھے ۔ اور پروفیسر امیر سعید امیر شکر بھی دیکھنے آئے تھے ۔ میں نے ان کو ”شیر و شکر“ که کر خطاب کیا ۔ بڑے خوش ہوئے ۔ وہ مفہوم کو سمجھ گئے ۔

ڈرامه عینی کی زندگی پر تھا ۔ ان کا زمانۂ عسرت ، پھر ان کا تحصیل علم کے بعد ”جاگو جگاؤ“ کی تحریک جسکی مخالفت ہوئی ۔ ایک ملا کو دکھایا گیا تھا که وہ جاسوس بنا اور امیر بخارا کی فوج یا پولیس کو عینی اور ان کے رفقاء کی نشان دہی کرتا تھا ۔ اس ملا کا کردار یه دکھایا گیا که وہ سب کچھ روپے پیسے کے لالچ میں کرتا تھا اور پھر وہ ذلیل و خوار ہوا ۔

عینی کی پیشی امیر بخارا کے سامنے ہوئی ۔ وہ پابجولاں دربار میں لائے گئے مگر انہوں نے امیر بخارا کے سامنے مظاہرہ جرات کیا جس سے امیر ناراض ہوگیا اور ان کو مع رفقاء جیل میں ڈال دیا گیا ۔ بالآخر روسی فوج سرخ جھنڈا لے کر جیل میں آگئی ۔ عینی نے بڑھ کر سرخ پرچم کو چوم لیا ۔ تمام قیدی فرط مسرت کے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگے اور ’’ انقلاب زندہ باد ،، کی صداؤں سے جیل گونج اٹھی ۔ امیر بخارا کا دور ختم ہوا اور روسی حکومت کا آغاز ہوا اور انہیں غربا کے لئے جدوجہد کا پورا پورا صلہ ملا ۔ وہ عظیم انسان قرار پائے ۔ انہوں نے اپنی زبان و قلم سے ایک ایسی بیداری پیدا کی کہ جو ترقیٔ وطن پر منتج ہوئی ۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ڈرامے دیکھے ہیں ۔ اپنے بچپن میں لیلیٰ مجنوں اور قتل تمیزن سے لے کر دنیا بھر میں بڑے بڑے ڈرامے دیکھے ہیں ۔ اٹلی میں ، نیو یارک میں ، اور چین میں ۔ غرض یہ کہ کہاں نہیں دیکھے ۔ مگر تاجیکستان کا یہ اوپیرا ہر اعتبار سے خوب تھا ۔ کردار ، سیٹنگ ، لباس ، مکالمے ۔ غرض ہر چیز کو میں نے اس کے عروج پر پایا ۔ حیرت ہوئی اور بے پناہ مسرت بھی حاصل کی ۔

تھیٹر اور اوپیرا کے شوقین

اس وقت سوویت یونین کے دارالحکومت ماسکو میں چونتیس اور پورے ملک میں پانچ سو ساٹھ سے زیادہ تھیٹر اور اوپیرا ہیں ۔ ان میں سے سترہ تاجیکستان میں ہیں ۔ بعض تھیٹر صرف بالغوں کے لئے مخصوص ہیں اور بعض صرف بچوں کے لئے ۔ عورتوں اور مردوں کے لئے الگ کوئی انتظام نہیں ہے ۔ سب

ایک ساتھ دیکھتے ہیں ۔ تھیٹر میں اور اوپیرا میں کام کرنے والے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو باقاعدہ اداکاری کی تربیت دی جاتی ہے ۔ اس مقصد کے لئے متعدد اسٹوڈیو اسکول قائم ہیں ۔ ماسکو کے اسٹوڈیو اسکول کے مشترک ڈائرکٹر پروفیسر وکٹر مونی یوکوف ہیں ۔ گویا ایسے اسکولوں کو بھی درسی اسکولوں کا مرتبہ دیا جاتا ہے اور ان کے معلم بھی پروفیسر کہلاتے ہیں ۔ ایک خاتون لیوڈ میلا بیلو سودا جو خود بھی اداکاری کے فن سے بخوبی واقف ہیں ، اور اکثر ڈراموں میں حصہ لیتی رہتی ہیں ، ایک اسکول کی ڈائرکٹر ہیں ۔ تربیت پانے والے طلبہ کو اس وقت اسکول سے ڈپلوما ملتا ہے جب ان کا کوئی ڈرامہ اسٹیج پر مقبول ہوجائے اور ان کی اداکاری کو عام طور پر سراہا جائے ۔ ان تھیٹروں میں کلاسیکی مصنفین کے ڈرامے بھی پیش کئے جاتے ہیں ۔ ان میں روسی اور غیر روسی ہونے کی تخصیص نہیں ہے ۔ مثلاً انتون چیخوف کا ’’ چچا دانیا،، بائرن کا ’’ دان جوان،، پائری بیور مارچائس کا ’’ سیوائل کا حجام ،، اور بچوں کے لئے ہنس اینڈرسن کی لکھی ہوئی پریوں کی کہانیاں ڈرامے کے انداز میں پیش کی جاتی رہی ہیں ۔ عموماً ایسے ڈرامے کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ جو حقیقت پسندی ، سچائی اور انسانی ہمدردی کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں ۔ منتظمین کا خیال ہے کہ حقیقی تھیٹر اور اداکاری کی تشکیل سخت محنت ، فن کی لگن اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے ممکن ہوتی ہے ۔ گزشتہ نصف صدی میں بہت سے ڈرامہ نویس اور اداکار بام شہرت پر پہنچ کر عوام سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں ۔

ٹالسٹائی کا مشہور ناول ”جنگ اور امن ،، اسٹیج پر اور فلم کے پردے پر یکساں مشہور ہوا ہے ۔ اسے بیلے کی صورت میں بھی پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ روسی شاعر الیکساندر بلاک نے اس ناول کے بارے میں کہا تھا : ”جب میں اسے پڑھتا یا اس کا تصور کرتا ہوں تو محسوسات پھیل کر میری پوری زندگی اور ہر اس شے کا احاطہ کرلیتے ہیں جو مجھے قریب سے عزیز ہے ،، ۔ ناول کو فلم کے پردے پر پیش کرنے والے ڈائرکٹر سرگئی بونڈارچک نے ان الفاظ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا : ”فلم سازوں ، تھیٹر والوں ، فن کاروں اور موسیقاروں کے لئے لیو ٹالسٹائی میں بڑی کشش ہے ،، ۔

ابوالقاسم لاہوتی

تاجیکستان کے اسی عہد کے ایک مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس ابوالقاسم لاہوتی تھے جو عینی کے ہم عصر ہی نہیں ، ان کے قریبی ہم جلیس بھی تھے ۔ ان کے نام کے ساتھ عموماً استاد کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا ۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردی تھیں ۔ ١٩٢٠ء میں جب انقلاب کی صبح تاجیکستان میں نمودار ہوئی تو ملک مفلسی اور معاشی بربادی کا شکار تھا ۔ خوفناک وبائیں ان پڑھ انسانوں کو اپنا لقمہ بنا رہی تھیں ۔ پھر بھی کچھ لوگ امیر بخارا کو دوبارہ تخت پر بٹھانا چاہتے تھے جو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ، اسلئے کہ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود انقلاب نے ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی تھیں ۔ سرکاری اداروں میں غریبوں کے نمائندے شامل ہوگئے تھے ۔ نئے انقلاب کی جدوجہد

ہر سمت شروع ہوگئی تھی ۔

اس موقع پر ابوالقاسم لاہوتی نے نصابی کتابیں تیار کیں اور تاجیکستان میں اولین اشاعت گھر کی بنیاد ڈالی ۔ انہوں نے نئے طرز زندگی اختیار کرنے کے لئے ترقی پسند نظمیں لکھیں اور اپنے خیالات کو ڈراموں کی صورت میں سمودیا ۔ ان کے نغمے اور مکالمے ہر شخص کی زبان پر آگئے ۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں عوام کے دشمنوں پر کاری ضربیں لگائی تھیں اور نئی زندگی کی تعمیر کی دعوت دی تھی ۔ اسلئے وہ بہت جلد مقبول ہوگئے ۔ صدرالدین عینی ان کے ہر حال میں شریک کار رہے ۔ ان دونوں نے مل کر عوامی ثقافت کا پرچم بلند کیا ۔

لاہوتی دراصل ایرانی النسل تھے ۔ اپنے وطن میں بھی انہوں نے انقلابی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کردیا تھا ۔ گرفتاری ، سزائے موت اور فرار ان کا مقدر بن گئے ۔ وہ ترک وطن کرکے ترکی چلے گئے اور کچھ عرصے جلا وطنی کی زندگی گزارتے رہے ۔ پھر تاجیکستان آگئے ۔ یہ ان کا دوسرا اور آخری وطن بن گیا ۔ ظاہر ہے کہ ان مصائب اور نشیب و فراز سے گزرنے والا شخص اپنے ڈراموں میں قلم اور تلوار کو ایک ساتھ چلا کر ہی آگے بڑھ سکتا تھا ۔ انہوں نے صرف کلاسیکی روایات ہی کو جاری نہیں رکھا بلکہ نئے ذرائع اظہار تخلیق کئے ۔ اشتراکی انقلاب کی آتش فروزاں میں ان کی شاعری اور ڈرامہ نگاری کندن کی طرح چمکنے لگی اور اس میں شدت و توانائی پیدا ہوگئی ۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تیس سے زیادہ سال ادب اور فنی تعمیر کے لئے وقف کردیئے اور مقصد کی تکمیل کی ۔ اسلئے وہ اب بھی

زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔

ڈرامہ ختم ہونے کے بعد رات ساڑھے گیارہ بجے واپس مہمان خانے آیا تو صدر دروازے پر فیض احمد فیض صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ سردار جعفری بھی تھے۔ جعفری صاحب کی بیگم صاحبہ اور محترمہ عصمت چغتائی ڈرامے میں میرے ساتھ تھیں ۔ میں ذرا پہلے آگیا تھا ۔

مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب تھک کر چور ہوگئے ہیں اور مضمحل سے نظر آرہے ہیں ۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آج کھانا نہیں کھاؤنگا ۔ وہ اصرار کرتے رہے اور میں انکار ۔ آخر وہ اجازت لے کر اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے ۔ جناب فیض نے فرمایا ”آج آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے“ ۔ میں راضی ہوگیا اور پھر ہم سب مہمان خانے کے کمرہٗ طعام میں جا بیٹھے ۔ وہاں خواتین بے چاری صبح کے ناشتے کے لئے میزوں کو قرینے سے درست کررہی تھیں ۔ بارے انہوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ہم سب کو کھانا کھلایا ۔ میں اب تک گوشت سے پرہیز کرتا رہا تھا ۔ آج شامی انداز کے کباب نوش جاں کر ہی لئے ۔ پتہ چلا کہ یہاں ذبیحہ مل جاتا ہے ۔ اللہ ہی جانے ۔ جہاں ہر کام میکانائزڈ ہو وہاں کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔ چونکہ ہوٹل میں کام کرنے والوں کے انداز گفتگو سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ مسلمان ہیں ، اسلئے ہوسکتا تھا کہ گوشت صحیح قسم کا ہو ۔ ورنہ اللہ معاف کرنے والا ہے ۔

کراچی سے رابطہ

میں نے اپنے پروگرام کے بارے میں حسب ذیل تار آج کراچی روانہ کردیا :

HAMDARD KARACHI PAKISTAN ARRIVED DUSHANBE
THREE DAYS MOSCOW WHERE WITNESSED OPEN
HEART SURGERY DISCUSSED NATIONAL COMMISSION
UNESCO NOW PARTICIPATING AINIS JUBILEE UNDER
UNESCO RESOLUTION PROCEEDING SAMARKAND
BOKHARA FINALLY MOSCOW DISCUSSIONS NICOLAI
BLOKHIN WORLD CANCER AUTHORITY SAID

رات ساڑھے بارہ بجے سونے کے لئے لیٹ سکا ۔ لیکن نیند کسی کروٹ نہ آئی ۔ اس لئے عادت کے مطابق کچھ مطالعہ شروع کردیا اور تھوڑی دیر بعد سو گیا ۔

صبح اٹھا اور نماز فجر ادا کرکے پھر لیٹ گیا ۔ یہ عیاشی کے مترادف ہے ۔ عرصہٗ دراز کے بعد یہ موقع ملا تھا کہ نماز فجر کے بعد پھر سو گیا ۔ آخرکار سات بجے اٹھا ۔ تیاری کی اور اپنی میز پر بیٹھ گیا ۔ یہ میز بھی یاد آیا کریگی جہاں بیٹھ کر میں نے اس ”روس نامہ“ کی ابتدا کی ہے ۔ اب تک تقریباً ستر صفحات پر مشتمل اپنے نوٹ تیار کرچکا ہوں ۔ یہ سلسلہ برابر چلتا رہیگا ۔ صفحات بڑھتے رہیں گے ۔ اس طرح شاید یہ دو سو صفحات کی ایک دلچسپ کتاب تیار ہوجائیگی ۔ آج صبح خیال آیا کہ اس کتاب کو تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز کے صدر عالی قدر جناب اکیڈیمیشین پروفیسر محمد عاصموف کے نام نامی پر منسوب کرونگا ۔ ان سے اجازت بھی لگے ہاتھوں لے لونگا ۔ بس ذرا غور

کرنا ہوگا کہ بالآخر کتاب کا انداز کیا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری اس کتاب میں کوئی ایسی بات بھی قلم سے نکل جائے کہ جو عاصموف صاحب کے لئے موزوں و مناسب نہ ہو، اور وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوجائیں۔ اس کا صحیح فیصلہ کتاب ختم کرنے کے بعد ہی ہوسکیگا۔

سائنٹی فک سیشن

کانفرنس ہال ٹھیک دس بجے پہنچ گیا۔ سائنٹی فک سیشن کا آغاز پروفیسر عاصموف صاحب نے وقت مقررہ پر کردیا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ بعض طلبہ و طالبات جگہ نہ ہونے کی وجہ سے کھڑے تھے۔ اس ہال میں کل تین سو نشستیں ہیں۔ ان میں سے بعض خالی بھی تھیں مگر ایسا نہیں تھا کہ طلبہ ان پر بیٹھ جائیں۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے بزرگ آئینگے تو ان کے لئے کرسیاں خالی رہنی چاہئیں۔ تاہم ایک گھنٹہ بعد پروفیسر عاصموف نے دختران سعادت مند کو کرسیوں پر بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ خالی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئیں۔ پھر بھی سب سے آگے آکر کوئی نہیں بیٹھا۔ وہ پیچھے زمین پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ احترام قابل قدر ہے۔ ہم اپنے ہاں طلبہ و طالبات میں ایسے خیال و احترام سے تقریباً محروم ہیں۔

پروفیسر عاصموف صاحب نے آج مجھے اسٹیج پر بلا لیا اور اس طرح پاکستان کی عزت افزائی فرمائی۔ ان کے لئے واقعی بڑا مسئلہ تھا۔ وہ ہندستان کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے۔ پاکستان کو جناب فیض صاحب کی وجہ سے اہمیت دینے پر وہ خوش تھے کہ فیض صاحب لینن پرائز یافتہ ہیں۔ مجھ سے ان کے

شخصی روابط ہیں۔ انھوں نے اچھے انداز سے توازن پیدا کیا ہے۔ مثلاً ہندی مندوبین کو انھوں نے مترجم وہی دئے تھے جو اس فرض کی ادائی کے لئے مامور تھے۔ مجھے انھوں نے اکیڈمی کے استاد پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب دئے جن کا علمی مرتبہ بہر حال بلند ہے۔ یہ صریحی امتیاز تھا جو احتراماً انھوں نے برتا تھا۔ بعض مواقع پر ان کو ہندستان کو اولیت دینی ہوتی ہے اور وہ صحیح ہے۔ میں ذاتی طور پر تو اس قسم کی چیزوں کی کوئی پروا کرتا ہی نہیں ہوں مگر جب مسئلہ پاکستان کا آتا ہے تو میں ضرور محتاط و متاثر ہوتا ہوں۔ بارے پروفیسر عاصموف صاحب اور ان کے رفقاء ایک صحیح توازن قائم کئے ہوئے تھے اور میں اس سے مطمئن تھا۔

جلسہ گاہ سے ہمیں آج ساڑھے بارہ بجے اٹھا دیا گیا۔ حال آں کہ ابھی اجلاس جاری تھا اور بڑے اہم مقالات پیش ہورہے تھے۔ آج سائمل ٹے نی اس ٹرانس مشن کا انتظام بہتر ہوگیا تھا۔ یعنی روسی اور ازبکی زبان کے مقالات کا انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ ہورہا تھا۔ تاہم مجھے پروفیسر عاصموف صاحب نے سائکلو اسٹائل کئے ہوئے فارسی اور انگریزی ترجمے دیدئے جو میں نے اپنے ریکارڈ میں داخل کرلئے۔ جب میں جلسہ گاہ سے باہر آیا تو میرے ساتھ محترمہ عصمت چغتائی اور محترمہ سلطانہ جعفری بھی باہر آگئیں۔ پتہ چلا کہ یہ ہم کو آج خریداریٔ اشیا کے لئے تاجیکستان کے بازاروں میں لے جائینگی۔ دراصل خریداری میرا شوق نہیں ہے۔ مگر پروگرام ایسا تھا کہ انکار ممکن نہ تھا۔

ایک جنرل اسٹور میں

هم سب ایک بڑے اسٹور میں لے جائے گئے - وهاں زیادہ تر کپڑے کی دکانیں تھیں - اب یه کسی طرح مناسب نه تھا که میں خریداری نه کروں - کبھی کبھی ایسے مواقع آتے هیں که جهاں ملک کی لاج رکھنے کے لئے خرچ کرنا هی هوتا هے - اب غور کرنے کی بات هے که اسٹیٹ بنک آف پاکستان جو تیس ڈالر عطا فرماتا هے ، ان سے کیا خریدا جائے اور اگر خریداری کرنے میں بڑی رقم خرچ کردی جائے تو کسی غیر متوقع حادثے کے لئے رقم کهاں سے آئے گی - اب اس مهمان خانهٔ سرکاری میں کام کرنے والوں کو اگر کوئی انعام (ٹپ) دینا پڑے تو مندوبین کیا کریں - میں نے پاکستان ایک اهم تار دیا تھا ، اس پر باره روبل خرچ هوگئے - ایک روبل تقریباً تیره رپے کے برابر هوتا هے - دوسری کرنسی میں تقریباً پندره ڈالر خرچ هوگئے - اب باقی خرچے کهاں سے پورے کئے جائیں - بهر نوع انسان هوں - میری بھی کوئی خواهش هوسکتی هے - اپنے ذوق کی کوئی چیز کھانے کو جی چاها تو کلیجه مسوس کر ره جانا پڑتا هے - کوئی کتاب کسی بک ڈپو میں نظر آ گئی تو اسے کس طرح خریدا جائیگا -

یه تیس ڈالر آخر کیا هوتے هیں - اس بار جمیل الدین عالی هم سفر نه تھے - اگر وه هوتے تو آواز وه لگاتے اور جو سامان میں هدیتهً دینے کو لایا تھا اس کو فروخت کر کے گزر بسر کرتا - خیر اب میں آپ کو کیوں بتاؤں که میں نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے ضرورت کے مطابق روبل کهاں سے لئے - چھوڑئیے اس قصے کو -



قیام گاه عینی ، سمرقند - حکیم محمد سعید دوسرے مندوبین کے ساتھ -



قیام گاه عینی پر حکیم محمد سعید اپنے تاثرات قلم بند کر رهے هیں -

احترامات بیگم صدرالدین عینی

میرے نزدیک پروگرام کا ایک بڑا اچھا حصہ یہ بھی تھا کہ تمام غیر ملکی مندوبین مرحوم صدرالدین عینی کی بیوہ سے ملاقات کے لئے لے جائے گئے جنکو پہلے سے مطلع کردیا گیا تھا۔ صدرالدین عینی کی دو بڑی بیٹیاں ہیں۔ یہ بھی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ موجود تھیں۔ ان کے علاوہ عینی مرحوم کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں جمع تھیں۔ یہ سب منتظر تھے۔ صرف عینی کے بیٹے کمال صدرالدین عینی غیر حاضر تھے کیونکہ وہ نمائش کی ترتیب اور انتظامات میں مصروف تھے۔ راستے میں ان سے ملاقات ہوگئی۔

جب ہم باغ عینی پر پہنچے تھے تو محترمہ کو پہلی بار دیکھا۔ احتراماً میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ایک تصویر میری اور ان کی ان کے سب بچوں کے ساتھ کھنچ جائے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ تصویر کھنچ گئی۔ اس کے بعد جو ضیافت ہوئی، اس میں بھی میں ان سے قریب تر رہا۔ ان کی کرسی بالکل میرے سامنے تھی۔ اس وقت میں نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ اچھی طرح کام نہیں کرسکتے تھے، ان میں رعشہ تھا۔ جب وہ کچھ پیتیں، تب ہاتھ زیادہ کانپتے اور ان کے ساتھ دونوں ہونٹ بھی کانپنے لگتے۔ یہ سب کچھ ان کی عمر کا تقاضا تھا۔ میں نے ذرا سی دیر کے لئے دل میں سوچا کہ اس محترم خاتون کو ہیڈ ٹیبل پر ہونا چاہئے تھا۔ یہ فروگزاشت اچھی نہیں تھی۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا جبکہ میں دیکھ چکا تھا کہ کانفرنس ہال میں اور کنسرٹ ہال





میں ان کو بڑی خصوصیت کے ساتھ باکس میں اعلا مقام دیا جاتا رہا تھا ۔

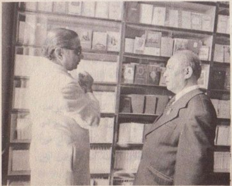
کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں ان کے زیادہ قریب جا بیٹھا ۔ محترم عاصموف صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا ۔ پھر اس موقع پر بھی ایک اچھی تصویر فوٹوگرافر نے اتار لی ۔ اگر اس کی ایک کاپی مل گئی تو میں پاکستان لے جا کر اپنے آرٹسٹ سے اسے رنگین کراؤنگا اور ایک پرنٹ یادگار کے طور پر ان کو بھی بھیجونگا ۔

نمائش (میوزیم)

صدر الدین عینی کے عام استعمال کا سامان جس میں قلم ، پنسل ، قلمدان ، گھڑی نیز مکتوبات ، مطبوعات اور تصاویر بھی شامل ہیں ، ایک میوزیم عینی کی شکل میں جمع کردیا گیا ہے ۔ اس نمائش کے نگراں ان کے صاحبزادے کمال الدین عینی ہیں ۔ ہم جب اس جگہ پہنچے تو ہر چیز کی وضاحت کے لئے خود کمال وہاں موجود تھے ۔ پروفیسر عاصموف نے رائے دی کہ ایک یادگار تصویر یہاں بھی کھنچنی چاهئے ، جسے بعد میں میوزیم میں لگا دیا جائے ۔ چنانچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ۔ میں نے میوزیم کے حسن ترتیب کی داد دی ۔ اس وقت کی ہر بات چیت کو محفوظ رکھنے کے لئے مائکروفون اور ٹیپ ریکارڈر کا اہتمام کیا گیا تھا ، چنانچہ میرے الفاظ کی صدا بندی ہوگئی ۔ میں نے زبان فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔ جب وزیٹر بک میں رائے لکھنے کا سوال آیا تو میں نے اپنی رائے ایسی اردو میں قلمبند کی جسے فارسی داں بھی آسانی سے پڑھ کر سمجھ سکتے تھے ۔



نمائش گاہ عینی جہاں ان کے خطوط ، تصانیف اور تاریخی نوادر جمع کر دئیے گئے ہیں ۔



نمائش گاہ عینی ۔ مطبوعات صدر الدین عینی پر پروفیسر عبداللہ جان غفاروف اور حکیم محمد سعید تبادلہ خیال فرما رہے ہیں ۔

میں نے یہ رائے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے شروع کی تھی۔ یہ ہر لحاظ سے مناسب بلکہ ضروری تھا۔

جلسۂ افتتاحیہ اقبال ھندی

میوزیم عینی سے فارغ ہوکر ہم سب کانفرنس ھال میں چلے گئے۔ عاصموف صاحب نے صبح کی طرح مجھے اسٹیج پر جگہ دی۔ وہ میرے احترام میں کوئی کمی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ جلسۂ اختتامیہ میں جو مقالات پڑھے گئے، ان میں سے ایک میں علامہ اقبال کو اقبال ھندی کہا گیا۔ میں نے عاصموف صاحب سے کہا کہ اقبال تو شاعر پاکستان ہے۔ انھوں نے برجستہ اقبال کا ایک شعر پڑھ دیا۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز۔ تا خدابخشد ترا سوز و گداز

انھوں نے یہ شعر اس لئے پڑھا کہ سب جانتے ہیں کہ اقبال کو مولانا رومی سے خاص لگاؤ تھا اور وہ انھیں اپنا مرشد کامل سمجھتے تھے۔ میں نے موضوع کی مناسبت سے اقبال کا ایک اردو شعر پڑھ دیا جو رومی کی شان میں ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی، عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران، وہی تبریز ہے ساقی

میں نے کہا، زیادہ مناسب یہ ہوتا کہ انھیں شاعر ھند و پاک کہا جاتا۔ انھوں نے فوراً کھڑے ہوکر میرے اس نکتے کی روشنی میں حقیقت کی وضاحت کردی۔ مقالہ نگار نے فوراً اس بات کو قبول کرلیا اور علی الاعلان وعدہ کیا کہ میں اپنے مقالے میں یہ تبدیلی کرلونگا۔

جلسہ ختم ہونے سے پہلے عاصموف صاحب نے فی البدیہہ



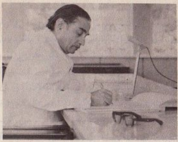


تقریر کی جس میں تمام مندوبین کا، خصوصا غیر ملکی مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ جن شرکاء کے مقالات شریک نہ ہوسکے تھے یا اس موقع پر پڑھے نہ جاسکے تھے، ان کے لئے معذرت چاہی۔ البتہ یہ یقین دلایا کہ وہ سب بہت جلد طبع کردئے جائیں گے۔ میں نے آخر میں پروفیسر عاصموف صاحب کی خدمت میں اپنی جانب سے اور سب کی جانب سے ہدیۂ تبریک و تشکر پیش کیا۔

مقالات کا سلسلہ تو ختم ہوگیا لیکن ایک آئٹم باقی تھا۔ زندگیٔ عینی پر ایک فلم اس موقع پر تمام مندوبین کو دکھایا گیا۔ یہ فلم تاریخی نوعیت کا تھا۔ اس میں وہ تمام اشخاص نظر آئے جو عینی کے رفیق اور شریک کار رہے تھے۔ بہت سے ایسے جوان لوگ نظر آئے جو اب معمر ہوچکے تھے۔ کچھ ایسے بوڑھے بھی دکھائی دئے جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ میں نے خاص طور سے بابا جان غفوروف صاحب کو پہچان لیا جو بارہا عینی کے ساتھ نظر آئے۔ ان کی جوانی بڑی پر بہار تھی جس کی جھلک ان کے بڑھاپے میں بھی نمایاں تھی۔

مقالات کا معیار

اس کانفرنس میں تاجیکی، روسی، آذربائیجانی اور ازبکستانی علماء نے جو مقالات پیش کئے، ان کا معیار قطعی طور پر بڑا بلند تھا۔ اور بعض مقالات سن کر تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ کس درجہ محنت کرتے ہیں۔ ان کے برعکس بعض غیر ملکی مندوبین نے یا تو مقالے پیش کئے ہی نہیں یا سطحی قسم کے تھے۔ خود میرا مقالہ بھی مقابلہ" زیادہ معیاری نہیں تھا۔ تاہم بعض مقالات نے یہ تاثر دیا کہ عینی کا علمی مقام درحقیقت بہت



نمائش گاہ عینی، دوشنبہ، تاجیکستان۔ حکیم محمد سعید اپنے تاثرات ریکارڈ کر رہے ہیں۔



مندوبین کنگرس عالمی صدر الدین عینی کا ایک گروپ۔ دائیں طرف حکیم محمد سعید ہیں۔

بلند تھا ۔ اکثر مقالہ نگاروں نے ان کا موازنہ سنٹرل ایشیا کے ارباب علم و ادب سے کیا ۔ مثلاً فردوسی، عمر خیام ، سعدی ، حافظ ، بیدل ، رودکی ، ترسون زادہ اور اقبال وغیرہ سے کیا ۔ مگر بعض نے یورپی شعراء اور ادباء کو بھی سامنے رکھا ۔ مثلاً ھومر سے ڈی بلزاک تک ، سب سے موازنہ کیا گیا ۔ میں نے تمام مقالات کو بڑے غور سے سنا اور اب یہ بھی مناسب ھوگیا کہ اردو داں شعراء اور ادباء کے لئے عینی پر ایک ایسی کتاب پیش کی جائے ۔ میں کوشش کرونگا کہ اس کام کو خصوصیت کے ساتھ کر ڈالوں ۔ اس کام میں چند دوستوں کے تعاون کی ضرورت پیش آئیگی ۔ شاید یہ میسر آجائیگی ۔

خاندان عینی کے ساتھ ایک شب

دوسرے دن کمال الدین عینی اور ان کی اھلیہ نے خاندان عینی کی جانب سے ایک الوداعی عشائیہ مرتب کیا ۔ اس میں تمام ملکی اور غیر ملکی مندوبین مدعو کئے گئے ۔ شرکاء کی تعداد تین سو سے اوپر ھی تھی اور کھانا عین مین وھی تھا کہ جو کانفرنس کی افتتاحی تقریب کے دن تھا ۔ بہت قیمتی کھانا اور بہت پر خلوص ۔ کمال اور اھلیہ نے اور ان کے دونوں بچوں نے خود کھانا نہیں کھایا ۔ وہ ھر ھر میز پر ھر ھر شخص کے پاس جارھے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ھے ۔ شراب و کباب کی انواع تھیں اور اقسام ۔ دل کھول کر ملی تھی ، دل کھول کر ھی پی جارھی تھی ۔ اس کے بعد رقص و سرود کا بھی انتظام تھا ۔ موسیقی مغربی اور مشرقی دونوں ۔ جاز بھی اور دو تارا بھی ۔ ایک خاتون نے ” سونی دھرتی ، اللہ رکھے قدم قدم







(بائیں طرف) حکیم محمد سعید خانم صدرالدین عینی کے ساتھ۔ (دائیں طرف) افراد خاندان عینی کے ساتھ بعض مندوبین۔

آباد ، ، سے محفل کا آغاز کیا ۔ میرے قریب جو لوگ تھے ، میں نے ان کو بتایا کہ یہ پاکستانی گانا ہے ، مسعود انور کا لکھا ہوا ہے اور رونا لیلیٰ نے اس کو دوام بخشا ہے ۔ رونا لیلیٰ اب بنگلہ دیشی ہوگئی ہے ۔ وہاں اس کی بہن مبتلائے سرطان ہوکر اللہ کو پیاری ہوگئی ہے ۔ رونا لیلیٰ نے اپنے کمال فن سے بنگلہ دیش میں ایک مرکز سرطان قائم کرنے کا تہیہ کرلیا ہے ۔

جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی گانے ہوئے اور تاجیکی ، ازبکی زبانوں میں بھی ، پھر رقص کا بھی پورا انتظام تھا ۔ جام صحت بار بار پیش ہورہے تھے ۔ اس وقت استاد عاصموف صاحب خوش طبعی کے موڈ میں تھے ۔ کمال عینی نے ان کو میزبان صدر محفل بتایا تھا اور اس کا اعلان کیا تھا ۔ میں نے اپنے جام شراب میں شراب کے بجائے شاہ عنبر بھرلیا تھا ۔ فیض صاحب نے اس جام آب سے اپنا جام شراب ٹکرانے سے انکار کردیا ۔ مجھے اس موقع پر یہ معلوم ہوا کہ یہ ثقافت کے خلاف ہے کہ پانی کو شراب سے ہم آہنگ کیا جائے ۔ بارے مس مارگریٹا پاؤ لونا نے میرا جام سفال ” آب انگور ،، سے بھر دیا ۔ اس میں دخت رز کی جھلک میں نے دیکھی ۔ دوسری طرف محترمہ عصمت چغتائی نے شیمپین سے میرا دوسرا جام لبالب بھر دیا ۔ میں نے تیسرا جام شاہ عنبر سے بھر لیا ۔ جام صحت پیش ہوتے تو میں کبھی شیمپین سے اور کبھی دوسری شراب سے جواب دیتا اور آب شاہ عنبر اتنا پی گیا کہ کھانا کھانے کی گنجائش نہ رہی ۔

آٹھ بجے سے گیارہ بجے شب تک یہ محفل گرم رہی ۔ محترمہ عصمت چغتائی اب خاصی بے حال تھیں ۔ ان کو آرام کی



ضرورت تھی۔ انھوں نے کہا :

،،ذرا خالد لطیف سے کہہ دیجئے گا، میں نے خط ان کے گھر کے پتے پر لکھا تھا، مگر وہ واپس آ گیا ہے،،۔

میں نے خالد کو یہ پیغام دینے کا وعدہ کرلیا اور وہ لڑکھڑاتی اٹھیں اور چلی گئیں۔

فیض صاحب نے فرمایا، لوگ مجھے باغی کہتے ہیں۔ آپ پہلے پاکستان جارہے ہیں۔ ذرا بتا دیجئے گا کہ یہاں سونی دھرتی ہوئی اور کلام فیض گایا گیا۔ میں نے کہا کہ میں نے اپنی یاد داشت میں یہ لکھ لیا ہے۔ فیض صاحب نے پوچھا، آپ کب جارہے ہیں؟ میں نے جواب دیا، آپ ہی نے تو کہا تھا۔

ایک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

رات بارہ بجے ہوٹل پہنچا اور پڑتے ہی سوگیا۔ آج مطالعہ نہ کرسکا۔ البتہ صبح اٹھتے ہی اپنی ڈائری لکھنی شروع کردی تاکہ ضروری باتیں حافظے کی لوح سے مٹ نہ جائیں۔ بعد میں لکھنے کی صورت پیدا کی جائے تو خواہ مخواہ اپنے ذہن پر زیادہ زور ڈالنا پڑتا ہے۔ ،،کار امروز بفردا مگزار،، کا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے۔

انتظامات میں خلل

بخارا جانے کا انتظام مکمل نہیں ہوسکا۔ سمرقند تو پہلے سے اصل پروگرام میں شامل تھا۔ مگر جب یہ طے ہوا کہ ماسکو میں جلسہٴ عینی نہیں ہوگا تو یہ طے ہوا کہ کم سے کم

غیر ملکی وفود کو بخارا کی سیر کرادینی چاھئے۔ اگر بخارا میں حسب منشا انتظام ھو جاتا تو اس وقت ھماری روانگی سمر قند کے لئے ھوتی۔ چونکہ انتظامات میں خلل پڑگیا، اسلئے بخارا کا پروگرام ختم سمجھنا چاھئے بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ وہ ختم ھوگیا۔

گزشتہ رات پروفیسر عاصموف صاحب نے فرمایا تھا: ”سمرقند غالباً ایک دن بعد روانگی عمل میں آئیگی اور یہ کہ کل ھم چند آدمی استراحت کے لئے دو شنبہ سے باھر چلیں گے“۔ چنانچہ صبح دس بجے ھم سب تیار ھوگئے۔ عاصموف صاحب بھی آگئے۔ پانچ موٹریں روانہ ھوئیں۔ میرے ساتھ افغانستان کے ڈاکٹر مصطفیٰ رسولی تھے۔ ان سے خاصی بے تکلفی ھوگئی تھی۔ وہ فارسی، اردو، انگریزی، روسی اور دوسری کئی زبانیں جانتے ھیں۔ رسولی صاحب کے والد پشاور میں کاروبار کرتے ھیں۔ قصہ خوانی بازار میں افغان ھاؤس انھی کا بنایا ھوا ھے۔ اس سفر میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور ان کی بیگم، محترمہ عصمت چغتائی شریک تھیں۔ کہنا چاھئے کہ ھندستان، پاکستان اور افغانستان کے وفود تھے۔ باقی نہیں تھے۔

دو شنبہ کے حسن و جمال کا اندازہ نوریک جاکر ھی ھوا تھا جسے پہلے ھی قلم بند کرچکا ھوں۔ اب دوسرے رخ پر ھم دوشنبہ سے باھر نکلے۔ موسم خوشگوار تھا۔ ابر چھایا رھا۔ موٹریں بڑی مناسب رفتار سے رواں تھیں۔ ایک طرف سرسبز و بلند پہاڑیاں تھیں، خود رو پھولوں کی کثرت سے ھر طرف رنگینیاں پھیلی پڑی تھیں۔ گل و ریحان کی خوشبوؤں سے فضا معطر تھی۔ دوسری

جانب دریائے دوشنبہ بڑی روانی سے اور شور کے ساتھ بہہ رھا تھا۔ صاف و شفاف پانی تصویر لے رھا تھا۔ برف پوش پہاڑوں سے برف پگھل پگھل کر دریائے دو شنبہ کو روانیٔ مزید عطا کررھا تھا۔ صاف سنسان سڑکوں پر ٹریفک خال خال تھا۔

غوطہ لگانے کی خواھش

ایک مقام ایسا آیا کہ عاصموف صاحب نے اپنی موٹر روک لی۔ فوراً سب موٹریں رک گئیں۔ وھاں دریائے دوشنبہ کا پھیلاؤ زیادہ تھا۔ پہاڑوں پر گری ھوئی برف کے باعث سرد ھوائیں چل رھی تھیں۔ بڑا دل چاھا کہ اس پانی میں ایک غوطہ تو لگا ھی لوں۔ نہ جانے کیوں یہ خواھش بڑی شدید تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ اپنے مترجم پروفیسر عبداللہ جان صاحب سے تو میں نے کہہ ھی دیا کہ میرا اس پانی میں غسل کرنے کو بڑا دل چاہ رھا ھے۔ انھوں نے منع کر دیا کہ پانی سخت سرد ھے۔ تکلیف ھوجائیگی۔ ان کو کیا معلوم کہ اس قسم کی پیش رفت کا عادی ھوں۔ کڑاکے کی سردی میں بھی ٹھنڈے پانی ھی سے نہاتا ھوں اور یہ عادت فطرت کا جزو بن گئی ھے۔ مجھے نزلہ تک نہیں ھوتا۔ ایک بار مہاوٹوں کے زمانے میں کوہ مری کے ھوٹل میں سرد پانی سے نہایا تو ھلکی سی جھر جھری آئی تھی۔ ایک لمحے بعد کوئی اثر نہیں تھا۔

استراحت گاہ نویسندگان

کچھ دیر بعد ھماری موٹریں ایک ایسے مقام کی طرف روانہ ھوئیں جہاں اترنا تھا۔ عبداللہ جان صاحب نے ایک سلسلۂ عمارات کے بارے میں بتایا کہ یہ استراحت گاہ نویسندگان ھے۔ یہ

مقام واقعی بہت پر فضا تھا۔ شہر سے دور، بہت دور، سرسبز پہاڑوں کے دامن میں، دریائے دوشنبہ کے کنارے، گل و بلبل کے ماحول میں ذہن کو یکسوئی حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ حافظ شیراز کے قول کے مطابق یہاں " فرصتے و کتابے و گوشہ' چمنے " صادق آتا ہے۔ میں نے ٹھنڈا سانس لیا یہ سوچ کر کہ یہاں لکھنے والوں کی کیسی قدر دانی ہے اور ان کی تحریر کو جلا بخشنے کے لئے کیا کیا سامان قدرت نے اور خود انسان نے پیدا کئے ہیں۔ مجھے نویسندگان تاجیکستان پر بجا طور پر رشک آیا اور اپنے ملک کے حالات پر غور کرتے ہوئے ذہن میں بڑی تیزی اور صفائی کے ساتھ یہ سوال ابھرا کہ آخر ہم کب ایسا ماحول پیدا کرسکینگے؟ انفرادی طور پر تو بعض لوگوں کے لئے یہ امکان ہوسکتا ہے، لیکن ادیبوں اور شاعروں کی برادری کے لئے بحیثیت مجموعی تو ملک کے ارباب حل و عقد کا اہتمام ہونا چاہئے۔ لیکن وہ تو ہمیشہ سیاسی الجھنوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ معاشرے کی بلند سطح پر پہنچ کر عوامی مسائل پر غور کرنا ممکن نہیں ہے۔

بلا شبہ اہل قلم اور صاحبان علم و فضل ایک معاشرے کے لئے سب سے قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ وہ ہر موقع و محل پر کام آسکتے ہیں۔ ان کی تحریر دنیا میں انقلاب برپا کرتی ہے اور انہی کی تحریر انتشار کی کیفیات دور کرکے سکون اور نظم و ضبط پیدا کرتی ہے۔ وہ ہر محاذ پر تلوار کے بغیر لڑتے ہیں۔ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اسلئے میرے دل نے کہا کہ ان کے بڑھنے اور ان کے پنپنے کے پورے سامان ہونے چاہئیں۔ خود اہل قلم اور صاحبان علم و فضل کو اپنے دل و

دماغ کی پاکیوں اور سچائیوں کے ساتھ ثروت ملک و ملت میں اضافے کا سامان کرنا چاہئے اور سرکار کو بھی دیانت و امانت کے ساتھ احترام علم و عالم کا اہتمام کرنا چاہئے اور فضا کو ان کے لئے بکمال حسن سازگار بنانا چاہئے۔ یہ تالی ضرور دونوں ہاتھوں سے بجے گی۔ اس کے لئے ایک انقلاب فکر درکار ہے، مگر اس سے قبل ایک نظریہ' حیات کا تعین بکمال یقین و دیانت ہونا چاہئے۔ جب تک یہ فیصلہ کن مرحلہ نہیں آئیگا، پاکستان میں علم و عمل اور علم و عالم کے لئے راہیں استوار نہیں ہونگی۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم آج تک نظریہ' حیات ملی کا تعین نہیں کرسکے ہیں۔ اس معاملے میں ہم نے بڑی خطرناک کوتاہیاں کی ہیں اور ہم نے بڑی المناک فروگزاشتیں کی ہیں اور آج پوری ملت ان کوتاہیوں کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور ان کوتاہیوں کی وجہ سے اپنی منزل سے دور — بہت دور ہے۔

پاکستان میں اب سے اٹھارہ سال پہلے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور ارباب علم کی قدر و منزلت اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن اس کی گہما گہمی قلیل مدت کے لئے رہی، پھر اس کا وجود برائے نام رہ گیا۔ خود ارباب قلم نے اپنی اس انجمن میں کرسیاں سنبھالنے اور ان پر برقرار رہنے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے اور اس کے فنڈ سے ریوڑیاں ہر پھر کر اپنوں ہی کو بٹتی رہیں۔ کوئی پوچھے کہ اس گلڈ نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے تو ارباب اقتدار اپنی بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے۔ ایک ماہنامہ نکالا، وہ بھی نہ چل سکا۔ ایک بک ڈپو قائم کیا وہ بھی سخت

خسارے کے بعد ختم ہوگیا ۔ اگر ادیب اس ادارے کو خود نہیں چلا سکے تو کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ کسی اور میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکینگے ۔ اس کے برعکس روس میں ادیبوں کی انجمن کسی ملک کی اسمبلی کی طرح باقاعدہ کام کرتی ہے ۔ ملک کے سرکاری اور غیرسرکاری ادارے طباعت و نشریات تک کے لئے اس سے صلاح و مشورہ کرتے ہیں اور جب تک کسی منصوبے پر اس کی تائید و تصدیق نہ ہوجائے، کام آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے اب تک جو ٹھوس کام کئے ہیں ، ان میں کلاسیکی ادب کی اشاعت اور اس کا فروغ شامل ہے ، ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی پوری طرح نوازا جاتا ہے۔ کاش پاکستان کا رائٹرز گلڈ علاقائی اور شخصی تعصبات کے مذموم دائرے سے نکل کر کوئی مفید کام کرنے کے لائق ہوجائے ۔

روس میں یہ سب کچھ اسلئے ہے کہ وہاں ایک منزل مقصود معین ہے ، ایک نظریہٴ حیات ہے ۔ وہاں کے لئے یہی کہا جاتا ہے ، کہ وہاں لادینیت ہے ۔ ضرور ہے مگر اسے استحکام حاصل ہے ۔ ہم پاکستان میں اسلام کا نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا نظریہٴ حیات ہے ۔ الفاظ کی حد تک یہ بات درست ہے ۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ درس اسلام دیتے ہیں اور اسلام کے داعی ہیں ، خود ان کا عمل کیا ہے ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ اہل اسلام خود متعدد نظریات کے حامل ہیں اور اسلام کے کسی ایک نقطے یا مرکز پر جمع نہیں ہیں ۔ جب ان کا اپنا یہ حال ہے تو عام لوگ کس طرح راہ ترقی پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں ۔

پاکستان کی عمر اب تیس سال سے تجاوز کر گئی ہے ۔ اس طویل عرصے میں علمائے اسلام کے اتحاد کا پتہ کوئی بتائے ۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں ان اہل اسلام کے اتحاد فکر و عمل کی کوئی مثال تو بتادیجئے ۔ اب ۱۹۷۸ء میں ہم نے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا ہے ۔ ہم اس عدم اتحاد اور فکری بعد سے کن طاقتوں کو آب حیات پلا رہے ہیں ۔ یہ علماء کہ جو ہر بر سر اقتدار حکومت کے درپےٴ آزار ہوتے ہیں ، خود ان کے ایمان متزلزل ہیں اور اگر میں یہ کہوں کہ گزشتہ تیس سال میں ان ہی کی کج روی نے تیرگی کو جنم دیا ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اور پھر اسی تاریکی نے تو اہل فکر و نظر کو روشنی سے محروم کیا ہے ۔ پھر پاکستان میں استراحت گہ نویسندگان کا تخئیل و تصور کیسے قائم ہو اور وہ خود اپنا مقام کہاں تلاش کریں ۔

حدیقہٴ نباتات

ہماری موٹریں باغ بوتانیکی (حدیقہٴ نباتات) میں داخل ہوگئیں ۔ یہ باغ تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام ہے ۔ اس میں ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے ۔ اس باغ میں لگے ہوئے درختوں کی لکڑیوں ، چھالوں ، پھولوں اور پھلوں کے نمونے اس میں رکھے گئے ہیں ۔ اسی جگہ ایک مکان میں نے دیکھا ۔ مشہور ہے کہ اس میں شاعر عظیم رودکی کو قیام کا موقع ملا تھا ۔ اس کی بہت سی نگارشات نے یہیں جنم لیا تھا ۔ اس میوزیم میں ایک کتاب رائے بھی ہے ۔ ہم سب نے اس میں دستخط کئے ۔ جعفری صاحب نے ایک شعر بھی لکھ دیا :

درخت دوستی بنشاں که دست دل یار آور
نهال دشمنی بر تن که رنج بیشمار آور

اس باغ بوتانیکی میں چشموں سے بہتے ہوئے شیریں پانی کے کئی گلاس میں نے پی لئے۔ جرعہ جرعہ ہر ایک میں سے پیا گیا۔ میں نے یہ پانی پی کر بڑی تازگی محسوس کی۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی میں کئی دنوں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ میں اس ماحول سے بھی بڑا متاثر ہوا اور غرق فکر رہا۔ ناش پاتی کے ایک درخت کے نیچے میں کھڑا ہوگیا۔ اس پر سفید پھول بڑی بہار دے رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں ان سفید و زرد پھولوں کے دل سے آب شیریں چوس رہی تھیں۔ اب یہ شہد بنائیں گی جس کے لئے قرآن پاک نے کہا ہے: ”اس میں شفا ہے،،۔ میں نے ان مکھیوں کو، جو چھتے کی صورت میں جمع تھیں، بڑے رشک کے ساتھ دیکھا کہ انکی رسائی اس آب شیریں تک ہے جو پھولوں کی جان ہے اور پھر ان کو اس آب شفا کو جنم دینے کی سعادت ملتی ہے۔ ان مکھیوں کی مسلسل مشغولیت اور خلوص کار کا اندازہ لگانے کے لئے میں دیر تک کھڑا ان کو دیکھتا اور ان کی بھنبھناہٹ سنتا رہا۔ کاش، میں ان کی زبان بھی سمجھ سکتا کہ وہ بھنبھناہٹ کے الفاظ میں ایک دوسری سے کیا کہہ رہی ہیں۔ ان سے سبق ملا کہ جد و جہد اور کاوش مسلسل اور سعی پیہم کے بغیر کوئی شے عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ آب شیریں کو شہد کامل بننے تک کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے! ذرا نویسندگان اس پہلو پر غور کریں کہ تعمیر کی خاطر کیسی اور کتنی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔

دست قدرت کی دامن کشی

میں عالم محویت میں تھا کہ آگے چل پڑنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس قدر حسین ماحول کو چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن پروگرام کا تقاضا مجبور کردیتا ہے۔ چنانچہ ہم سب کے سب چل پڑے لیکن بہت جلد ایک مقام ایسا آیا کہ دست قدرت نے دامن کھینچ لیا، ہر ایک کی توجہ دلچسپ مناظر نے جذب کرلی اور دل کھینچ لیا۔ سب موٹریں رک گئیں اور سب مندوبین اتر پڑے۔ تصویر کشی کے لئے بھی یہ جگہ اچھی تھی۔ چنانچہ چمڑے کے تھیلوں میں سے کیمرے نکلے اور ریل کھسکنے لگے۔

مگر تصویروں سے زیادہ میری دلچسپی کا سامان وہ پیارے بچے اور وہ پیاری بچیاں تھیں جو ہمیں دیکھ کر اپنی قریب کی درسگاہ سے بے تحاشا باھر نکل کر ہمارے قریب آگئی تھیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ ان کو ہم اجنبی لوگوں سے کچھ خوف بھی دامن گیر تھا۔ وہ بچے قریب آئے لیکن ذرا کھنچے کھنچے رہے۔ ان کی زبان تاجیکی تھی، لباس بھی تاجیکی تھا۔ یہاں تک کہ ان کے چہروں کا نور بھی تاجیکی تھا۔ ان بچوں اور بچیوں میں حیا بھی تاجیکی انداز کی تھی۔ میں نے چاہا کہ ان بچوں اور بچیوں کے بستے کھول کر ان کی درسی کتابوں پر نظر ڈالوں مگر ان سب پر ایک قسم کی گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ بچے کسی طرح نہ تو قریب تر آئے اور نہ اپنی کتابیں دکھانے کے لئے تیار ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف بھی ناکام رہ گئے۔ تاہم پروفیسر عاصموف صاحب نے ہم سب کے بارے میں

چند جملے کہے کہ ہم مہمان ہیں ، تب بچے نرم ہوئے ۔

رسم الخط اور زبان

کتابوں میں رسم الخط بدل چکا ہے ۔ تاجیکی فارسی عام ہے ۔ خالص فارسی رسم الخط اور زبان ختم ہوتی جارہی ہے ۔ اس کا رواج ہر سطح پر ختم ہوچکا ہے ۔ یہ انقلاب عظیم نظام تعلیم بدلنے ہی سے آیا ہے ۔ اس معاملے میں یا پالیسی طے کرنے میں روسی حکومت نے کوئی جبر نہیں کیا ہے ، نہ کوئی حکم جاری کیا ہے ۔ بلکہ نئے فیصلے اور انتخابات کے فیصلے عوام کو فراہم کئے ہیں ۔ اس حقیقت کو پھر بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ روسی حاکم ہیں اور یہ پانچ مسلم ریاستیں ، جو ہر چند کہ اپنے معاملات میں بڑی حد تک آزاد ہیں ، اس حکومت کی محکوم ہیں ۔ البتہ روسی حکومت نے ان کی خودی کو حتی الامکان پامال نہیں کیا ہے ۔ ان کے احترام کو ملحوظ رکھا ہے اور کوئی ایسا موقع فراہم نہیں کیا ہے کہ بغاوت کا خیال بھی کسی کے دل میں آسکے ۔ تاہم اگر اتفاقاً کبھی کوئی بغاوت ہوجائے تو اسے فوراً کچل دیا جاتا ہے ۔ یہ اصول ان ریاستوں ہی کے لئے نہیں ہے ، اگر خاص روس میں ایسی صورت رونما ہو تو یکساں عملی قدم اٹھایا جاتا ہے ۔ مخالف پارٹی کا وجود تک باقی رہنے نہیں پاتا ۔ حاکم کی زبان بہر نوع زبان حاکم ہے ۔ گزشتہ تیس سال میں اس نے ان مسلم ریاستوں میں بھی اپنا رنگ جمالیا اور اپنے لئے مقام پیدا کرلیا ہے ۔ اب صورت یہ ہے کہ روسی زبان سب جگہ زبان اول بن رہی ہے ۔ اب روس کا ہر شخص ، وہ تاجیکی ہو یا ازبکی ، ترکستانی ہو یا تاشقندی ، روسی زبان جانتا ، سمجھتا اور

بولتا ہے ۔ اس نے اپنی زبان بھی برقرار رکھی ہے ۔ اس طرح کم سے کم پانچوں مسلم ریاستوں کا عمل یہ ہے کہ وہاں کا ہر شخص کم سے کم دو زبانیں جانتا ہے جبکہ روسیوں کو یہ فخر حاصل نہیں ہے ۔ میں نے دیکھا کہ کوئی خالص روسی شخص علاوہ روسی زبان کے ، دوسری زبان نہیں بولتا ۔ البتہ یہ ریاستی باشندے روسی زبان بولنے کے لئے مجبور ہیں اور اپنی دوگونہ زبان دانی کی برتری کے باوجود ، دوسرے درجے کے شہری ہیں ۔

مسلم ریاستوں میں سے تاجیکستان کے بارے میں میرا ذاتی مشاہدہ ہے ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ترقی کے مواقع یہاں سب کے لئے یکساں فراہم کئے گئے ہیں ۔ وہ روسی ہو یا تاجیکستانی، ترقی کے امکانات سب کے لئے یکساں ہیں ۔ شکوک و شبہات کے دروازے بند ہیں ۔ آج سے پندرہ سال قبل عرفات کے میدان میں روسی ترکستان کے حاجیوں سے تبادل خیال کا موقع ملا تھا ۔ ان میں سے بعض کی زبان سے روسی ظلم و ستم کی داستان سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے لیکن اب وہ دور شاید ختم ہوگیا ہے ۔ کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہیں ہے ۔ مذہب کے معاملہ میں ، جیسا کہ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے، بالکل آزادی ہے ۔ ہر سال حج پر جانے والے حاجیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت ان کو سہولت سفر میں کوئی رعایت نہیں دیتی لیکن کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی جاتی ۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ اگر وہ دین اسلام کا پیرو ہے تو اس کے نور سے اپنا دل روشن کرلے ۔ اس عقیدت میں برابر اضافہ ہورہا ہے اور ایک خالق کل اور نور السموات والارض

کی تلاش منزل تک پہنچا دے گی ۔

لامذہبیت کی دنیا میں

میں نے اندازہ لگایا اور یہ اندازہ یقیناً صحیح ہے کہ سرکاری طور پر لامذہبیت کی اس دنیا میں مسلمان سچائی اور پوری عقیدت کے ساتھ اسلام کا، عیسائی اپنی نصرانیت کا اور یہودی دین موسوی کا پابند اور عامل ہے۔ حکومت سے کسی کا کوئی سروکار نہیں ہے اور نہ حکومت ان کی کسی رسم کی ادائیگی میں مزاحم ہوتی ہے اور نہ شاید مدد دیتی ہے۔ روس کا یہ طریق کار بالکل چین کی طرح ہے۔ وہاں بھی حکومت کو کسی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہر شخص جس خدا یا دیوتا کے سامنے چاہے، جھک سکتا ہے۔ چین کا مسلمان بھی اسلامی اصول و نظریات پر عمل کرتا ہے۔ ایک بات دونوں جگہ یکساں ہے۔ ان برائیوں کی، جن کو ہر قوم نے ہر زمانے میں برا سمجھا ہے، برا ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کے استیصال کے لئے آئین میں گنجائش ہے۔ پولیس احتساب کرتی ہے اور عدالتیں سزائیں دیتی ہیں۔ انسانی مساوات کا سب سے زیادہ خیال اسلام نے رکھا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ مساوات کے راستے سے ایک قدم پرے نہ ہٹا جائے۔ ان دونوں ملکوں میں بھی مساوات کا، ذرا سے فرق کے ساتھ، خیال رکھا جاتا ہے۔ اصول اور طریق کار مختلف ہیں۔

نئے سوویت آئین میں

سوویت یونین کے نئے آئین میں، جو ۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منظور کیا گیا، کہا گیا ہے:

"قانون کے نزدیک سوویت یونین کے تمام شہری، بلا لحاظ آبائی سکونت، سماجی یا مالی حیثیت، نسل قومیت، جنس، تعلیم، زبان، مذہب کے بارے میں رویئے، پیشے کی قسم اور نوعیت، حالیہ سکونت یا دیگر حیثیت بالکل برابر ہیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سوویت ریاست اقتصادی، سیاسی اور سماجی شعبوں اور ثقافتی زندگی میں مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے برابر حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ یونین میں ہر شہری کو مناسب حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہے۔ مثلاً روزگار پانے کا حق، بیمار یا اپاہج ہوجانے پر وظیفہ پانے کا حق، عوامی تنظیموں میں شامل ہونے کا حق، مذہبی عقیدے کی آزادی، تقریر اور تحریر کی مناسب حد تک آزادی وغیرہ۔ مسلمان سمیت سارے سوویت عوام ان کا پورا پورا استعمال کرتے ہیں۔ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور انفرادی حقوق کے علاوہ نئے آئین میں حقوق کو، جو پہلے سے موجود تھے، قانونی حیثیت بھی دے دی ہے۔ مثلاً ہر شہری کے لئے محنت کے تحفظ کا حق، رہائشی مکان بنانے کا حق، ثقافتی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق، ریاستی نظم و نسق میں حصہ لینے کا حق اور دوسرے بہت سے حقوق بھی شامل ہیں۔

مذہب کی آزادی سوویت شہریوں کی جمہوری آزادیوں کا ایک حصہ ہے اور سوویت یونین کے آئین کے اصولوں میں یہ بات شامل ہے۔ ۱۹۱۸ء میں روسی وفاق کے آئین میں بھی اس اصول پر زور دیا گیا تھا اور سوویت یونین کے ۱۹۳۶ء کے آئین

میں بھی یہ بات شامل تھی۔ ملک کے نئے بنیادی قانون سے بھی یہ بات پوری طرح آشکار ہوتی ہے کہ ریاست کو مذہب کی حقیقی آزادی کے نفاذ کی بڑی فکر ہے۔ چنانچہ دفعہ ۵۲ میں یہی باتیں کہی گئی ہیں۔ اسی آئین میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ سماج میں انسان کی حیثیت کا تعین کرنے کے لئے یہ معلوم کیا جائے کہ اس نے سماج کے مفاد کے لئے کتنی محنت کی ہے اور اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے چونکہ مسلمان بڑے محنتی لوگ ہیں، اس لئے قدرتی طور پر سارے ملک میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ معاشی اور ثقافتی شعبوں میں کام کرنے والے ہزارہا مسلمانوں کو اعزازات اور تمغے دئے گئے ہیں۔

ایک نئے سماج کی تشکیل و تعمیر اور ملک کا نظم و نسق چلانے میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے بھی سوویت مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے پورے مواقع حاصل ہیں۔ ان علاقوں کے علاوہ جو روایتی طور پر مسلمانوں کے علاقے ہیں، مثلاً ازبکستان، قزاخستان، تاجیکستان، آذربائیجان، کرغزیہ، ترکمانیہ، تاتاریہ، بشکیریا، کباردینو، اور داغستان وغیرہ، خالص روسی آبادی والے شہروں مثلاً ماسکو، لینن گراد، آلیا نودسک، روستوو، گورکی، آرمینیا اور جارجیا کو جمہوریاؤں اور دوسرے خود مختار علاقوں میں مسجدیں موجود ہیں اور ان میں باقاعدہ نماز ہوتی ہے۔

چار مسلم بورڈوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کے سربراہ ممتاز عالم و مفتی ہیں۔ یہ بورڈ قران حکیم اور احادیث نبوی صلعم اور مذہبی تقویم شائع کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک بورڈ نے

پچھلے سال چھ مرتبہ قران حکیم طبع کرایا۔ حضرت امام بخاریؒ کی تصانیف، الجامع، الصحیح اور الادب المفرد اور حضرت عثمانؓ کے زیر استعمال قران پاک کی تاریخ کے بارے میں اسمعیل مخدوم سطیؤ کی کتاب شائع کی۔ قران پاک کا یہ نایاب نسخہ تاشقند کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

فارغ البالی

روس میں غریب لوگ آج فارغ البال نظر آتے ہیں۔ وہاں دولت کی فراوانی ہے۔ اسلامی دنیا کے بعض دوسرے ممالک بھی اب فارغ البال ہوتے جارہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ دیکھنا چاہئے کہ عرب کی دولت کس کام آرہی ہے۔ آج بد یہی طور پر دولت کا ایک حصہ عشرت کدہ ہائے مغرب میں صرف ہو رہا ہے اور میکدہ ہائے مشرق میں لٹایا جارہا ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں ایک صاف گو حقیقت پسند نے یہ بات کہہ دی کہ ذرا اسرائیل کو دیکھئے کہ اس نے صحرا کوچمنستان بنا کر رکھ دیا ہے۔ دوسری طرف عربوں کا حال یہ ہے کہ ان کے جو چمن تھے وہ صحرا بن گئے ہیں، تو اس صاف گو حقیقت پسند انسان کو سزا ملی۔ اور بالآخر اسے ملک بدر ہونا پڑا، مگر کیا جو بات کہی گئی اور جس رائے کا اظہار ہوا، صداقت سے دور تھی؟ آخر حقائق سے ہم فرار کیسے اختیار کرسکتے ہیں؟ آج اہل اسلام کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے ذرائع، وسائل اور ذخائر کا صحیح استعمال کرنا بھی نہیں جانتے۔ اس سنگین صورت حال میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی انقلاب نہیں آیا تو ان کو زیر نگیں ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کب کہا ہے کہ

وہ صرف مسلمانوں کا رب ہے ۔ وہ تو رب العالمین ہے ۔ اللہ اس کے ساتھ رہیگا کہ جو عمل کریگا ، تحقیقات کے میدان سر کریگا ۔ زمین و آسمان کے مابین جو راز ہائے کائنات ہیں ان کی عقدہ کشائی کریگا ۔ جو چاند پر کمند پھینکے گا ، اللہ اسی کے ساتھ ہوگا ۔ اللہ ان کے ساتھ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو اس کا نام تو زبان سے لیں لیکن ہاتھ میں جام شراب بھی اٹھائے رہیں ۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں ہو اور قحبہ خانوں کے چکر لگاتے پھریں ۔ زبان پر کلمہ ہو اور عملی طور پر مشرق و مغرب کے عیش خانے ان کے دم سے آباد ہوں ۔ وہ روزہ رکھیں اور جھوٹ بولیں ۔ دغا بازی بھی کریں ۔ ایسی بے عمل ملت کی موت یقینی ہے ۔ زندہ وہی رہیگا جو عمل کے میدان میں آگے بڑھتا رہے ۔ ان علمائے حق کا وجود بے سود ہے کہ جو عمل میں صفر کا درجہ رکھتے ہیں اور جن کے دست و بازو نفاق کے بیچ بھٹک رہے ہیں ۔ اہل اسلام اور صاحبان فکر و نظر اور علمائے حقیقت کو اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہئے کہ لادینی اور لا مذہبیت کو عرصۂ دراز تک قرار نہیں مل سکتا ۔ دین و مذہب سے دور ہوکر امریکا اور مغرب آج بڑی عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگئے ہیں ۔ ان کو اب ایک ایسے دین کی تلاش ہے کہ جو دین فطرت ہو اور جو ایک مرکزیت فکر کی دعوت دے ۔ یہ لادینی اور مذہب بیزاری اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مسلمان عمل کی دنیا میں واپس نہیں آئیں گے ۔ مسلمانوں کے عمل سے فرار نے فکرہائے دگر اور نظریہ ہائے متضاد کو وجود بخشا ہے ۔ اس صورت حال کا بالکل حقیقت پسندانہ ادراک کرنا چاہیے اور جذبات کو دخیل نہیں بنانا چاہیے کہ ایسا

کرکے ہم مقصد کو کبھی نہیں پاسکتے اور نہ منزل کو پہنچ سکتے ہیں ۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف اور ادراک کرنا چاہیے اور پھر ان کے سدباب کا سامان کرنا چاہیے ۔ عالم اسلام میں آج جو شدید بیداری پیدا ہورہی ہے ، اس کا استقبال کرنا چاہیے اور اس وجہ سے اقصائے عالم میں اسلام کے لئے جو جگہ پیدا ہورہی ہے اسے پر کرنے کا سامان کرنا چاہیے ۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے مرکز سے فرار کی راہ اختیار کریں اور قرآن و سنت نبوی سے صرف نظر کریں اور یہ چاہیں کہ جو خلا پیدا ہوا ہے اسے اسلام سے پر کردیں ۔ سب سے پہلے اہل اسلام کو قرآن و سنت کی روشنی میں مقصد و منزل کا تعین کرنا ہوگا اور پھر نور اسلام کی روشنی میں ہر خلا کو تلاش کرکے اسے پر کرنا ہوگا ۔ فکر و عمل کو اس دھارے پر جب تک نہیں ڈالا جائے گا محض دولت ہمارے درد کا مداوا نہیں بن سکے گی اور آج جو دولت ہمارے پاس ہے اگر اس کا آج صحیح استعمال نہ ہوا تو کل ہمیں پچھتانا ہوگا ۔

روس کے زیر نگیں یہ پانچ مسلم ریاستیں اس خطۂ ارض کو نور اسلام سے منور کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں ۔ ان کو اس مدد کی ضرورت ہے کہ ان سے باہر کی اسلامی دنیا اصول دین پر بکمال عامل ہو ۔ ہر انسان تابع فطرت ہے ۔ روس کا انسان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ فطرت کی آغوش میں جانے کے لئے وہ ہمہ وقت تیار ہے ، خواہ وہ ماسکو کا ہو ، لینن گراد کا ہو یا دوشنبہ اور تاشقند کا ۔

مقام کیف و انبساط

اس سیر سپاٹے کے بعد ہم ایک مقام ”ورزوب“ پر آ کر

رکے ، جہاں سب کے لئے دوپہر کے کھانے کا اہتمام ایک ریستوران میں کیا گیا تھا۔ اس کا ایک طعام خانہ لب جو ہے۔ واہ وا ! کیا جگہ ہے۔ دریائے دوشنبہ پورے زور و شور اور حسن کے ساتھ بہ رہا تھا۔ سامنے برف پوش پہاڑ تھے۔ موسم کسی قدر سرد تھا مگر کبھی سورج بادلوں میں سے جھانکتا تو دھوپ چھاؤں کا فرق عجیب کیفیت طاری کرتا تھا۔ میں نے پروفیسر عاصموف صاحب سے کہا :

" آپ کے ذوق لطیف اور حسن انتخاب اور صلاحیت انتظام کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے آج پورے دن اس کیف و انبساط سے دوچار کیا ہے، جسے عرصہ دراز تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خدا آپ کو خوش رکھے"۔

کھانا حسب معمول خوب تھا۔ شراب و کباب کا لطف تو ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے جو اس شغل کو حاصل زندگی بلکہ واحد مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس ریستوران کے پس منظر کی موسیقی سے لطف اٹھاتا رہا۔ دریائے دوشنبہ کی ہر لہر ایک غیر مرئی ساز پر نغمہ الاپ رہی تھی۔ سوز و گداز سے پر نغمے ہوا میں ابھر رہے تھے۔ اس کی بل کھاتی ہوئی لہریں اور مسلسل شور چشم تصور کو سہارا دے کر رقص و سرود کی دنیا میں لے جارہا تھا۔ میں نے دخت رز سے دامن بچا کر اپنے ذوق کے مطابق سیدھا سادا ناشتہ کیا اور پھر آہنی کٹھرے کا سہارا لے کر نیم دراز ہوگیا۔ میرے کان برابر لہروں کی موسیقی کے لئے وقف تھے اور آنکھیں سرسبز پہاڑوں کا نظارہ کر رہی تھیں۔ بالآخر چلنے کا وقت آگیا۔ میں نے دل میں کہا ع

" حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد "

موٹر میں آکر بیٹھ گیا۔ باقی ساتھی بھی آگئے۔ ان میں سے بعض بادل ناخواستہ اٹھے تھے۔ شاید وہ دو چار اور جام خالی کرنے کے درپے تھے۔ موٹریں بڑی تیزی سے چلیں اور شام کے تقریباً پونے پانچ بجے ہم سب ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس پر جناب ڈاکٹر اکبر جان ہم سب کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ لوگ پہلے پہنچ چکے تھے۔ میں جس موٹر میں تھا، وہ ذرا دیر میں پہنچی۔ اسلئے کہ راستے میں ایک اسٹور سے آقائی غلام مصطفیٰ رسولی صاحب خریداری کے لئے رک گئے تھے۔ میں بھی اتر کر اسٹور میں چلا گیا، میں نے آمنہ اور ماہم کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑے کا خرید لیا۔

ریسٹ ہاؤس پر اکبر جان صاحب نے صرف دس منٹ کی مہلت دی کہ میں جلد تیار ہوجاؤں۔ میں نے طوفان کی رفتار سے تیاری کی۔ غسل کیا۔ دو فرض نماز عصر کے ادا کئے اور باہر آگیا۔ دوسرے سب غائب تھے۔ وہ انتظار کئے بغیر چلے گئے تھے۔ وہ مجھے زاہد خشک کہتے تھے۔ میرا ان کا میل بھی کیا تھا۔ بہر نوع اکبر جان صاحب میرے منتظر تھے۔ میرے ہمراہ روانہ ہوئے۔ بارے ہم سوا پانچ بجے تھیٹر پہنچ گئے۔ رقص و سرود کا سارا پروگرام عینی سے متعلق تھا۔ مجموعی طور پر اسے بہت ہی اچھا کہا جاسکتا تھا مگر میری دل چسپی کا اس میں سامان نہیں تھا۔ غالب کا ایک مصرع میرے ذہن کا ترجمان تھا۔ ع

" پر طبیعت ادھر نہیں آتی "

انجمن دوستی کی چیرمین

محترمہ مادام مغفرت کریموا صاحبہ تاجیکستان کی انجمن دوستی کی چیرمین ہیں ۔ ملک میں ان کا علمی مقام بہت بلند ہے ۔ آج کے پروگرام میں صرف انڈیا اور پاکستان کے وفود کو ان سے ملاقات کرنی تھی ۔ پروفیسر عاصموف صاحب تھیٹر میں آگئے تھے ۔ اس سے قبل وہ کسی جگہ ایسے پروگرام میں نہیں دیکھے گئے تھے ۔ ان کی متانت و سنجیدگی اور رجحان طبع شاید ایسے ہنگاموں سے فرار پر ان کو آمادہ کرتا رہتا ہے ۔ اس وقت وہ شاید اسلئے شریک محفل ہوگئے تھے کہ انہیں ہم مندوبین کو مادام مغفرت کے ہاں لے جانا تھا ۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس شہر دوشنبہ میں ثقافتی سرگرمیوں کے کتنے زیادہ ہال ہیں اور ان میں پروگرام اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ وہ کبھی خالی نہیں رہتے اور ان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی ۔ شاید ماسکو شہر اس اعتبار سے بازی لے جائے ۔ یہاں جو پروگرام ہوتے ہیں ، ان کے بارے میں سنا ہے کہ مہینوں پہلے ٹکٹ خریدنے پڑتے ہیں ورنہ مایوس ہونا پڑتا ہے ۔ طول و عرض کے اعتبار سے دوشنبہ کوئی بڑا مقام نہیں ہے لیکن ثقافتی سرگرمیاں عروج پر رہتی ہیں اور اسی لحاظ سے ثقافتی مراکز بے شمار ہیں ۔ اسکے برعکس ایک ہمارے ملک اور خصوصاً شہر کراچی کا حال ہے کہ کوئی بھی کانفرنس ہال قابل ذکر نہیں ہے ۔ لے دے کر ایک آرٹس کونسل ہے ۔ اس کے بارے میں صورت حال یہ ہے کہ اس کی تعمیر پندرہ برس سے ہورہی ہے اور کسی طرح مکمل ہونے کا نام نہیں لیتی ۔ جب دوسرے ممالک کے

ثقافتی طائفے آتے ہیں تو بڑی شرم آتی ہے ۔ کوئی ایسی مناسب جگہ نہیں ہے جہاں وہ اپنی ضرورت کے مطابق فن کی نمائش کریں اور قیام بھی کرسکیں ۔ کوئی بڑی کانفرنس ہو تو اسٹیٹ بنک کے ایک حصے کو خالی کرایا جاتا ہے یا حبیب بنک پلازا کی ایک منزل مخصوص کرائی جاتی ہے ۔ کبھی کبھی اسمبلی ہال بھی استعمال میں آجاتا ہے ۔ ورنہ ہوٹل ہیں جو ہرگز کسی علمی کنگرس کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے ۔ میں ایک عرصے سے مزار قائداعظم رح سے ملحق زمین پر ایک بین‌الاقوامی معیار کا مرکز کنگرس بنانے پر زور دیتا رہا ہوں مگر اس میں گزشتہ پندرہ سولہ سال سے رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں ۔ اب ایک مشیر صاحب کو میری تجویز اور جدوجہد پسند نہیں ہے ۔ وہ اس کا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں ۔ میں کب کہتا ہوں کہ اس افتخار کا سہرا میرے سر باندھو ، مگر کام تو کرو ۔

مادام مغفرت کریموا کا بڑا نفیس دفتر تھا ۔ اس میں کانفرنس ٹیبل پر ہم تین آدمی بیٹھے ۔ فیض احمد فیض ، میں اور علی سردار جعفری ۔ میز پر چار جھنڈے تھے — روس ، تاجیکستان انڈیا اور پاکستان — یہ ملاقات باہمی تبادل خیالات کے لئے تھی اور خصوصیت کے ساتھ تھی ۔ مادام ہیڈ آف دی ٹیبل سے اٹھکر میرے پاس آگئیں ۔ جناب فیض میرے دائیں جانب تھے ۔ وہ ہم سے تبادل خیال کرتی رہیں ۔ چائے ، بسکٹ اور شراب کا اہتمام تھا ۔ جام شراب جب تک شراب سے پر نہ ہو ، ٹوسٹ پروپوز کرنا ثقافت و روایت کے خلاف ہوتا ہے ۔ میرا جام شراب بھرا تو ضرور گیا لیکن وہ نہ خالی ہوا ، نہ چھلکا ۔ پھر کوئی بتائے کہ

ٹوسٹ اخوت اور دوستی کے لئے پروپوز ہوا کیسے ؟

محترمہ نے ہم سب کو تحائف عطا کئے اور پھر وہ مزید تحائف کے لئے نیچے چلی گئیں ، جہاں خواتین کو مصروف کر دیا گیا تھا ۔ اوپر کی میٹنگ میں وہ شریک نہ ہوسکیں ۔

میں نے رات ساڑھے نو بجے تک اپنے ساتھ لائے ہوئے ھدایا کو مرتب کیا اور ان کو کاغذ میں باندھا ، سب پر نام لکھ دیا تاکہ یاد رہے اور وقت ضرورت خیال رکھا جاسکے ۔ میں اکیڈمی آف سائنس کے لئے کتابیں بھی لے گیا تھا اور ڈائریاں بھی جو ہمدرد نے مرتب کی اور شائع کی تھیں ۔ مجموعی طور پر ھدایا کے نو پیکٹ تیار ہوئے ۔ کل صبح نو بجے پروفیسر محمد عاصموف صاحب مجھسے علیحدگی میں تبادل خیال کرنے کے لئے آئیں گے ۔ میں ان کی معرفت یہ ھدایا سب کو بھیج دونگا ۔ ایک ھدیہ خود ان کے لئے بھی تھا ۔ ایک مادام مغفرت کریمو وا کے لئے تھا ۔ باقی مادام مریم سلگانگ ، ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف ، محترمہ بیوہ بابا جان غفوروف ، بیگم کمال صدرالدین عینی ، ڈاکٹر منیرہ ، مادام مارگریٹا اور ڈاکٹر اکبر جان کے لئے تھے ۔ میرا یہ فیصلہ مناسب تھا کہ ان ھدایا کی تقسیم میں عاصموف صاحب کی اعانت حاصل کی جائے ۔

دس بجے رات کھانا کھانے گیا ۔ بس مرغی نوش جان کرکے واپس آگیا ۔ حسب معمول مطالعہ کرتا رہا اور پھر سوگیا ۔

دوسرے روز صبح اٹھ کر نماز فجر سے فارغ ہوکر پروگرام کے مطابق اگلے سفر کی تیاری شروع کردی ۔ اب ہمیں اس شہر جانا تھا جسے بخارا کے ساتھ ساتھ ، ایک سانس میں دونوں کا نام

لے کر لسان الغیب حافظ شیرازی نے اپنے محبوب کے سیاہ خال پر بخش دیا تھا اور ذرا بھی خیال نہیں کیا تھا کہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے دونوں شہروں کے باشندوں سے صلاح و مشورہ اور اجازت طلب کرلی جاتی، لیکن شاعر ان جمہوری روایات کی کب پابندی کرتے ہیں ۔ اس جگہ کے اثار بھی بہت مشہور ہیں ۔

میں اپنی تیاری میں مشغول تھا کہ ڈاکٹر اکبر جان تشریف لے آئے تھے ۔ وہ وقت مقرر کر گئے تھے ۔ بڑی محبت سے میرے پاس بیٹھے ۔ ذرا شاعرانہ انداز میں فرمایا :

” آپ نے محسوس کیا ، جس دن آپ یہاں آئے تھے ، اس دن سورج اپنی پوری ضیا باریوں کے ساتھ روشن تھا ، آپ کے خیر مقدم کے لئے اور خوش آمدید کہنے کے لئے دنیا کھل کھلا اٹھی تھی ۔ اور آج آپ جارہے ہیں ، تو آسمان بھی رو رہا ہے ۔ یہ معمولی بوندا باندی نہیں ہے ، بلکہ جدائی کے آنسو بہائے جارہے ہیں ۔ آسمان میرے دل کا ھمنوا ہے “ ۔

شعبۂ اردو کے سربراہ

ڈاکٹر اکبر جان بہت اچھی اردو بولتے ہیں ۔ اہل پاکستان کو ان پر فخر کرنا چاہئے ۔ وہ اکیڈمی آف سائنسز ، تاجیکستان کے زیر اہتمام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں جب میں یہاں بہ سلسلۂ جشن امیر خسرو دھلوی آیا تھا تو اکبر جان میرے مترجم تھے ۔ اس درمیانی وقفے میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کرلی ہے ، گویا پوری طرح سند یافتہ ہوگئے ہیں ۔ بالکل پاکستانیوں کی طرح اردو بولتے ہیں ۔

گفتگو میں محاورے اور ضرب الامثال تک استعمال کرتے ہیں۔ اس قدر عبور حاصل کئے بغیر تو انہیں ڈاکٹریٹ نہیں مل سکتی تھی۔ یہ دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا کہ ان کے تھیسس کا موضوع کیا تھا۔

ڈاکٹر اکبر جان ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ محترم جناب پروفیسر عاصموف صاحب تشریف لے آئے۔ اکبر جان اٹھ کر چلے گئے۔ دراصل میں نے ڈاکٹر اکبر جان کو آج صبح نو بجے آنے کی زحمت دی تھی تاکہ جب پروفیسر عاصموف صاحب سے فارسی میں بات چیت ہو تو ڈاکٹر اکبر جان میری مدد کرسکیں۔ مگر عاصموف صاحب نے ان کو اشارہ کردیا اور تخلیہ ہوگیا۔ عاصموف صاحب صرف تاجیکی، فارسی اور روسی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ بارے مجھے ان سے آدھ گھنٹے سے زیادہ باھمی دلچسپی کے امور پر تبادل خیال کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

تشکر و امتنان کا اظہار دونوں جانب سے تھا۔ وہ میری شرکت جشن صد سالہٗ عینی کا شکریہ ادا کرتے رہے اور میں ان کی یاد فرمائی اور انتہا درجے کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ پروفیسر عاصموف صاحب کے علم میں یہ بات تھی کہ میں نے اپنے تاثرات سفر قلم بند کرنے شروع کردئے ہیں، کیونکہ اسی وقت سے ''روس نامہ،، مرتب کرنے کا ارادہ ہوگیا تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ میں نوٹس لیتا رہوں۔ میں نے ان کو اب تک کے صفحات، جو میں نے گیارہ اپریل سے لکھنے شروع کردئے تھے، دکھائے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے عینی پر کتب

حوالہ آپ کے لئے جمع کردی ہیں، جو آپ کو ابھی مل جائینگی۔ نیز وہ تصاویر جو اب تک تیار ہوسکی ہیں، کتابوں کے ساتھ ہونگی۔ وہ سب آپ کی اپنی کتاب کے لئے مناسب رہینگی۔ ان کی جانب سے ڈاکٹر عبد اللہ جان صاحب نے اشارہ کردیا تھا کہ ہماری فکر کا محور اکتوبر کا انقلاب ہے۔

اب سے تین سال پہلے ایران نے جشن ہزار سالہٗ ابن سینا منایا تھا۔ آج پروفیسر عاصموف صاحب نے تبادل خیال زیادہ تر اسی موضوع پر کیا۔ یہی بات سال گذشتہ اگست میں ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ۔ یو۔ کے) میں بھی ان سے ہوئی تھی۔ غالباً ایران نے پہل کے خیال سے جشن ہزار سالہ قبل از وقت منا لیا تھا۔ پروفیسر عاصموف روس میں یہ جشن اکتوبر ۱۹۸۰ء میں منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور منصوبے بنا رہے ہیں۔ ان کی رائے میں صحیح وقت اور تاریخ یہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جشن کی ابتدا ماسکو میں ہوگی۔ اجلاس سائنسی دوشنبہ میں ہونگے اور بخارا میں جلسہٗ آخری منعقد ہوگا۔ انہوں نے مجھسے کہا کہ آپ نے جس طرح البیرونی کا ملک گیر پروگرام بنایا تھا، ہم اس سے متاثر ہوئے تھے اور آپ ملک میں ہر موقع پر کئی جگہ اجلاس کرتے ہیں تاکہ مقامی علماء اور دانشور آسانی سے شرکت کرسکیں۔ آنے جانے کی زحمت سے بچ جائیں۔ میں اپنے دل میں متاسف ہوا کہ کنگرس عالمی تاریخ و فلسفہ سائنسی ۱۹۷۹ء میں ہماری وزارت خارجہ صرف ایک شہر تک محدود کرنے کی ہدایت دے چکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بروقت کسی کے صلاح و مشورے پر وہ اس تقریب کا پروگرام ذرا وسیع پیمانے پر بناتے ہوئے دوسرے اہم

شہروں کو بھی اس میں شریک کرلے - میری رائے ہے کہ یہ کنگرس اسلام آباد تک محدود نہ رہے کم سے کم لاہور اور کراچی ضرور شامل کئے جائیں -

پروفیسر عاصموف صاحب چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں انھیں میرا تعاون حاصل ہوجائے - مجھے ابن سینا پر جو حوالے مل سکیں، ان کو فراہم کردوں اور کرتا رہوں اور اس جشن کے علمی مقام کو بلند کرنے میں ان کی اعانت کروں - آج صبح کی گفتگو کا ماحصل یہی موضوع تھا - میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ برصغیر کی حد تک میں ان سے تعاون کرونگا - جن اسکالرز کو دعوت شرکت دینی چاہئے، میں ان کے انتخاب میں بھی تعاون اور اشتراک کرونگا - انھیں اس اعتبار سے بڑا اطمینان ہوگیا -

ابن سینا

ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا، جنھیں مختصراً صرف ''ابن سینا''، اور لاطینی انداز تحریر و تلفظ کے اعتبار سے تمام مغربی زبانوں میں ''ایوے سینا''، کہا جاتا ہے، ۹۸۰ء میں پیدا ہوئے اور اٹھاون سال گزار نے کے بعد ۱۰۳۸ء میں فوت ہوئے تھے - ان کے والد امیر بخارا ابن منصور کے عہد میں سرکاری محصول وصول کرنے والے عملے میں شامل تھے - اس وقت کے مسلمانوں کے طور طریق کے مطابق تلاوت قران مجید سے ان کی تعلیم کا آغاز ہوا - نو سال کی عمر میں انھوں نے تمام کلام پاک حفظ کرلیا - پھر عام درسی کتابیں سنبھالیں اور انجام کار ریاضی، منطق، اقلیدس اور طب میں کمال حاصل کرلیا - اس وقت ان کی عمر سولہ سال ہوچکی تھی - اس عمر کے بچے عموماً مکتب کی کسی جماعت میں

زانوئے ادب طے کرتے نظر آتے تھے، لیکن ابن سینا نے اپنے ذوق اور حافظے کی بنیاد پر بے پناہ ترقی کی اور اپنے استادوں تک سے خراج تحسین وصول کرلیا - طب سے ان کو خاص لگن تھی - چنانچہ ایسے طبی نظریات قائم کئے جو اس سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھے - انھوں نے علاج معالجے کے نئے طریقے وضع کئے اور اس فن کی راہ میں پھیلی ہوئی رکاوٹیں بھی دور کیں - چنانچہ ان کو بقراط اور جالینوس سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی - دراصل انھوں نے ان کے ادھورے کام کو پائے تکمیل تک پہنچایا تھا اور یہی چیز ان کے لئے طرۂ امتیاز تھی -

وہ پکے مسلمان بھی تھے - احکام الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے وہ مشیت ایزدی پر کامل اعتقاد رکھتے تھے - چنانچہ وہ طبیب کو حصول صحت کا محض ایک ذریعہ سمجھتے اور جسمانی و ذہنی شفا کے لئے خدائے بزرگ و برتر سے دعا مانگنے کی تلقین کرتے تھے - ان کے نزدیک صحت کی اصل کنجی صرف خدا کے پاس ہوتی ہے -

اوائل عمر ھی میں انھوں نے امیر ہمدان کو ایک مہلک بیماری سے نجات دلائی تو اس نے خوش ہوکر اور اعتراف صلاحیت و استعداد کرتے ہوئے انھیں مسند وزارت پر جگہ دی جس کے وہ مستحق بھی تھے - لیکن وہ خود زیادہ عرصے اس عہدے پر فائز نہ رہ سکے اور علاحدگی اختیار کرلی کیونکہ ایک فرد سے وابستہ ہوجانے کے باعث وہ خدمت خلق کرنے سے قاصر ہوگئے تھے اور یہ انھیں گوارا نہیں تھا - وہ ہر شخص کو تندرست و توانا دیکھنا چاہتے تھے - وہ فرمانروائے اصفہان کے ایما

پر ترک وطن کرکے وہاں چلے گئے اور علاج معالجے کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کردیا ۔ ان کا منشاً یہ تھا کہ وہ اپنے تجربات ، مشاہدات اور تاثرات کو قلم بند کردیں تاکہ آنے والی نسلیں ان سے کماحقہ، استفادہ کرسکیں ۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ۔ ”القانون فی الطب،، جس کی بدولت انہیں دنیا بھر میں شہرت دوام حاصل ہوئی ، اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ ان کی یہ تصنیف عرصہ دراز تک مغربی دنیا کے طبی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل رہی ہے اور آج تک اس کے اندراجات بطور حوالہ پیش کئے جاتے ہیں ۔ اس کا متن انسانی صحت کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور آج بھی ، صدیاں گزر جانے اور ہر منزل پر ترقی کے سنگ میل نصب کردینے کے باوجود ، ان کا ہر نظریہ سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ۔

انہوں نے طبیعیات ، مابعد الطبیعیات ، فلکیات ، حیاتیات ، اخلاقیات ، حتیٰ کہ موسیقی پر بھی اپنی کتابوں میں سیر حاصل بحث کی ہے ۔ قانون طب کے بعد ان کی دوسری تصانیف میں الشفاً ، النجات ، اور الاشارات کافی مشہور ہیں ۔ ان کے تراجم دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں لیکن قانون طب سے مقابلہ کسی عنوان ممکن نہیں ہے ، کیونکہ اس کے ترجمے مہذب دنیا کی ہر مقبول عام زبان میں ہوچکے ہیں اور بے شمار ایڈیشن ہوئے ہیں ۔

حکومت پاکستان تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے آج سے بیس سال پہلے ہی طب مشرق کی برتری کو محسوس کرتے ہوئے اس کے اصولوں اور طریق علاج کی سائنسی تحقیقات کو منظم کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا تھا ۔ اس درمیانی مدت میں کچھ

رکنے پڑتے رہے اور تکمیل مقاصد نہ ہوسکی تاہم یہ نیک کام سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ہوتا رہا اور آج فخر کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ابنائے وطن کی ایک بڑی اکثریت اس طریق علاج کو پسند کرتی اور حصول صحت کے لئے اس پر بھروسا کرتی ہے ۔

ابن سینا کی ہزار سالہ تقریب میں حکومت پاکستان اور طبی اداروں نے ، جن میں ”ہمدرد،، کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے ، بھرپور حصہ لیا تھا اور خوشی کی بات ہے کہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے ایما پر کراچی کی ایک بڑی سڑک کا نام ”شاہراہ ابن سینا،، تجویز کیا گیا تو عوام نے اسے تسلیم کرلیا اور بلدیہ کو اسے عملی جامہ پہنانا پڑا ۔ دو سال بعد روس میں ابن سینا کا ہزار سالہ جشن ولادت منایا جائیگا تو مجھے یقین ہے کہ حکومت پاکستان اس میں حسب توفیق حصہ لیگی اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن بھی اس ضمن میں دامے ، درمے ، قدمے کسی سے پیچھے نہیں رہے گا ۔ یہ مسئلہ چونکہ عالمگیر نوعیت کا ہے ، اس لئے پروفیسر عاصموف صاحب کی اعانت بھی حسب وعدہ کی جائیگی ۔

میں اپنے وطن میں رہتے ہوئے صبح کا ناشتہ نہیں کرتا ، لہذا یہاں دوشنبہ میں اس عادت کے خلاف کس طرح عمل کرتا لیکن آج عاصموف صاحب نے اصرار کیا کہ روانگی کے وقت خالی پیٹ جانا مناسب نہیں ہے ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ جب فیض صاحب ناشتے کے لئے جائیں گے تو میں ان کے ساتھ چلا جاؤنگا ۔

اس کے بعد میں نے تمام ہدایا کو جو میں نے شب گزشتہ

تیار کرلئے تھے ، ان کے حوالے کردئے اور انہوں نے فوراً ھی ڈاکٹر عبداللہ جان اور ڈاکٹر اکبر جان کے ذریعے سے تقسیم کرادئے - باقی وہ اپنے ساتھ لے گئے تاکہ بعد میں بھجوا دیں - مجھے ھدایا ان کے سپرد کردینے کے بعد بڑا اطمینان نصیب ھوا کہ اس طرح ان کو درجۂ قبولیت حاصل ھوا -

سمرقند کا پروگرام

گزشتہ رات بتایا گیا تھا کہ دوشنبہ سے ھوائی جہاز سمرقند کے لئے گیارہ بجے روانہ ھوگا اور اسی اعتبار سے میں نے تیاری کی تھی - مگر اب ڈاکٹر اکبر جان صاحب نے بتایا کہ جہاز ساڑھے بارہ بجے پرواز کریگا - مجھے یہ بات اس لئے پسند نہیں آئی کہ میرے بارے میں سب لوگ جانتے ھیں کہ میں وقت کا بڑا احترام کرتا ھوں اور کنگرس کے منتظمین سے مکمل تعاون کرتا ھوں - دوسروں کے لئے یہ صحیح ھے کہ ان کو آمادۂ سفر کرنے کے لئے اس قسم کی حرکت کی جائے - بارے میں نے بھائی جان محترم اور استاذی محترم مولانا سجاد حسین کو دھلی کے پتے پر نیز ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب کو لاھور کے پتے پر خطوط لکھ دئے اور ڈاکٹر اکبر جان صاحب کو پوسٹ کرنے کے لئے دیدئے -

دوشنبہ کے ھوائی میدان پر اطاق امیران (VIP) میں چھل پھل ھوگئی - ھم مجموعی طور پر پندرہ سولہ مندوبین تھے کہ جو اس وقت ایک ساتھ سفر کر رھے تھے - اتنے میں پروفیسر عاصموف صاحب بھی آگئے - اور خانوادۂ عینی بھی ھمیں خدا حافظ کہنے کو موجود تھے - بس بیوۂ عینی نہ تھیں - ان سے ھم کل جاکر مل ھی آئے تھے -

مندوبین کے تاثرات

ٹیلے وژن کے لوگ ھماری روانگی کے وقت کی عکسی کے لئے تیار تھے- درحقیقت یہ جشن کے بارے میں تاثرات ریکارڈ کرنے کا موقع بھی تھا اور بہت صحیح وقت تھا - اگر سب مندوبین بیک وقت روانہ ھورھے ھوں تو ایسا ھی کرنا چاھیے - انہوں نے مجھ سے بھی تاجیکی زبان (فارسی) میں انٹرویو کے لئے درخواست کی اور میں نے اطمینان سے جو انٹرویو دیا ، وہ تقریباً یہ تھا :

” ابن خلدون کہ فلسفی و ماھر تعلیم بود در شرق اوسط در مقدمۂ اوگفتہ اند کہ معاشرہ کہ احترام علم و عالم دارد سربلندی و سرفرازیٔ آن معاشرہ یقینی ست - ایں قول خلدون برائے ھمہ عالم است و برائے ھمہ وقت و ھمہ دور صحیح تر است - می دانم کہ بعد از انقلاب اکتوبر در روس و ھمہ جماھیر سوروی احترام علم و عالم قرار داد - ایں جشن صد سالۂ عینی بہ مناسبت صدرالدین عینی مظاھر ھائے اں احترام است -

علماء از ھمہ عالم و ملل ایں جا در دوشنبہ جمع شدہ اند بہ عنوان ایں احترام و اکرام علم و عالم ایں اجتماع بزرگ است و پر مقصد است - من خوش بختم کہ در ایں کنگرس علمی شرکت می کنم و خیلے ممنون ھستم ، بسیار متشکرم کہ تاجیکستان اکیدمی سائنسی بمن را دعوت شرکت داد -

بقول عینی :

دوستیٔ خلق جہاں پیش گرفتیم
از ماست برآں کس کہ چنیں رنگ بگیرد

ھوائی میدان پر پروفیسر عاصموف صاحب ، مادام مریم سلگانگ اور میرے مابین ایک اور تبادل خیال ھوا ۔ پروفیسر عاصموف صاحب نے کہا : ”آپ نے مقالے کے جو حصے حذف کئے ھیں ، ان کو ھم حذف کرکے ھی شائع کرینگے “۔ میں نے کہا کہ یہ حذف وقت کی کمی کی وجہ سے تھا ۔ ورنہ مقالہ تو پورا ھی اختیار کرنا چاھئے ۔ میں نے ان کی بات سمجھ لی ۔ میں نے اپنے مقالے میں امیر بخارا کو کلیتہً مورد الزام بنانے سے گریز کیا تھا ۔ درحقیقت یہ فکر انقلاب اکتوبر کی روح کے منافی تھا اور پروفیسر عاصموف صاحب اس کی تبدیلی کے خواھاں معلوم ھوتے تھے ۔ میں نے ان کی بات سمجھ لی اور میں نے ان سے کہا کہ میں غور کرکے اس میں مناسب تبدیلی کردونگا اور اپنا مقالہ فارسی زبان میں تیار کرکے دونگا ۔ وہ اس کا انتظار کریں ۔

میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ عینی کی زندگی پر جو تصویر (فلم) تیار ھوئی ھے وہ اور کنگرس کے لئے جو فلم بنی ھے، اس کی جھلکیاں پاکستان کے لئے تیار کرکے دی جاسکتی ھیں ۔ میں نے ان کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ یہ تمام سامان وولکاف (Vol Kov) صاحب کو کہ جو روس کے قونصل جنرل ھیں، بھجوائیں تاکہ وہ پاکستان کی وزارت تعلیم و ثقافت کے حوالے کریں اور پھر پاکستان میں جشن عینی پر ان فلمز کو دکھایا جاسکے ۔ انھوں نے بتایا کہ وہ یہ کام کر رھے ھیں اور جلد اس پر عمل

کریں گے ۔

ساڑھے بارہ بجے ھم ٹرائڈنٹ ھوائی جہاز میں سوار ھوگئے ۔ پون بجے جہاز دوشنبہ سے اڑا اور سمرقند کی جانب روانہ ھوگیا ۔ موسم ابر آلود تھا ۔ تقاطر بھی جاری تھا ۔ مگر عاصموف صاحب اور ان کے رفقاء ھوائی میدان کے باھر کھڑے رھے اور خدا حافظ کہتے رھے ۔

پینتالیس منٹ کے بعد ھم سمرقند کے ھوائی میدان پر اتر گئے ۔ یہاں خوب بارش ھورھی تھی ۔ جہاز میں سے اترنا بھی مشکل تھا ۔ یہ بات اچھی نہ ھوئی ۔ میرے مترجم ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب شریک سفر تھے ۔ معلوم ھوا کہ وہ مجھ سے اس وقت رخصت ھونگے کہ جب میں سمرقند سے دوبارہ ماسکو جاؤنگا ۔ ان کی ذمہ داری اس وقت ختم ھوجائیگی ۔ پروفیسر عاصموف صاحب نے میرا بڑا خیال رکھا تھا ۔ ضروری نہیں تھا کہ عبداللہ جان صاحب کو زحمت دی جاتی ۔ ماسکو سے آئے ھوئے تین مترجم تھے جو ھمہ وقت ھمارے ساتھ رھتے تھے ۔ میں کسی ایک گروپ میں شامل ھوسکتا تھا مگر انھوں نے ایک علىحدہ مترجم کو میرے ساتھ رکھا ۔ یہ انتہائی مہمان نوازی تھی ۔ اور روایات حسنہ کی امین ۔

ایک بس ھوائی جہاز کے قریب آئی اور ھم سب اس میں سوار ھوگئے ۔ پھر اسی بس میں ھم ھوٹل تک پہنچ گئے [illegible] اپنے ساتھ لائے ۔ ان
”ھوٹل سمرقند “ (روپیہ) احادیث ان کے نزدیک معتبر
کمرہ نمبر 722 نے ” صحیح “ کے نام سے جمع کردیا جسے

بارش کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی - ہم نے اپنی گھڑیاں ایک گھنٹے پیچھے کرلیں - ہمیں بتایا گیا تھا کہ دوشنبہ اور یہاں کے وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے - کھانا دن کا کھایا گیا - تقریباً چار بج گئے - اب دن کو میری شیرخواری نے شہرت اختیار کرلی تھی - میرے بارے میں عموماً یہ جملہ کسی نہ کسی کی زبان پر آجاتا تھا : ،، بھئی حکیم صاحب آ گئے ہیں - ان کے لئے دودھ لے آؤ ،،۔

طے پایا کہ ہمت کی جائے اور نہیں تو کم سے کم بس میں بیٹھ کر شہر میں گھوم لیا جائے - چنانچہ سب تیار ہوگئے - میں نے نئے کپڑے کہ جو صبح پہنے تھے ، اتار دئے اور پرانے کپڑے نکال کر زیب تن کرلئے - آخر ان کو خراب تو ہونا ہی ہے -

سمرقند کی تاریخی حیثیت

سمرقند ، جو دریائے زرافشاں کے کنارے واقع ہے ، دنیا میں موجود قدیم ترین شہروں میں سے ایک اور وسطی ایشیا کا قدیم ترین شہر ہے - اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کے اور بہت سے شہروں کی طرح طوائف الملوکی کا شکار رہا ہے - قدیم یونانی نوشتوں میں اس کا ذکر ،،ماراکندا،، کے نام سے کیا گیا ہے - اس سے قبل اس مقام پر ایک چھوٹا سا قصبہ ،،افروسیاب،، کے نام سے [illegible] تھا - یہ تین چار ہزار سال قبل مسیح کی بات ہے - اس تاکہ وہ پاکستان کی!، رہی موجودہ شہر کے جانب شمال دیکھے پھر پاکستان میں جشن عینی'ہٰزہ کے بڑے شہروں میں شمار انھوں نے بتایا کہ وہ یہ کام کر رہے ہیں یم تجارتی شاہراہ پر

واقع تھا -

۳۲۹ قبل مسیح میں اسکندر اعظم نے اس علاقے کو فتح کرلیا اور اس طرح مغربی دنیا اور چین و روس کی قدیم ثقافتوں کا مقام اتصال بن گیا - آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں عرب کے مسلمانوں نے اس پر قبضہ جما لیا اور اس طرح تمدن عرب کا ایک اہم مرکز بن کر اموی اور عباسی سلطنتوں کا جزو بن گیا - یہاں کے فن تعمیر میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے خاص دلچسپی لی اور جو کام ان سے ادھورے رہ گئے ، انھیں عمر بن عبدالعزیز نے پورا کردیا - انھوں نے والئی سمرقند کو یہ بھی حکم دیا کہ تمام اہم سڑکوں کے ساتھ ساتھ مسافر خانے بنوائیں ، مسافروں کو کھانا مہیا کریں اور جو بیمار ہوں ، ان کی دیکھ بھال کریں - رفاہ عامہ کا یہ انداز عرصہ دراز تک چلتا رہا -

اسی دوران میں یعنی ۷۵۱ء میں چین کی سرحد سے باہر کاغذ کا پہلا کارخانہ قائم ہوا کیونکہ اس صنعت کے وسائل سمرقند اور اس کے آس پاس موجود تھے - اسی شہر میں حضرت امام بخاری کا مقبرہ موجود ہے جو مسلمانوں کی عظیم زیارت گھوں میں شمار ہوتا ہے - ان کا وصال ۸۷۰ء میں ہوا تھا - امام بخاری کا پورا نام ابو عبداللہ محمد بن اسمعیل تھا - انھوں نے سولہ سال ہی کی عمر میں عرب کی سیاحت کی اور علم الحدیث کی تعلیم پائی - بعد میں مصر کے اسلامی مدارس میں تکمیل علم کرتے رہے - جب بخارا واپس آئے تو چھ لاکھ احادیث اپنے ساتھ لائے - ان میں سے صرف سات ہزار دوسو پچھتر احادیث ان کے نزدیک معتبر تھیں - انھی کو انھوں نے ،، صحیح ،، کے نام سے جمع کردیا جسے

اب ''صحیح بخاری،، کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ آپ نے قران مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ اسی عہد کے ایک اور سمرقندی عالم عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی تھے۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور علمی کتاب ''مسند،، ہے۔ ان کا انتقال ۸۶۸ء میں ہوا۔

خراسان کے سامانی خاندان کے زیر نگین، جس کا دور ۸۷۴ء سے ۹۹۹ء تک رہا، سمرقند کی شان و شوکت برابر بڑھتی رہی۔ اسی طرح سلجوقیوں اور خوارزم شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں اس کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی۔ جب سلطان سنجر سلجوقی خراسان کا فرمانروا تھا تو اس کے حکم سے بہرام شاہ غزنوی سمرقند کا حاکم مقرر ہوا تھا لیکن اس نے بے وفائی کی اور شورش برپا کرکے سمرقند اور آس پاس کے علاقوں کو بلا شرکت غیرے ہتھیا لینا اور خود مختار بن جانا چاہا۔ لیکن سلطان سنجر نے فوج کشی کرکے شہر کا محاصرہ کرلیا اور فتح پاکر وہاں کی حکومت احمد کے بیٹے نصر کے سپرد کردی۔ احمد بن سلیمان ماوراالنہر کے علاقے کا فرمانروا تھا۔ اس موقع پر بھی خاصی تباہی ہوئی تھی۔ مشہور شاعر انوری نے ''اشک ہائے خراسان،، کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں :

بر سمرقند اگر بگذری اے باد سحر
نامۂ اہل خراسان بر در سلطان بر
نامۂ مطلع او رنج تن و آفت جان
نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر

ستم بلائے ستم یہ تھا کہ ۱۲۲۰ء میں چنگیز خاں کا حملہ ہوا جس نے شہر کو یکسر تباہ و برباد کردیا۔ یہ تباہی تو قسمت

میں لکھی تھی۔ البتہ شیبانی خاں کے جانشین عبیداللہ نے اپنے قبیلے کے لوگ جمع کرنے شروع کئے اور ایک بڑا لشکر تیار کرلیا۔ لیکن اس دوران میں شاہ اسمعیل اور بابر میں اتحاد ہوگیا تھا کیونکہ ازبکوں کی شکست کے بعد جو قیدی لائے گئے، ان میں ظہیر الدین بابر کی ہمشیرہ بھی شامل تھی، جسے اسمعیل نے بڑے احترام کے ساتھ واپس کردیا تھا۔ یہ گویا شاہ اسمعیل اور بابر کے اتحاد کا پہلا قدم تھا۔ لیکن شیبانی نے جلد وفات پالی۔ بابر نے اس کی موت سے فائدہ اٹھا کر ماوراالنہر پر حملہ کیا اور باقی ماندہ ازبک خاندانوں کو شکست دیدی اور سارا علاقہ اپنے مخالفوں سے پاک کردیا۔ پھر وہ سمرقند میں داخل ہوا جہاں سے اسے شیبانی خاں نے نکالا تھا۔

اس زمانے کے مشہور جغرافیہ داں یاقوت بن عبداللہ رومی نے، جو مشرقی روم میں پیدا ہوا لیکن دراصل یونانی النسل تھا، اور اپنا بیشتر وقت وسط ایشیا کی سیاحت میں گزار چکا تھا، سمرقند و بخارا کی تباہی کا حال سنا اور بہ چشم خود مشاہدہ کیا، تو موصل چلا گیا۔ اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگیا۔ سمرقند کی تباہی کا حال اس نے ''معجم البلدان،، میں تحریر کیا ہے جسے مستند مانا جاتا ہے۔ ۱۲۲۸ء میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

تباہی سے قبل اس شہر کی حفاظت کے لئے کئی ہزار سپاہی متعین تھے۔ انھوں نے کچھ عرصے تو مدافعت کی تھی لیکن مقابلہ بڑا سخت تھا، کیونکہ چنگیز خاں کے فوجی تعداد میں زیادہ اور فن حرب سے بخوبی واقف تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تمام امراء اور اہل لشکر قتل کردئے گئے اور شہر پر

پوری طرح تسلط حاصل کرلیا گیا تھا۔ چنگیز خاں کے حملے اور مقامات پر بھی عارضی طور پر کامیاب رہے تھے۔

اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں تیمور لنگ نے ایک بار پھر اس سر زمین کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور اسے اپنی سلطنت کا صدر مقام بنا کر سابقہ شان و شوکت عطا کردی۔ لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی رونق کو گھن لگ گیا۔ پندرھویں صدی میں پھر نقشہ بدلنا شروع ہوا اور ایک عرصے تک ازبک خاندان کے فرمانروا سریر آرائے سلطنت رہے۔ اس دوران میں وہ امارت بخارا کا ایک حصہ بن گیا۔

۱۵۱۰ء میں شاہ اسمعیل نے خراسان کی طرف پیش قدمی کی جہاں ازبک خاندان کا ایک نام لیوا شیبانی خاں سردار مملکت تھا اور چنگیز خان کے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ جب شاہ اسمعیل نے اطاعت قبول کرنے کا فرمان بھیجا تو اس نے نہایت ذلت آمیز جواب دیا۔ اس طرح آپس میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس جنگ میں سترہ ہزار ایرانیوں نے اٹھائیس ہزار ازبکوں کو شکست فاش دی۔ جب شیبانی خاں کا سر کاٹ کر اسمعیل کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اس کی کھوپری پر سونے کا خول چڑھا کر شراب پینے کا پیالہ بنا دیا جائے۔ اس نے بلخ اور ھرات کو بھی مسخر کرلیا۔

پھر ۱۸۶۸ء میں جب بخارا کے امیر شاہان روس کے باجگزار ھوگئے تو سمرقند کے نام لیوا بھی بدل گئے۔ ۱۹۲۰ء میں اسے ازبک سوویت سوشلسٹ ری پبلک کا صدر مقام بنادیا گیا۔ لیکن پانچ ھی سال بعد تاشقند نے اس کی جگہ لے لی۔ اب سمرقند کا

پرانا علاقہ پورے شہر کا مشرقی حصہ ھے اور ریگستان کے نام سے موسوم ھونے والی مربع سرزمین کے وسط میں واقع ھے۔ یہاں کے بعض تاریخی مقبرے اور شاندار مسجدیں اب بھی زیارت گاہ عالم ھیں۔ ان میں خود تیمور لنگ کا مقبرہ اور اس کی شریک حیات بی بی خانم کے نام سے تعمیر ھونے والی مسجد قابل ذکر عمارات میں شامل ھیں۔ تیمور لنگ کے پوتے آلغ بیگ کی بنائی ھوئی رصدگاہ اب بھی ماھرین فلکیات کو آسمانوں اور ان کی سطح پر جگمگانے والے ستاروں کی سیر کراتی ھے۔ اپنے عہد عروج میں سمرقند نرم ریشم اور اس کے متضاد سخت فولاد کی صنعتوں کے لئے مشہور تھا۔ یہ خصوصیت اب بھی بڑی حد تک برقرار ھے۔ روئی اور گیہوں کی کاشت بڑے پیمانے پر ھوتی ھے۔ ازبکستان کی سرکاری یونیورسٹی کے علاوہ یہاں طب اور زراعت کے درسی ادارے بھی قائم ھیں۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ بیس ھزار مربع میل ھے اور موجودہ آبادی بیس لاکھ سے زیادہ ھے۔

ھم سب بس میں بیٹھے شہر کی سیر کرتے رھے۔ ھلکی ھلکی بارش ھوتی رھی۔ جب بس آلغ بیگ کی آبزرویٹری (رصدگاہ) پر پہنچی تو اترکر عمارت میں گئے تاکہ اس کا عجائب گھر (میوزیم) دیکھ لیں۔ بہت خوب چیز ھے۔ حقیقتاً اسے دیکھے بغیر وھاں کی بہت سی چیزوں کو سمجھنا دشوار تھا۔ میں ستمبر ۱۹۷۸ء میں استنبول گیا تھا۔ وھاں "آبزرویٹریز ان اسلام" اجلاس کا موضوع تھا۔ وھاں جتنے مقالے پڑھے گئے، ان میں آلغ بیگ کی رصدگاہ کا ضرور ذکر کیا گیا۔ اب اس ضمن میں میری معلومات بڑی پختہ ھوگئیں۔

رصدگاهیں

رصدگاهوں کی تاریخ کا مطالعه ایک دلچسپ موضوع هے - بنی نوع انسان نے تاریخ سے قبل بھی اپنے مشاهدات اور واقعات کو عقل کی کسوٹی پر سمجھنے کی کوشش کی هے - اس نے کائنات کی هر چیز پر نظر ڈالی - ان میں تاروں بھرا آسمان بھی شامل رها - چنانچه ستاره شناسی اس کا دلچسپ مشغله بن گیا - جب زمین کی نیچی سطح پر ره کر ان کی حقیقت کو سمجھنے میں دشواری هوئی تو بلند پهاڑوں پر اونچی اونچی رصدگاهیں قائم کیں تاکه ستاروں، سیاروں اور چاند سورج کی رفتار اور ان کے طلوع و غروب کا صحیح اندازه هوسکے اور ان سے کوئی نتیجه نکالا جاسکے -

قدیم ترین رصدگاهوں کے آثار بابل و نینوا میں پائے جاتے هیں - ان کے بعد مصر کا نمبر آتا هے جهاں عبادت گاهوں، ان کی برجیوں اور میناروں پر سیر افلاک کا اهتمام کیا گیا تھا - تین سو سال قبل مسیح میں بطلیموس اول کی رصدگاه اسکندریه کے مقام پر تعمیر هوئی تھی جس کے کھنڈر اس سر زمین کے قدیم ترین آثار میں شمار هوتے هیں - نویں اور دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اس علم کو سب سے زیاده عروج دیا اور اس کے ایسے اصول منضبط کئے جو آج تک تسلیم کئے جاتے هیں - بغداد اور دمشق کی رصدگاهیں بے مثال تھیں - پندرهویں صدی عیسوی میں آلغ بیگ نے اس منزل میں قدم رکھا اور مغربی دنیا کے لئے نظیر قائم کردی - چنانچه یورپ کے علماء نے بھی ١٤٧٢ء میں پهلی قابل ذکر رصدگاه نیورمبرگ میں تعمیر کی - پھر یه سلسله چلتا رها -

١٥٨٤ء تک رصدگاهوں کی تعداد خاصی زیاده هوگئی - استارنبرگ کی رصدگاه، جو شاهی محل کی بلند ترین منزل پر تعمیر هوئی تھی، عمده ساز و سامان سے لیس کی گئی تھی - اس وقت جو آلات استعمال کئے گئے ان سے زمین کے ساتھ ستاروں کے زاویئے ناپنا اور ان کی رفتار معین کرنا ممکن هوگیا تھا - ایسے آلات وضع کرنے میں بھی مسلمان پیش پیش رهے - ان کا سب سے اهم آله، جو اصطرلاب کهلاتا تھا، آج بھی اسی نام سے موسوم کیا جاتا هے - زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان آلات کی تشکیل اور رصدگاهوں کی تعمیر میں جدتیں هوتی رهیں - سرکاری طور پر بھی هر جگه اس کی سرپرستی کی گئی - چنانچه ڈنمارک کے ایک فرمانروا نے ١٦٣٧ء میں جو رصدگاه کوپن هیگن میں بنوائی وه سائنسی اعتبار سے بڑی مکمل کهی جاسکتی هے - پھر پیرس میں ١٦٦٧ء سے ١٦٧١ء تک کی مدت میں کئی رصدگاهیں بن گئیں - انگلستان کی شاهی رصدگاه ١٦٧٥ء میں بمقام گرین وچ تعمیر هوئی جو اب تین سو سال بعد بھی کام کررهی هے - دو سال هوئے اس کا بڑا شاندار جشن منایا گیا تھا - دنیا بھر کے سائنسداں شریک هوئے تھے - بعض سائنسدانوں کی انفرادی کوششوں سے بھی چند رصدگاهیں تعمیر هوئیں - ان میں سے سر ولیم هرشل کی رصدگاه سب سے زیاده قابل ذکر هے - وه سب سے بڑا ماهر فلکیات تسلیم کیا جاتا هے - پھر ٹیلسکوپ کی ایجاد نے بهت سے پردے جو آسمان اور زمین کے درمیان پڑے هوئے تھے، دور کردئے اور اس طرح بهت سے اسرار و رموز منکشف هوگئے -

دوسری طرف ریاست هائے متحده امریکه میں اس وقت

تین سو سے زیادہ ایسی رصدگاہیں موجود ہیں جن سے کئے جانے والے مشاہدات کی تشہیر روزانہ کی جاتی ہے ۔ اس ملک کی ہر ریاست میں یونیورسٹی کی رصدگاہ الگ ہے کیونکہ علم فلکیات کی عملی تعلیم اس کے بغیر ممکن نہیں سمجھی گئی ۔ وہاں یہ سلسلہ ۱۸۳۹ء میں شروع ہوا اور ۱۹۰۶ء تک پائے تکمیل کو پہنچ گیا ۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم نے آلغ بیگ کی رصدگاہ اور اس سے متعلق عجائب گھر کو بہ نظر عمیق دیکھا اور حسن انتظام کی تعریف کی ۔ میں نے آلغ بیگ کے بارے میں بھی مطالعہ کیا ۔

آلغ بیگ

امیر تیمور کے چار بیٹے تھے : غیاث الدین جہانگیر ، عمر شیخ ، جلال الدین میران شاہ اور شاہ رخ ۔ آخرالذکر کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے آلغ بیگ اور علاء الدولہ کے سوا باقی سب باپ کی زندگی میں اور کم عمری میں وفات پاگئے تھے ۔ آلغ بیگ ، جس کا سن پیدائش ۱۳۹۳ء تھا ، اپنے باپ ہی کے عہد میں ترکستان کا حکمراں بنا دیا گیا تھا ۔ لیکن اس کی توجہ امور سلطنت کی طرف برائے نام اور زیادہ تر ترویج علوم کی جانب مبذول رہی ۔ اسی ضمن میں اس نے اپنی رصدگاہ ۱۴۲۱ء میں تعمیر کرائی تھی جو " زیج جدید سلطانی " کے نام سے مشہور ہوئی ۔ بطلیموس کے بعد یہ پہلا ستارہ شناس تھا جس نے اجرام فلکی کی ایک مکمل فہرست تیار کی تھی اور جس نے مصر کے بطلیموس کی فہرست کو ناقص اور نامکمل ثابت کر دیا ۔ اصل فارسی سے اس کا ترجمہ دس سال بعد عربی زبان میں ہوا اور پھر

سترھویں صدی عیسوی میں اس کا لاطینی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ انگلستان سے شائع ہوا ۔

اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے آلغ بیگ دور اور نزدیک کافی مشہور ہوا لیکن بہ حیثیت حکمراں بد نصیب تھا ۔ خاندانی تنازعات بھی اکثر اس کے لئے سوہان روح بنے رہے ۔ اس نے اپنے بیٹے عبداللطیف کو ہرات کا حکمراں مقرر کر دیا تھا ۔ کچھ ہی عرصے بعد اس نے اپنے ایک دوست عباس کو آلہ کار بنا کر باپ کو ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۴۹ء میں قتل کرا دیا ۔ چنانچہ اس کی تاریخ وفات ایک شاعر نے "عباس کشت" (۸۵۳ھ) سے نکالی تھی ۔ اس کا تار حیات بیٹے کے ہاتھوں ٹوٹ گیا لیکن رصدگاہ کے آلات جو اس نے نصب کرائے تھے ، ستارہ شناسی اور فلک پیمائی میں عرصہ دراز تک مدد دیتے رہے ۔ اور رصدگاہ کا میوزیم تو آج بھی علمائے فلک کے لئے دلچسپی کا مرکز ہے ۔

معلوم ہوا کہ روسی ماہر آثاریات روتکن کی قبر اسی میوزیم میں ہے ۔ اس نے سطح زمین پر نظر آنے والے بعض آثار دیکھکر آلغ بیگ کی رصدگاہ کا پتہ چلایا اور زمین کھود کر اور ملبہ صاف کرکے اسے برآمد کرلیا ۔ اب حکومت روس نے اس رصدگاہ کو بحال کرکے برآمد ہونی والی دوسری اشیاء پر مشتمل میوزیم قائم کردیا ہے ۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ اس رصدگاہ اور میوزیم کا ایک عمدہ البم حاصل ہوجائے جسکی تصاویر اپنی کتاب میں شامل کرسکوں ۔

مدرسۂ آلغ بیگ

جس علاقے میں یہ مدرسہ واقع ہے ، اس کا نام ریگستان

ہے۔ اس مدرسے پر جب ہم آئے تو بارش تھم چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اس عظیم و سنگین عمارت کے نقش و نگار ذرا دھل گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زار روس کے دور میں اس عمارت اور تمام دوسری ایسی عمارتوں سے دانستہ بے توجہی برتی گئی تھی اور اب سوویت حکومت نے ان تاریخی آثار قدیمہ کے تحفظ کا سامان کیا ہے۔ گزشتہ بیس سال سے ان عمارات کو ان کی پرانی حالت پر لانے کا کام ہورہا ہے۔ آدھے سے زیادہ کام ہوچکا ہے۔ ہر عمارت پر تعمیر کا کام جاری ہے۔ اگر ان عمارات کو بحال کردیا گیا تو یہ زبردست اہمیت کے تاریخی آثار شمار ہونگے۔ اس باب میں سوویت حکومت کی دلچسپی کے مختلف وجوہ ہوسکتے ہیں اور ہر آدمی اپنے نقطہ فکر سے توجیہہ کرسکتا ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ سوویت حکومت ان تاریخی آثار کو، جن کا قطعی طور پر مسلمانوں سے تعلق ہے، مٹانے کے حق میں نہیں ہے۔ میں اس کو تاریخ سے دلچسپی کہہ سکتا ہوں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چوں کہ حکومت روس کو مسلمانوں سے کہ جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، روابط قائم کرنے ہیں، اس لئے روس میں ایسے آثار کا تحفظ اس کی سیاسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ دلیل یہ دی جاسکتی ہے کہ ایک وقت یہ تھا کہ برطانوی سامراج نے ایران میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور ایران سے ان مسلم ریاستوں میں پروپیگنڈے کا لٹریچر آیا کرتا تھا کہ جو روسی انقلاب اکتوبر کی نفی کے مترادف ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت روس نے ان مسلم ریاستوں کا رسم الخط بدل دینے کا فیصلہ کیا تاکہ فارسی زبان کو کہ جو ایران کی سرکاری زبان

تھی، لکھی اور پڑھی نہ جاسکے۔ لیکن یہ دور اب ختم ہوچکا ہے اور روس کو ساری دنیا کے مسلمانوں سے روابط قائم کرنے ہیں۔ لہذا اب تاجیکی زبان کا تحفظ اور رسم الخط فارسی کا احیاء ہوا چاہتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ روس میں یہ مسلم ریاستیں ہی ہیں کہ جو تاریخی آثار کی حامل ہیں اور دنیا بھر سے سیلانیوں کو لانے کے لئے ایسے آثار کا وجود ٹورزم کے لئے لازمی ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ رائے اپنے انداز پر ہوسکتی ہے مگر میری ذاتی رائے یہی ہے کہ حکومت روس بنیادی طور پر تاریخی تحفظات کی حامی ہے اور یہ کام اسی بنا پر ہورہا ہے۔ آخر الغ بیگ کی رصدگاہ زیر خاک تھی۔ سوویت حکومت کے دور میں اس کی کھدائی کرکے نکالا گیا اور اس کو بحال کردیا گیا۔ اس کی زبردست تاریخی اہمیت ہے۔ رصدگاہ کا خیال یہاں سے آگے بڑھا ہے۔ عمر خیام بھی تو یہاں ہی آکر درس لے گیا تھا اور پھر اس نے محیرالعقول کام انجام دئے تھے۔

مدرسہ الغ بیگ کی وسعت و اہمیت بہت ہے۔ یہاں لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروگرام کا بھی اہتمام ہے۔ اگر بارش نہ ہوتی تو یہ پروگرام ہم شاید آج دیکھتے اور سنتے۔ لیکن بارش نے اسے ختم کردیا۔

فاختائیں

سمرقند میں فاختائیں بکثرت ہیں۔ ان کا سائز اور رنگ وہی ہے کہ جو ہمارے ہاں دہلی میں ہوا کرتا تھا۔ ہمارے پاکستان میں تو فاختائیں شاید نہیں ہوتیں، کم سے کم سندھ میں تو نہیں ہوتیں۔ سمرقند میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آج

صبح میں بیدار ہوا تو سب سے پہلی آواز جو کان میں آئی ، وہ فاختہ کی تھی ۔ گو گزشتہ تیس سال سے میں نے یہ آواز نہیں سنی ہے ، تاہم دہلی میں تو یہ آواز سنتا ہی تھا اور کان اس سے مانوس ہیں، اس لئے پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی ۔ ان دنوں یہ تنکے جمع کررہی ہیں ۔ اپنی آبادی میں اضافہ کرنے کے لئے انہیں گور بنانے کی ضرورت ہے ۔ اگرچہ کبوتر سے ان کا نسلی رشتہ ہے لیکن کبوتر کی طرح ان کو پالنے کا دستور نہیں ہے ۔ کبوتر اڑانا ایک دلچسپ مشغلہ ہے لیکن فاختہ اڑانا محاورے میں اور ہی معنی و مفہوم دیتا ہے ۔

آثار قدیمہ کا پروگرام

صبح دس بجے سے دو بجے تک کا پروگرام آثار قدیمہ دیکھنے کا تھا ۔ سب سے پہلے ہم سب مسجد خواجہ احرار گئے ۔ اس سے ملحق مدرسۂ نادر دیوان بیگ بھی ہے ۔ بہت بڑی جگہ ہے ۔ اندر مسجد میں ایک بزرگ اوراد و وظائف میں مشغول تھے ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رسولی صاحب معلوم کرنے گئے ۔ خیال تھا کہ وہ تلاوت کلام پاک کر رہے ہونگے ۔ مگر ایسا نہ تھا ۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس مسجد میں قران مجید کا کوئی نسخہ ہے ؟ انھوں نے نہیں میں جواب دیا ۔ پھر پوچھا گیا : کیا آپ کے گھر پر ہے ؟ جواب ہاں میں تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے عقیدت مندوں کو پڑھنے کے لئے قران مجید میسر نہیں ہیں ۔ یہ لوگ بڑے خوش ہوتے ہیں کہ جب کوئی ان کو خاموشی کے ساتھ ہدیۂ قران کرتا ہے ۔ مگر ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ اب خود حکومت روس قاہرہ میں قران پاک

چھپواتی اور وہاں سے منگوا کر تقسیم کرتی ہے ۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ انعام اللہ خاں صاحب کو یہ اطلاع کہاں سے ملی ہے یا ان کا ذریعۂ معلومات اس ضمن میں کیا ہے ۔ بہر نوع سمرقند کی اس مسجد میں قران پاک کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا ۔

جمعہ کی وجہ سے اس مسجد میں نماز جمعہ کی ادائی کے انتظامات ہو رہے تھے ۔ صفیں جو بچھ رہی تھیں، وہ عام کپڑے کی تھیں کہ جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور تار تار تھا ۔ اندر کے حصے میں قالین بھی تھے ۔ اندازہ ہوا کہ یہ ایک ہزار سے کم نمازیوں کا انتظام نہیں تھا ۔ میں نے دو رکعت نفل تو اس مسجد خواجہ احرار میں ادا کرلئے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام بھی نہیں تھا ۔ یہ واضح تھا کہ اس مسجد سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں تھا ۔ نجی طور پر ان مساجد کا انتظام جو لوگ کرتے ہیں ، ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کرسکیں ۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سرکاری طور پر اسکی اجازت نہ ملی ہو ۔

مسجدوں اور مقبروں کے ضمن میں بہت سی قدیم عمارتیں قابل ذکر اور لائق دید ہیں ۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر بوسیدہ ہو کر کھنڈر کی صورت اختیار کرچکی ہیں ۔ پھر بھی ان کی آرائش و زیبائش اور طرز تعمیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں وہ بڑی ہی عالی شان اور دیدہ زیب ہونگی ۔ چنانچہ ”کھنڈرات بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی“ والا مصرع ان میں سے اکثر پر بالکل چسپاں ہوسکتا تھا ۔ ہر عمارت کی دیواروں پر ، سقف و بام پر اور کہیں کہیں فرش پر روغنی مٹی کے ٹائل باقی رہ گئے ہیں ۔ اور بعض جگہ

ٹائل کے بجائے اسی انداز میں نیلے اور سنہرے رنگ میں نقاشی کی گئی ہے اور چونے پر منبت کاری جیسا انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔

ان میں سے شاہ زندہ کا مقبرہ خاصی اچھی حالت میں ہے، حالانکہ وہ آج سے نو سو سال قبل تعمیر ہوا تھا۔ بی بی خانم کی مسجد اور گر امیر کا مقبرہ بھی قدیم عمارات کے ضمن میں شمار ہوتے ہیں۔ بعض دیواریں بالکل منہدم ہوچکی ہیں۔ تاہم مقامی اور وفاقی حکومتیں ان کو نئی زندگی دینے کے منصوبے بنا چکی ہیں اور تیزی سے ان پر کام ہورہا ہے۔ مزار تیمور لنگ بھی اسی ضمن میں قابل ذکر ہے۔ سمرقند بلکہ تاجکستان کے باشندے اسے مقبرہ' تیمور نہیں، صرف "امیر تیمور" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ فرمانروا مر کر بھی ایک شاندار عمارت کی شکل میں زندہ ہے۔ وہ اپنے امیر کا بڑا احترام کرتے ہیں اور لفظ "لنگ" اس کے نام کے ساتھ کبھی استعمال نہیں کرتے۔

تیمور ۱۳۳۶ء میں ماوراالنہر کے شہر کیش میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام ترغائی اور دادا کا نام الغائی تھا۔ مورخین اس کا سلسلہ' نسب قراچار خاں سے ملاتے ہیں جو چغتائی کا وزیر تھا۔ تیمور کو روز اول سے شکار کا شوق تھا اور جوانی میں ایک جنگ جو سپاہی ہونے کی وجہ سے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ طبیعت کا یہ رجحان مرتے دم تک قائم رہا۔ اس کے محاربات کا ذکر بڑا طویل ہے۔ مختصراً یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ چنگیز خان، ہلاکو اور تیمور میں سے کس نے سب سے زیادہ انسانی جانیں ضائع کیں۔ ان میں سے صرف تیمور مسلمان تھا

لیکن اس کی خوں ریزیوں کی داستان مسلمانوں کے لئے کلنک کا ٹیکہ تھا۔ اس نے ایک ہی حملے میں کئی کئی ہزار انسان تہ تیغ کردئے۔ اور ایک بار تو اس کی ستم رانی انتہا کو پہنچ گئی کہ جب اس نے تیس ہزار انسانوں کو ہلاک کرکے ان کے سر کٹوائے اور انہیں کسی طرح جوڑ کر ایک مینار تعمیر کیا جو قدرتی طور پر زیادہ عرصے برقرار تو نہ رہ سکا لیکن انسانیت کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ لگا گیا۔

اکثر مورخین تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چنگیز کی ہلاکت پسندی اس کے لئے باعث مسرت ہوتی تھی اور وہ لاشوں کے ڈھیر پر جشن منایا کرتا تھا۔ تیمور اس کا ہم مشرب نہیں تھا۔ لیکن انسانی کھوپڑیوں کا تعمیر کرنا اس کی اذیت پسند طبیعت کا مظہر نہیں تو کیا ہے۔ صرف ایک بات اس کی بریت میں کہی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے اکثر حوارین دغا باز تھے، وہ چھپے رستم ثابت ہوتے تھے اور وہ جھلا کر ان سے بدلہ لینے کا فیصلہ کرتا اور جب اپنی اس مہم پر قدم بڑھاتا تو ظالم و مظلوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے کردار کی کوئی نیکی نکتہ نواز رب العزت کو پسند آگئی ہو جو اس کا نام آج تک احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور مغل خاندان کے اکثر افراد اپنے نام کے ساتھ "تیموری" کا لاحقہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ واللہ عالم بالصواب۔ میں نے بہر حال مزار تیمور پر فاتحہ پڑھیں اور اس کی مغفرت کے لئے دعائیں کیں۔

امام بخاری کے مزار مبارک پر

تمام مساجد اور مقابر کی زیارت کے بعد اب ہماری منزل

حضرت امام بخاری کے مزار مبارک پر حاضری دینا اور فاتحہ پڑھنا تھا - اسلام کے ان جلیل القدر محدث کے بارے میں اپنے خیالات پہلے ہی ظاہر کرچکا ہوں - ان کے روضے پر فاتحہ پڑھ کر دل و دماغ کو جو سکون حاصل ہوا ، وہ دائرہٴ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے - وہاں اور بھی بہت سے عقیدت مند زانوئے ادب طے کئے اوراد و وظائف میں مصروف تھے - اگر نماز جمعہ کا وقت زیادہ قریب نہ ہوتا تو شاید میں بھی زیادہ وقت گزار کر مزید تسکین حاصل کرتا - اس وقت جناب فیض احمد فیض صاحب اور جناب علی سردار جعفری صاحب شریک سعادت نہیں تھے - ان دونوں کی طبیعت واقعی خراب تھی - خرابیٴ مزاج نے ان کو آرام کرنے پر مجبور کردیا تھا اور پھر ان کو آج ہی شام ماسکو جانا تھا - یہ سفر بڑا کٹھن تھا - دونوں بیگمات یعنی بیگم سلطانہ جعفری اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ البتہ ساتھ تھیں مگر ذرا کنارہ کش تھیں - ہر انسان کا نقطہٴ نظر مختلف ہوتا ہے - ان کے علاوہ غیر ملکی مندوبین اور ہمارے ساتھ متعین کئے ہوئے مترجمین بھی ساتھ تھے - غیر ملکیوں میں چیکوسلوا کیہ ، پولینڈ ، افغانستان اور برلن کے نمائندے نمایاں تھے - مس مارگریٹا پاؤلانا ، مس ثانیا اور ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف بھی موجود تھے جن کا ذکر بارہا آچکا ہے -

سمرقند شہر سے حضرت امام بخاری کے مزار تک بذریعہ بس کوئی پون گھنٹے کا راستہ ہے - جب ہم وہاں پہنچے تو پون بجا تھا - اسی سے ملحق مسجد تھی - وہاں سب سے پہلے امام مسجد و متولی مولانا عثمان جان صاحب محترم سے ملاقات ہوئی اور

تعارف کرایا گیا - غالباً ان کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے ہوچکی تھی - انہوں نے ہمارا پرجوش استقبال کیا اور وہی ہمیں مزار اقدس پر لے گئے - میں تو صبح سے اس وقت تک مزارات پر فاتحہ ہی پڑھتا رہا تھا - جو قبر دیکھتا ، فاتحہ پڑھنا شروع کردیتا تھا - اس لئے کہ ان میں سے بہت سے مزاروں پر اب فاتحہ کون پڑھتا ہوگا - تیمور لنگ اپنے پیر کے قدموں میں آسودہ تھے - اگر ان مزارات پر مسلمان ہی فاتحہ خوانی نہیں کرینگے تو اور کون کریگا - میں جب بھی فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھاتا ، لوگ مجھے تعجب سے دیکھتے تھے اور میں حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ آخر میرے سوا دوسروں کو اپنا مستقبل کیوں دکھائی نہیں دیتا - ہر انسان فانی ہے اور ہر ایک کو کسی نہ کسی قبر میں دفن ہونا ہے -

کوئی تین سال ہوئے حضرت امام بخاری کا گیارہ سو سالہ جشن ولادت منایا گیا تھا - ہندستان اور پاکستان سے علماء شریک ہوئے تھے - دوسرے اسلامی ملکوں کے وفود بھی آئے تھے - پاکستان سے آنے والے علماء میں قاری زاہر قاسمی صاحب تک شامل تھے - اس قسم کی مجالس و محافل اور اجتماعات کا روس میں اہتمام ایک فال نیک سمجھا جاتا ہے ، خواہ اس کی غرض و غایت محل نظر ہی کیوں نہ ہو - بہ ایں ہمہ اس اہتمام کو سراہنے میں ہر شخص کو فراخ دل ہونا چاہیئے اور وسیع القلب -

میں پورے احترام سے اور پورے اکرام سے اس مقام پر کھڑا ہوگیا کہ جہاں دنیا کے سب سے بڑے محدث کو زیر زمیں

اتارا گیا تھا اور پھر ان کی روح مبارک کو جنت الفردوس میں مقام اعلا عطا ہوا تھا۔ میں نے تلاوت قرآن پاک کی، فاتحہ خوانی کی، دست دعا دراز کیا اور ان کی خدمت میں اپنے قرآن کا وہ ہدیہ پیش کردیا کہ جس کی میں نے تلاوت کی تھی۔ میں اس روح پرفتوح کی خدمت اقدس میں یہی نذرانہ پیش کرسکتا تھا۔

میں محویت کے عالم میں غرق عقیدت تھا کہ ایک بڑی ناگوار آواز، جو ایک خاتون کی تھی، کانوں میں گونجی:

"چلو، بھئی چلو، ان مسجدوں اور مقبروں نے تو ہمیں بور کردیا ہے"۔

یہ ہندستان سے آئی ہوئی ایک خاتون کی آواز تھی۔ اس آواز نے مجھے جیسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

نماز جمعہ کی جماعت اب تیار تھی۔ امام عثمان جان صاحب کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ اندر چلوں۔ میں چاہتا تھا کہ یہ امتیازی سلوک نہ ہو اور مجھے جہاں بھی جگہ ملے، میں بارگاہ ایزدی میں سر بسجود ہوجاؤں۔ مگر حضرت امام صاحب کا اصرار بڑھ گیا اور میں بسم اللہ کرکے ان کے ساتھ مسجد کے اندر داخل ہوگیا۔

حلقۂ مشائخ میں

اندر منبر کے قریب کوئی دس بارہ بزرگوں کا حلقہ تھا۔ اوراد و وظائف بہایت خشوع و خضوع سے جاری تھے۔ میں اس حلقے میں بٹھا دیا گیا۔ بڑے نورانی چہرے تھے۔ صاف ستھرے لوگ، روئی کے کوٹ۔ بڑی پیاری داڑھیاں، آنکھوں میں نور، دل میں سرور۔ میں نے اس حلقۂ مشائخ میں خود کو زیادہ

اجنبی محسوس نہیں کیا۔

امام صاحب نے منبر پر کھڑے ہوکر میرا تعارف کرایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں جو ایک مملکت اسلام ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ان کا اصرار ہوا کہ میں حاضرین سے خطاب کروں۔ میں نے عذر کیا مگر یہ عذر نہ سنا گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی اور منبر پر جا کھڑا ہوا اور خطبے کے انداز میں خطاب شروع کیا۔ میری زبان فارسی تھی کیونکہ امام عثمان جان صاحب فارسی بھی جانتے تھے۔ وہ دوسروں کے لئے ازبکی زبان میں ترجمہ کرتے رہے۔ ایک بات میں نے محسوس کی کہ جب میں نے "السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ" کہا تو جواب کسی نے نہ دیا۔ مگر میری یہ حیرت اس وقت دور ہوگئی کہ جب خود امام صاحب نے خطبۂ مسنونہ شروع کرنے سے قبل "السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ" کہا اور کسی نے جواب میں "وعلیکم السلام" نہ کہا۔

میں نے کوئی بارہ تیرہ منٹ خطاب کیا۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں نے سامعین پر کیا اثرات چھوڑے۔ البتہ حلقۂ مشائخ نے مجھے اپنے درمیان اب زیادہ محبت اور احترام سے بٹھایا۔ اس سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ میری تقریر کا اثر اچھا ہوا ہے۔

ایک بات دوران خطابت میں نے بڑی شدت و حیرت سے دیکھی کہ نمازیوں میں ایک بھی جوان عمر نہیں۔ سب کے سب معمر لوگ تھے۔ ان میں ایک بھی نمازی بے داڑھی کا نہیں تھا۔ صرف میں اور امام عثمان جان بے داڑھی تھے۔ سوال یہ تھا کہ نوجوان ازبکی مسلمان کہاں تھے؟

نماز جنازہ میں شرکت

نماز ختم ہوئی۔ سنتیں ادا کیں۔ امام صاحب نے آخر میں دعا کی۔ ازبکی زبان کسقدر فارسی آمیز تھی۔ غور کیا جائے تو کچھ نہ کچھ سمجھ میں آہی جاتا ہے۔ اس فریضے سے فارغ ہوکر باہر آیا۔ نمازیوں کی اکثریت مجھ سے مصافحہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے حتی الامکان جو بھی آتا رہا، اس سے ھاتھ ملانے کی مسرت حاصل کی اور انہیں بھی مطمئن کردیا۔ امام صاحب نے بتایا کہ جنازہ حاضر ہے۔

باھر آکر میں نے دیکھا کہ چٹائی میں لپٹا ھوا، لکڑیوں پر ٹکا ھوا، پھولوں سے لدا ھوا ایک جنازہ رکھا ہے۔ میں اگلی صف میں تھا۔ میں نے جنازے کے اوپر پھولوں کی ایک ریتھ دیکھی اور اس مرحوم کی تصویر بھی رکھی ہوئی دیکھی۔ امام صاحب نے اولاً ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ میں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا کہ وہ مرحوم یا مرحومہ کا تعارف تھا۔ اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی گئی تھی۔ اس جنازے کے ساتھ سینکڑوں آدمی تھے۔ ان میں درجنوں سے زیادہ جوان بھی تھے کہ جو نماز جمعہ میں شریک نہ تھے۔ میں ان نوجوانوں کو حیرت سے دیکھتا ھا۔ ان کے دل میں ایمان اور خوف اللہی بس جنازے کی حد تک تھا۔

امام صاحب نے نماز جنازہ پڑھانے سے قبل ریتھ اور تصویر ھٹوا دی۔ اور پھر نماز جنازہ پڑھائی۔ اب میں فارغ ھوگیا۔ امام صاحب کا شدید اصرار تھا کہ ان کے ساتھ چائے پانی ھوجائے۔ وہ سب لوگوں کو مدعو کر رہے تھے۔ مگر ھم نے اتفاق رائے سے

ان سے معذرت چاہ لی، اس لئے کہ تین بجے ھمارا دوسرا پروگرام تھا جس کو ھم خراب نہیں کرسکتے تھے۔

شرکاء میں سے نماز صرف میں نے پڑھی۔ خواتین بور ھوکر بس میں سوار ھوگئی تھیں۔ باقی لوگ شاپنگ کے موڈ میں تھے۔ استاد رسولی صاحب (افغانستان) نے ایک رگ بالآخر خرید ھی لیا۔ ۱۴۰ روبل کم رقم نہیں تھی۔ پاکستانی اعتبار سے کوئی دو ھزار رپے ھوئے۔ مجھے خوشی اس لئے زیادہ ھوئی کہ اس غریب علاقے کے دکاندار کو مدد مل گئی۔ کاش میں دوسرا رگ خرید سکتا جو تقریباً اسی قیمت کا تھا۔ لیکن میرے پاس زر مبادلہ کی قلت تھی، اسلئے ممکن نہیں تھا۔ دکان کا مالک بڑی حسرت سے اپنے فروخت نہ ھونے والے رگ کو دیکھ رھا تھا۔ میرا دل پگھل گیا۔

نماز جمعہ از اول تا آخر، نماز جنازہ اور اس کے مراحل، ان سب کو مسز تانیا نے بغور دیکھا جو بطور مترجم ھمارے ساتھ تھیں۔ میں اپنے ساتھ ڈائری لایا تھا۔ وھی ھمدرد کی ڈائری جس میں ”اربعین جامی“، شامل ھیں — عربی، انگریزی، اردو اور فارسی تراجم کے ساتھ — ڈائری کی ایک کاپی میں نے جناب محترم علی سردار جعفری کی خدمت میں پیش کی تھی اور تانیا نے ان سے لے لی تھی۔ میں نے ایک اور پیش کردی تھی۔ یہ مسز تانیا مسجد میں از اول تا آخر موجود رھی تھیں۔ انہوں نے کہا:

”میں نے زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھا ہے۔ میں از اول تا آخر یہاں رھی ھوں، مگر یہ مشاھدہ نہ ھوسکا تھا۔ آج

آپ کے ساتھ آنے کی وجہ سے ہوگیا ،،۔

مجھے تانیا سے محبت ہوگئی ، وہ محبت کہ جو مجھے اپنی بیٹی سعدیہ سے ہے ۔ میں نے نماز کے بارے میں تانیا کو کچھ بتایا ۔ میرے خطبہ' جمعہ کے بارے میں ان کو اشتیاق تھا کہ میں نے کیا باتیں کیں ۔ میں نے ان کو مطمئن کردیا ۔

ہوٹل سمرقند واپس آئے تو ہمیں صرف آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوگئی تھی ۔ بارے میں نے اب بھی کچھ نہ کھانے کا فیصلہ کیا ۔ سوچا کہ اب رات ہی کو کھاؤنگا ۔ چوبیس گھنٹے معدے کو اور جگر کو آرام دینا چاہئے ۔

جامعۂ سمرقند

چار بجے شام کو ہم جامعہ' سمرقند گئے ۔ مجھے صبح ہی کو بتا دیا گیا تھا کہ مجھے آج طلبا سے خطاب کرنا ہے ۔ ذہنی طور پر میں اس کے لئے تیار تھا ۔ جامعہ' سمرقند کے دروازے پر اساتذہ کے ساتھ قائم مقام وائس چانسلر جناب شکوروف صاحب نے ہمارا پرجوش استقبال کیا ۔ وہ اپنے دفتر لے گئے اور پھر جلد ہی سب کو جامعہ کے میٹنگ ہال میں لے جایا گیا ۔ وہاں کوئی ایک ہزار طلبہ نے زبردست تالیوں سے ہمارا استقبال کیا ۔ جناب شکوروف صاحب نے مختصر الفاظ میں جامعہ کا تعارف کرایا :

(۱) اس جامعہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ استاد صدرالدین عینی نے اسمیں تعلیم دی ہے ۔

(۲) اس وقت اس جامعہ میں دس ہزار طالب علم ہیں ۔

(۳) اساتذہ کی تعداد تقریباً چار سو ہے ۔

(۴) بارہ فیکلٹیاں ہیں ۔

اس کے بعد جناب شیخ الجامعہ نے طلبہ سے ہمارا تعارف کرایا ۔ پہلے فیض احمد فیض صاحب کا اور پھر میرا اور ہمارے بعد دوسروں کا ۔ پھر انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ طلبہ سے کچھ باتیں کریں ۔ جناب فیض صاحب نے مختصر خطاب کرکے اپنی ایک نظم سنائی جس میں ٹیپ کا مصرع ہے ” غم نہ کر ، غم نہ کر ،، ۔ مس ریٹا نے اس کا ترجمہ روسی زبان میں کردیا جو پہلے سے تیار تھا ۔ میں نے بھی خطاب کیا ۔ میرے خطاب کے چند نکات یہ ہیں :

(۱) زبان یار من فارسی و من فارسی خوب نمی دانم ۔

(۲) اس لئے میری آدھی تقریر فارسی میں ہوگی اور آدھی پاکستان کی قومی زبان اردو میں ۔

(۳) تا مرد سخن نگفتہ باشد ، عیب و ہنرش نہفتہ باشد سعدی شیرازی نے یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی ۔ اس کا بدیہی طور پر منشا یہ ہے کہ آدمی بلا ضرورت بات نہ کرے ۔

(۴) میں خطاب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ کو دیکھ کر میں خود کو خاموش نہ رکھ سکا ۔ آپ سے چند باتیں کررہا ہوں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا تعلق اپنے وطن پاکستان میں طلبہ سے زیادہ ہے ۔

(۵) میں طلبہ میں صحت کا پرچار کرتا ہوں ۔ اپنے

(۱۳) پشا سن دوست لک !
پشا سن دوست لک !

میرا اندازہ یہ ہے کہ میں نے اپنی نیم فارسی ، نیم اردو تقریر سے ان طلبہ' سمرقند پر اچھے اثرات چھوڑے تھے - کیونکہ بہت سے طلبہ میرے آٹوگراف لینے آئے اور کسی سے نہیں - حتیٰ کہ آخر میں جناب وائس چانسلر شکوروف صاحب نے بھی "سمرقند"، نامی ایک کتاب پر میرے آٹوگراف لئے -

طلبہ نے مجھے ایک گل دستہ بڑی محبت سے پیش کیا - ایک پھول کی شاخ پر لکھا تھا :

OT Y3ßUTαgɔK ɸ U'αpα tE
III kypc y3bEKCKAπ TPYnnA
21/IV — 78 200

اس کا مطلب یہ ہے :

فیکلٹی ازبک اور تاجیک ڈپارٹمنٹ ، سمرقند یونیورسٹی کی طرف سے تین سال کی جماعت کے طلبہ کی طرف سے

۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء

روسی خبر رساں ایجنسی (شاید تاس) کا نمائندہ آیا تھا - انٹرویو برائے پاکستان لینے کا خواہاں تھا - میں نے ساڑھے چھ بجے کا وقت منظور کرلیا - اور میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے آگیا مگر سات بجے تک وہ نہ آیا - میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کرسکتا تھا -

میں اور ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف ٹھنڈی سڑک پر ٹہلنے

نکل گئے - یہ سڑک میکسم گورکی سڑک کے متوازی چلتی ہے - جامعہ' سمرقند گورکی روڈ پر ہے - ٹھنڈی سڑک پر صرف آدمی چلتے ھیں - دونوں طرف ذرا ذرا سے فاصلوں پر درجنوں بنچیں پڑی ھیں - یہ سڑک انقلاب اکتوبر سے قبل ایک یہودی ابراھام نے بنوائی تھی - یہ سڑک استراحت گاہ ہے اور طلبہ جامعہ' سمرقند اس سے استفادہ کرتے ھیں -

شہید ملت روڈ

ھاں ، مجھے یاد آگیا - کتنا میں نے اصرار کیا تھا کہ کراچی میں شہید ملت روڈ کو اتنا چوڑا نہ بناؤ - موجودہ دو سڑکوں کو ذرا چوڑا کر کے کام نکالو اور درمیان میں دو رویہ درخت لگادو ، بنچیں ڈال دو اور اس جگہ کو کراچی کا پھیپھڑا بنادو - مگر میری کسی نے نہ سنی -

آج یہ ابراھام روڈ دیکھ کر خیال آیا کہ اگر کراچی میں میری بات مان کر ایسی ھی ایک استراحت گاہ بنادی جاتی تو شہید ملت کی روح کو ہمیشہ تسکیں ملتی رھتی -

ٹھنڈی سڑک پر خاصی دیر گھومنے اور کچھ دیر بنچوں پر بیٹھنے کے بعد ھوٹل پہنچا - حسب معمول مختصر سا کھانا کھایا جس میں گوشت سے پرھیز کیا - پھر اپنے کمرے میں آکر مطالعہ میں مصروف ھوگیا - کراچی کے لئے چند ضروری خط اور عملے کے لئے ھدایات بھی لکھ دیں - پھر آرام سے سو گیا - اچھی نیند آگئی -

دوسرے روز صبح پانچ بجے بیدار ھوا - آج نماز فجر ادا کرنے کی بڑی زبردست خواھش پیدا ھوئی - میں ھمیشہ بالکل تیار

ہوکر ، غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر ہی نماز ادا کرتا ہوں ۔ مگر آج فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً وضو کرکے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوجانا چاہئے ، اور وقت ملے تو وظیفہ بھی پڑھ لیا جائے ۔ لہذا میں بستر سے جلدی اٹھا ۔ اب دیکھا تو غسل خانے میں پانی نہیں ہے ۔ سوچا ، کیا یہاں بھی کے ڈی اے کا سایہ پڑ گیا ہے ، اور کیا یہ شہر بھی کراچی کی کوئی بستی بن گیا ہے ۔ بڑا دکھ ہوا، سمجھ میں نہ آیا کہ اب کہاں جاؤں ۔ زبان دانی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا ۔ فارسی سب سمجھ لیتے تھے اور یوں بھی میں نے پانچ چھ دن میں فراٹے سے فارسی بولنے کی مشق کرلی تھی ۔ باہر نکلا تو آدم نہ آدم زاد ، حتیٰ کہ وہ بڑی بی کہ جو ہماری ساتویں منزل پر اپنے تن و توش کے ساتھ نگرانی کے فرائض انجام دیتی تھیں ، محو استراحت تھیں بالکل کراچی کے چوکیداروں کی طرح جو شروع رات میں یا اذان فجر ہونے کے بعد ''جاگتے رہو'' کی آواز لگاتے ہیں اور باقی وقت دوسروں کو سلاتے اور خود بھی سوتے رہتے ہیں ۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ان کے آرام میں خلل ڈال کر ان سے پانی کے بارے میں استفسار کروں ۔ لیکن اس کا اہتمام کیسے کروں ؟

بارے چند منٹوں کے بعد یہ مشکل حل ہوگئی ۔ شاید موٹر چالو کردی گئی تھی ۔ اوپر کی ٹنکی سے نلوں میں پانی آگیا ۔ میں نے اس اثنا میں اپنا رخت سفر باندھ لیا ۔ ہوٹل کا کمرہ اگر بارہ بجے خالی کردیا جائے تو میزبانوں کو صرف چار گھنٹے کے لئے پچاس فیصد کرایہ دینا ہوگا ، ورنہ پورا دن محسوب ہوگا ۔ لہذا میں نے بارہ بجے تک کمرہ خالی کردینے کا فیصلہ کرلیا ۔

قبلہ اور قبلہ نما

قبلہ کی صحیح سمت کا اندازہ ذرا مشکل تھا ۔ پھر بھی وضو کرکے نماز فجر کے لئے بارگاہ ایزدی میں کھڑا ہوگیا ۔ ایسی صورت میں یہ حکم ہے اور ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ جدھر منہ کرلیا ، اللہ بس ادھر ہی ہے ۔ عبادت کی اصل روح تو استغراق عبودیت ہے ۔ اس سفر میں قبلہ نما اتفاق سے میرے ساتھ نہیں تھا جسے میں سامان سفر میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز سمجھتا رہا ہوں ۔ اس بار بے خیالی میں پن اور یو کلپ کے پیکٹ تک رہ گئے ۔ بڑے ہنگامی حالات کا سفر تھا ۔ لہذا کراچی سے روانگی کے دن صبح سے رات تک ذرا مہلت نہ ملی کہ سامان کو نک سے سک تک درست کرلوں جو ہمیشہ میری عادت رہی ہے ۔ اس رات ڈاکٹر محمد قمر صاحب اور ڈاکٹر جاوید صاحب (ماہرین امراض چشم) میرے گھر مدعو تھے ۔ ڈاکٹر جعفری صاحب بھی تھے ۔ پونے گیارہ بجے یہ حضرات گئے اور گیارہ بجے میں ہوائی میدان کے لئے روانہ ہوگیا تھا ۔

میں ایک گھنٹے تک بڑے اطمینان سے جانماز پر بیٹھا حمد و تسبیح کرتا رہا ۔ عمیق محویت کے باعث نماز کا ایسا لطف آیا کہ بیان سے باہر ہے ۔ فراغت پاکر جب اٹھا تو دل ایسا ھلکا ہوگیا تھا جیسے گلاب کا نو شگفتہ پھول ۔ دماغ تھا تازہ ، صاف اور آلائشوں سے پاک ۔ غسل وغیرہ کرکے میں اپنی میز پر جابیٹھا اور چند نوٹ لکھ لئے تاکہ انھیں اپنی سکریٹری کے نام کراچی بھیج سکوں ۔ ان میں زیادہ تر کام سے متعلق ہدایات تھیں ۔ ان کے علاوہ میں نے اس سفر میں جن لوگوں سے شخصی روابط قائم کئے تھے

یا جو اس جشن صد سالہ صدرالدین عینی کے منتظمین اور میرے میزبان تھے، ان سب کو تشکر و امتنان کے خطوط لکھ دئیے، جن کی تعداد ستائیس تھی۔ بعض انگریزی میں تھے اور بعض فارسی میں اور دو تین اپنی قومی زبان اردو میں۔ یہ کام سب سے اہم تھا، اور اس کے لئے مناسب وقت یہی تھا۔ صبح ہی صبح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بعد انسانوں کا شکریہ ادا کرنے میں لطف آیا۔ دل کی گہرائیوں سے کلمہ ہائے تشکر و امتنان لکھے گئے۔

خطوط برائے اظہار تشکر

جن اشخاص کو خطوط لکھے گئے، ان میں رئیس جمہوریہ تاجیکستان اور وزیر اعظم جمہوریہ تاجیکستان اور صدر اکیڈمی آف سائنسز جناب اکیڈیمیشین محمد عاصموف صاحب سے لے کر دوشنبہ میں شریک دو وفود تک شامل تھے۔ ان نامہ ہائے تشکر کو میں اس روز نامچے کے ساتھ شریک کردونگا جو مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔

اس سفر کی تصاویر بھی آج سب جمع ہوگئیں اور ایک ایک کاپی مجھے مل گئی۔ میں نے ان کو بغور دیکھا اور محترم جناب ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب کی بہترین مدد سے جن کے نام یاد نہ آسکے تھے، تصاویر کی پشت پر لکھ لئے۔ اس طرح تصاویر کا یہ البم مکمل ہوگیا۔ اسے سامان سفر میں بڑی احتیاط سے شامل کرلیا۔

غرض میں نے یہ تمام کام آج صبح ہی ختم کرلئے۔ ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب نے دس بجے آکر مجھے بتایا کہ آج کا دن آزاد ہے۔ یعنی کوئی کام نہیں ہے، بہت خوب۔ میں نے

پوچھا کہ ایسی صورت میں سمرقند گردی کیسی رہیگی۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ سمرقند کی گلی کوچوں اور بازاروں میں چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ ہمارے وفود کے اب سب اراکین جاچکے تھے۔ گزشتہ شام کو محترم فیض احمد فیض صاحب اور علی سردار جعفری اور ان کی بیگم اور محترمہ عصمت چغتائی اور ان دونوں کی مترجمین مارگریٹا پاؤلونا اور تانیا جاچکی تھیں۔ تانیا سے مجھے دل چسپی یہ ہوگئی تھی کہ اس نے نماز جمعہ کے وقت پوری دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اس فرض کی ادائیگی کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ آج ہی صبح تین بجے چیکوسلوواکیہ کے ڈاکٹر بچسکا اور جرمنی کے ڈاکٹر لوزمز وغیرہ بھی ماسکو چلے گئے۔ اب میں اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رسولی، محترمہ مریم سلگانگ اور ان کی دو معاون خاتون اور ریڈیو ماسکو کے نمائندے باقی رہ گئے تھے۔

کچھ گپ شپ کے بعد ہم سب نے ناشتہ ایک جگہ بیٹھ کر اطمینان سے کیا۔ خوب باتیں کرنے کا موقع ملا کیونکہ آج کا دن آزاد تھا۔ میں نے کل روزہ بھی رکھا تھا۔ رات کا کھانا بڑا اچھا تھا مگر میں نے خوراک سے کم کھایا۔ اسلئے صبح ناشتے کا موڈ تھا۔ میں نے روس میں آج پہلی بار انڈے کھائے۔ تین فرائڈ ایگز۔ مجھے ڈاکٹر برنارڈ والش (میرے معالج قلب، واشنگٹن) سے ڈر لگتا ہے۔ انھوں نے ایک ہفتے میں زیادہ سے زیادہ تین انڈے کھانے کی ہدایت کی تھی مگر میں نے تو نو دن میں یہ تین انڈے کھائے۔ جو مریض اپنے معالج کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں ان کو خاطر خواہ فائدہ پہنچتا ہے۔ میں اپنے مطب کے

تمام مریضوں کو ہدایات دیتا ہوں کہ غذا کے معاملے میں حسب ضرورت احتیاط برتا کریں ۔

”یوم حشر“

ہم کمرے میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے اور بوندا باندی ہورہی تھی ۔ میں اس سوچ میں تھا کہ سمرقند گردی کیسے ہوگی ۔ اس زمین سمرقند پر کہ جس کے ہر قدم پر ایک ولی مدفون ہے ، اگر میں نے تلاوت قران سمرقند گردی کے ساتھ ساتھ نہ کی تو بڑی کمی رہ جائیگی ۔

غنیمت ہے ، کچھ دیر میں بارش رک گئی ۔ ناشتہ پہلے ہی ختم ہوچکا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روس میں دودھ کا جیسے رواج ہی نہیں ہے ۔ دوشنبہ میں دو دن دودھ مل گیا تھا ۔ آج اس سمرقند میں بڑی عمدہ دھی کی لسی ملی ۔ میں نے ۱۱ اپریل سے اب تک سیروں دھی نوش جان کرلی ہوگی ۔ بڑی عمدہ دھی تھی ۔ خیال آیا کہ شاید قدرت کی طرف سے اشارہ و انتظام تھا کہ مجھے دودھ کم و ترک کر کے اب باقی عمر دھی پر توجہ کرنی چاہئے ۔

پروفیسر مرادوف صاحب کہ جو سمرقند میں ہمارے سفر و قیام کے منتظم اعلا تھے خود اسی علاقے (ازبکستان) کے باشندے ہیں اور دخوند ان کا مولد ہے کہ جس پر صدرالدین عینی نے پوری ایک کتاب لکھی تھی ۔ مرادوف صاحب لال رنگ کی ایک نستعلیق پٹی لائے اور میری اچکن پر اسے پن سے لگا دیا اور کہا : ”آج حشر ہے ، حشر“ ۔

لینن کے جنم دن پر

”حشر“ ، تاجیکی اور ازبکی زبانوں کا لفظ ہے ۔ اسے ”ورکرز فیسٹیول“ ، عرف عام میں کہتے ہیں ۔ ”سبوت نک“ ، روسی اصطلاح ہے ۔ آج ۲۲ اپریل کو لینن اعظم کا جنم دن ہے ۔ آج کے دن تمام روس اور روس کی تمام پندرہ ریاستوں میں لینن کا جنم دن اس انداز سے منایا جاتا ہے کہ آج تمام ورکرز اور تمام کارکن بلا معاوضہ کام کرتے ہیں اور اتنا کام کرتے ہیں جو معمول سے زیادہ ہوتا ہے ۔ اس کا جو معاوضہ ملتا ہے ، وہ ایک فنڈ کی صورت میں جمع کیا جاتا ہے اور اس خطیر رقم کو بھلائی کے کاموں میں صحت و ثقافت، تعلیم اور سائنس پر خرچ کردیا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر غلام مصطفی رسولی، کہ وہ خود پندرہ سال ماسکو ریڈیو سے متعلق رہ چکے تھے اور اب ریڈیو ٹیلے وژن کابل سے متعلق ہیں ، بڑی عمدہ روسی زبان جانتے ہیں ۔ انھوں نے ”حشر“ ، کا اس طرح مختصر تعارف کرایا ۔ میں نے اس کو بڑی دل چسپی سے سنا ۔

پروفیسر مرادوف صاحب نے لال پٹی منسلک کردی تھی ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس روز میں بھی روسی ورکر ہوگیا تھا ۔ جب ہم سب ہوٹل سے باہر نکلے تو وہاں عورتیں اور مرد ہوٹل کے ماحول کو درست کرنے میں مصروف تھے ۔ ایک طرف کیاریاں بنائی جارہی تھیں اور ان میں پودے لگائے جارہے تھے ۔ اس کام میں میں بھی شریک ہوگیا ۔ میں نے پھاوڑا سنبھالا اور چکنی مٹی لا لا کر ان لڑکیوں کو دینے لگا کہ جو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے کیاریوں میں گل و لالہ کا اہتمام کر رہی تھیں ۔ میں نے ان

میں تعمیر کا جذبہ بدرجہ اتم پایا۔

جب میں پھاوڑے سے چکنی مٹی اٹھا اٹھا کر کیاریوں میں ڈال رہا تھا اور پیاری بچیاں اپنے نرم و نازک اور خوبصورت ہاتھوں سے مٹی پھیلا رہی تھیں تو ایک صاحب آگے بڑھے اور مجھ سے نستعلیق اردو زبان میں دریافت کیا:

''جناب کا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

غالباً وہ کافی دیر سے وہاں کھڑے تھے اور مجھے مصروف دیکھ رہے تھے لیکن میں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ میرا سفید صاف لباس، اچکن اور شرعی پاجامہ دیکھ کر انہوں نے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ میں برصغیر کا باشندہ ہوں لیکن صحیح مقام کا پتہ نہ چل سکا۔ میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا:

''مجھے معلوم ہے کہ جناب کا تعلق لکھنئو سے ہے۔ اپنے بارے میں آپ کو اس کام سے فارغ ہونے کے بعد بتاؤنگا''۔

میں نے بھی ان کے لباس اور لب و لہجے سے ان کے وطن مالوف کا اندازہ لگایا تھا اور وہ صحیح تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر کچھ حیرانی محسوس کی۔ وہ منتظر رہے تا آن کہ سب کیاریاں تیار ہوگئیں۔ تب میں جناب ایس، ایچ، عرفان کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے ان سے کہا:

''آپ کی تعلیم تو لکھنئو میں ہوئی ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ کہاں رہتے ہیں؟''

عرفان صاحب نے اعتراف کیا کہ ان کا تعلق واقعی لکھنئو

سے ہے مگر اب پاکستانی ہیں۔ تاہم عارضی طور پر لندن میں مقیم ہیں، جرنلسٹ ہیں اور ان دنوں سمرقند و بخارا کی سیاحت پر آئے ہوئے ہیں۔ اسی ہوٹل ''سمرقند'' میں قیام ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔

''جناب میرا نام حکیم محمد سعید ہے، میں کراچی۔۔۔''

جملہ پورا نہ ہوسکا تھا کہ عرفان صاحب چونک کر بولے:

''ہمدرد۔۔۔ ہمدرد۔۔۔ آپ۔۔۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ رسولی قریب کھڑے گفتگو سن رہے تھے۔ وہ لقمہ دیتے ہوئے بولے:

''جی ہاں، حکیم محمد سعید اور ہمدرد ہم معنی ہیں۔ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور یہ کسی طرح الگ نہیں ہوسکتے''۔

عرفان صاحب مجھ سے پوچھنا چاہتے تھے کہ میں نے ان کے بارے میں یہ اندازہ کیسے لگایا کہ وہ لکھنئو کے ہیں۔ میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا کہ میں نبض دیکھ کر بیماری کا پتہ چلاتا ہوں اور صرف چہرا دیکھ کر انسان کے وطن مالوف کا اندازہ کرتا ہوں۔ یہ طے پایا کہ پانچ بجے شام ہم پھر ملینگے۔ انہوں نے مجھے اور میں نے ان کو لندن کا پتہ دیا۔ وہ مسز پٹیل کے ساتھ امام بخاری چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔ اور کمرے کی ایک کھڑکی سے دیکھتا رہا کہ بچیاں بدستور انہماک کے ساتھ کیاریاں بنانے میں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنے قومی واہنما لینن سے کتنی محبت تھی۔ بچیوں کی اس والہانہ عقیدت و محبت کو پسندیدگی کی

نظر سے دیکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ لینن کے اس جنم دن کے موقع پر میں اس عظیم انسان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالوں۔ اتفاق سے ہوٹل کے کمرے میں ایک کتاب موجود تھی جو سیاحوں کی دل بستگی اور معلومات کے لئے جان بوجھ کر رکھی جاتی ہے۔ شروع سے آخر تک اس کا مطالعہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہیں کہیں سرسری نظر ڈالی۔

ولادیمر لینن سمبرسک (موجودہ اولیا نوف) کے مقام پر ۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۷ء تک وہ اسکول کے طالب علم رہے۔ کازان یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لیا لیکن فارغ التحصیل ہونے سے قبل اپنے انقلابی خیالات کے باعث گرفتار کر لئے گئے۔ ۱۸۸۸ء تک کازان میں جلا وطنی کے دن گزارے۔ وہاں سے اگلے ہی سال سمارا (موجودہ کوئی بی شیف) منتقل کردیا گیا اور پھر حکومت نے ان کی کم سنی کے پیش نظر معافی دیدی۔ چنانچہ وہ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں داخل ہوگئے۔ جہاں سے ۱۸۹۱ء میں قانون کی باقاعدہ سند حاصل کرلی اور وکالت شروع کردی۔ دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ انہوں نے مزدور طبقے کی نجات کے لئے جدوجہد کی خاطر ایک انجمن ورکرز لیگ کے نام سے قائم کردی۔ جس کا سربراہ انھی کو بنایا گیا۔ ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے حکومت نے پھر دسمبر ۱۸۹۵ء میں گرفتار کرلیا۔ زار کی سیاسی پولیس نے ان کو تقریباً چودہ ماہ تک حراست اور قید تنہائی میں رکھا۔ ۱۸۹۷ء میں ایک بار پھر جلا وطن کرکے ۱۹۰۰ء تک کے لئے سائبیریا کے

ایک گاؤں میں بھیج دیا جہاں عموماً سیاسی قیدیوں کو نظر بند رکھا جاتا تھا۔ اس طرح بے عمل رہنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ آخر وہ فرار ہوکر میونخ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کیا تاکہ اسے پوشیدہ طور پر روس بھیج کر اپنے پروپیگنڈے کو جاری رکھیں۔ لپزک (جرمنی) کے ایک چھاپہ خانہ نے اخبار ''اسکرا'' (چنگاری) چھاپنے کی ذمہ داری لے لی۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۰ء کو شائع ہوگیا۔ انہیں اپنے کئی ہم وطن ہم نوا مل گئے۔ لہذا وہ اپنا کام ان کے سپرد کرکے اپریل ۱۹۰۲ء میں جرمنی سے لندن چلے گئے۔ بیوی بچوں کی یاد آئی تو ان کو روس سے بلاکر سوئزر لینڈ کے شہر جنیوا کے گرد و نواح میں آباد کردیا جہاں وہ سب ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک رہے۔ وہ اپنے اخبار کے لئے مضامین اور تنقیدی کالم وہیں سے لکھتے رہے۔ پھر لندن جاکر بگ بین کے ہال میں اپنی پارٹی کی پہلی کنگرس منعقد کی اور اس کے اغراض و مقاصد اور آئندہ کے لائحۂ عمل کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ وسیع تر پروپیگنڈے کے لئے ''اسکرا'' ناکافی تھا۔ اس لئے ایک ہفتہ وار ''پرولتاری'' بھی جنیوا سے نکالنا شروع کیا۔ ۱۹۰۸ء میں دونوں اخبارات کی مجلس ادارت پیرس منتقل ہوگئی۔ ان کی والدہ اسٹاک ہام پہنچ گئی تھیں۔ انہیں دیکھنے کے لئے ۱۹۱۰ء میں وہاں چلے گئے۔ لیکن اپنے مشن سے خالی الذہن نہیں ہوئے۔ اسی سال سوشلسٹ پارٹی قائم کی اور اس کی دوسری کنگرس طلب کرلی۔ اس سے اگلے سال دوبارہ پیرس جاکر اپنی پارٹی کا ایک اسکول قائم کرلیا تاکہ نوجوانوں کو باقاعدہ اشتراکی نظریات

کی تعلیم و تربیت دی جاسکے۔ ۱۹۱۳ء میں بالشویک کانفرنس کے پہلے اجلاس میں حصہ لیا جو پراگ میں طلب کیا گیا تھا۔ اس اثناء میں خود روس میں ان کے حامی بڑی تعداد میں سامنے آگئے اور ان کے ایما پر انہوں نے پیٹرز برگ سے "پراودا" نکالنا شروع کیا۔ وہ روس سے باہر رہ کر بھی اس کی اشاعت کے لئے راہنمائی کرتے رہے۔ اسی اثناء میں پہلی جنگ عظیم چھڑگئی۔ ہر ملک کو اس عالمگیر لڑائی سے خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ ان کے انقلاب انگیز خیالات کے پیش نظر اوسٹریا کی پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا۔ وہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے وہاں گئے تھے۔ انہوں نے عدالتی کارروائی کی تو انہیں سوئزر لینڈ جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ کچھ عرصہ برن اور پھر زیورخ میں رہے اور وہاں سے سامراجی جنگ کی ڈٹ کر مخالفت کرتے رہے یہ کہہ کر کہ یہ لڑائی کسانوں کو بے پناہ مصائب میں مبتلا کررہی ہے۔ آخر یہ جلاوطنی کی زندگی ان کے لئے بار خاطر ہوگئی اور وہ اپریل ۱۹۱۷ء میں پیٹرزگراڈ چلے گئے۔ اب تک ان کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ وہ ایک بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر نکلتے اور مائکروفون کے ذریعہ سے عوام کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حکومت زار نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کردیا تو وہ اسی شہر میں جھیل کے کنارے ایک کسان کی جھونپڑی میں جا چھپے اور اپنا حلیہ اس طرح بدل لیا کہ ایکدم کوئی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اس طرح کب تک رہتے۔ آخر فن لینڈ چلے گئے اور ہل سنکی میں رہنے لگے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو وہ انجن میں

کوئلہ جھونکنے والے کا بھیس بدل کر پھر وطن آگئے۔ ۲۵ اکتوبر کی رات کو اپنے حوارین سے مل کر اورورا نامی جہاز سے ایک گولہ داغ کر اکتوبر کے عظیم اشتراکی انقلاب کا اعلان کردیا۔ اپنا ہیڈکوارٹر اسمونی کے انسٹی ٹیوٹ میں قائم کیا جو پہلے سے اشتراکیوں کا اڈا تھا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں سوویت حکومت قائم کرلی گئی۔ جس کا دفتر کریملن میں بنایا گیا۔ زار روس نے کرائے کے آدمیوں سے ان پر قاتلانہ حملہ کرایا مگر وہ بچ گئے۔ تاہم بڑے چوکنے رہے کیونکہ ملکی سامراجیوں کے علاوہ غیرملکی مداخلت کار بھی ان کے تعاقب میں رہنے لگے تھے۔ تاہم اشتراکیوں کا پلہ بھاری رہا اور زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں سوویت اشتراکی جمہوریتوں کی یونین بن گئی۔ یہ لینن کی سب سے بڑی کامیابی تھی کیونکہ اب کسی طرف سے مخالفت کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ شدید کام اور ذہنی پریشانیوں نے قدرتی طور پر ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ وہ بیمار رہنے لگے۔ پھر بھی کام کرتے رہے۔ گورکی ایک صحت بخش مقام ہے۔ وہاں رہ کر انہوں نے اپنے منشور کا آخری حصہ مکمل کیا اور ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو اس جہان سے کوچ کردیا۔ ماسکو کے ریڈ اسکوئر میں ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ لیکن دفن کرنے کے بجائے ان کی نعش کو حنوط کرکے محفوظ کردیا گیا جس کی آج تک زیارت کی جاتی ہے۔

سمرقند یونیورسٹی میں

اس مختصر جائزے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ لینن کس قدر مخلص، بے لوث اور عملی انسان تھے۔ شاید وہ اسی مہم

کو سر کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔

میں نے کتاب بند کی اور فوراً دوبارہ تیار ہوکر باہر نکلا۔ ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب میرے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ سب سے پہلے سمرقند یونیورسٹی کے علاقے میں گیا۔ میں نے بڑی حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھا کہ تمام طالب علم — لڑکے اور لڑکیاں — اپنی جامعہ کی صفائی اور تزئین میں مصروف ہیں۔ بچیاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک یونیورسٹی کے چمنستانوں کو سنوار رہی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں پھاوڑے ہیں اور وہ زمین کو گود رہی ہیں۔ لڑکے نئے نئے پودے لا رہے ہیں اور بچیاں یہ پودے لگا رہی ہیں۔

بعض طلبہ گھاس پھونس کاٹ رہے اور صاف کررہے ہیں۔ بہت سے طلبہ اینٹ گارے کا کام کر رہے ہیں اور جہاں جہاں دیواریں شکستہ ہیں، ان کو بنارہے ہیں۔ میں نے بھی ایک اینٹ گارا لگا کر جمادی۔ طلبہ کو مجھ سے دو وجہ سے دلچسپی تھی۔ ایک تو میرا لباس ان کے لئے انوکھا اور دلچسپ تھا۔ بعض بچیوں نے ڈنڈوت کے انداز میں میرا خیر مقدم کیا، یہ سمجھ کر کہ میں بھارت سے آیا ہوا کوئی ہندو ہوں۔ بعض فرق محسوس کرکے سلام کرتی رہیں۔ میں ان سے ہاتھ ملاتا رہا اور وہ ہنس ہنس کر مجھے جواب دیتی رہیں۔ دل چسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے بعض طلبہ شاید وہ ہونگے جنھیں میں نے خطاب کیا تھا۔

ایک بار پھر میں نے ان طلبہ کے کردار اور عمل کا مقابلہ پاکستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ سے کیا۔ وہاں تعلیم

کو ایک جزو زندگی سمجھا جاتا ہے اور یہاں صرف دل لگی کا مشغلہ۔ وہاں اساتذہ کی عزت و احترام کا احساس اور یہاں اسکے برعکس جذبہ کار فرما ہے۔ وہاں کا ہر فارغ التحصیل طالب علم اپنے مضمون میں طاق ہوتا ہے اور یہاں ایسے کامیاب طلبہ صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

یہ دورہ ختم کرکے میں پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ میرے دل و دماغ بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ آج ہفتے کی وجہ سے چھٹی کا دن تھا۔ لینن کا یوم پیدائش بھی تھا۔ اس وجہ سے ملک میں تعمیر کی ہر قوت بیدار تھی۔ مزدور بلا معاوضہ معمول سے زیادہ کام کرنے کے لئے کمربستہ تھے۔ طلبہ یونیورسٹی کو صاف ستھرا بنانے میں منہمک تھے۔ ہوٹل کے ورکرز اور میدانوں کے کسان مستعدی سے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ میرے ہوٹل کا عملہ بھی آج بے حد چست تھا۔ کل میرے لئے پانی نایاب تھا اور آج ہر منٹ پر سروس ہورہی تھی۔ میں اس عظیم جذبے کی قدر کرتے ہوئے اپنے کمرے کی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوکر غور کرتا رہا کہ آخر روس میں ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ کس طرح موجزن ہوا۔ میں آنکھیں بند کرکے سوچ رہا تھا۔ میرے وطن پاکستان کا المیہ کتنا شدید تھا۔ میں جامعۂ سمرقند کے علاوہ جامعۂ دوشنبہ اور جامعۂ ماسکو میں گھوم پھر کر بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ میں نے کسی بھی جگہ یونیورسٹی کی دیواروں پر کوئی پوسٹر کسی کے خلاف نہیں دیکھا اور نہ کسی تحریر سے دیواروں کو بدنما پایا۔ اس کے برعکس جامعۂ کراچی کی کوئی دیوار و در ایسا نہیں ہے کہ جس پر کچھ نہ کچھ لکھا

ہوا نہ ہو۔ کراچی یونیورسٹی کے باغات بنجر علاقے کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور بے آب و گیاہ ہیں۔ اس کے بجائے آئے دن یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ طلبہ کی مختلف یونینوں میں باہمی فساد نہ ہوجائے یا کوئی طالب علم کسی استاد کی بے حرمتی نہ کر بیٹھے۔ یہاں تو پروفیسر صاحبان کجا، وائس چانسلر تک اہانت آمیز رویے سے بچ نہیں سکے۔ خدا کی پناہ۔

ہمدرد میں کام کرنے والوں کا تصور کرکے بھی شرم سی محسوس ہوئی۔ ہمدرد کے ورکر ہر وقت اس بات کے لئے آمادہ رہتے ہیں کہ ہمدرد کو تباہ کردیں۔ چوریاں بھی ہوتی ہیں۔ دواؤں میں شرارت سے ملاوٹ کر کے بھی نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ توڑ پھوڑ، گندگی اور غلاظت میں اضافہ، کام چوری، سینہ زوری، غنڈہ گردی، یہ سب کچھ ان کا معمول ہے اور درحقیقت پاکستان میں آج ہر محنت کش کا یہی دستور ہے۔ ان کے برعکس یہاں ہر ورکر آج لینن کے یوم پیدائش پر کوئی چھٹی نہیں کرتا، کام کرتا ہے، کیونکہ لینن بھی مجسمۂ عمل تھے۔ ہر ورکر دوسروں کا ہاتھ بٹاتا ہے اور تعمیر کی راہوں کو ہموار اور استوار کرتا ہے۔

میں اس زبردست فرق پر حیران تھا۔ ہمدرد کے ورکر اللہ کا نام لیتے اور نبی کا کلمہ پڑھتے ہیں اور ڈیوٹی کے اوقات کار میں سیرت کے جلسے منعقد کرتے ہیں۔ ان کے برعکس روس کے عام باشندے اللہ سے باغی سمجھے جاتے ہیں مگر لینن کے وفادار ہیں۔ ان کی تعلیم کے مطابق تعمیر و ترقی کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ ان کے جذبۂ صادق کو میں نے بہ چشم خود دیکھا اور ان کے ساتھ کام کرکے، ان کا ہاتھ بٹا کر ان کے دل کی دھڑکنوں کو

سنا ہے۔

تین بجے نماز ظہر ادا کرکے میں پھر اپنے ہوٹل سے نکل گیا اور سمرقند کے بازاروں میں چلا گیا۔ گورکی روڈ کے بعض حصے کھودے جارہے تھے اور ایسفالٹ کی کارپٹ ڈالی جارہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ورکرز مقامی زبان داں ہیں اور بعض اپنی ٹوپی سے تاجیکستانی لگتے ہیں۔ میں کھڑا ہوگیا، ان کا کام دیکھتا رہا۔ کس قدر تیزی کے ساتھ وہ مشینوں سے زمین ادھیڑ رہے تھے اور کس عجلت کے ساتھ وہ نیا تار کول آمیز مسالہ بچھا رہے تھے۔ آدھ گھنٹے میں سینکڑوں گز لمبی نئی سڑک بن گئی۔ میں ان کے قریب گیا۔ وہ بھی مجھے آدھ گھنٹے سے وہاں دیکھ رہے تھے۔ میں نے فارسی میں پوچھا کہ اگر آج لینن کا یوم پیدائش ہے تو آپ نے چھٹی کیوں نہیں کی؟

یہ سوال ان کے لئے انوکھا تھا۔ جواب دیا:

"آج بلاشبہ یوم لینن ہے، اس لئے یہ یوم تعمیر و تزئین ہے۔ ہم سب آج تعمیر وطن میں حصہ لے رہے ہیں"۔

پھر میں نے پوچھا:

"آپ کو آج کتنی اجرت ملیگی۔ چونکہ چھٹی کا دن ہے، اس لئے شاید دوگنی یا تین گنی اجرت ملیگی۔ یہاں کا قاعدہ کیا ہے؟"

سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا:

"اجرت کیسی! ہم تو آج بلا معاوضہ کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنے وطن کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہمارے محبوب رہنما لینن نے اپنی خدمات کا کوئی

معاوضہ قوم سے نہیں لیا تھا ۔ ہمیں بھی کوئی حق نہیں ہے ''۔

میں اس سے زیادہ ان سے بات نہ کرسکا ۔ بیشتر ازبکی تھے ۔ ان کو تاجیکی فارسی سے زیادہ مس نہیں تھا ۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر عبداللہ صاحب کو ساتھ لے لوں ۔ مگر پھر فیصلہ کیا کہ نہیں ۔ مجھے خود ہی اکیلے جائزہ لینا چاہئے ۔

میں سڑک سے ہٹ کر ریشم روڈ پر چلا گیا ۔ یہ وہی سڑک ہے جو تاریخ میں شاہراہ ریشم کہلاتی ہے اور جو کاروانوں کے لئے مخصوص تھی ۔ چین، برصغیر اور مغرب کے مابین اس پر چل کر تجارت ہوتی تھی ۔ اب اس کا نام بدل کر لینن روڈ رکھ دیا گیا ہے ۔ اس سڑک کے دونوں طرف دکانیں ہیں ۔ سب کھلی ہوئی تھیں ۔ کام جاری تھا ۔ میں ایک اسٹور میں گھس گیا ۔ یہ ڈبل روٹی، کیک ، پیسٹری وغیرہ کی دکان تھی ۔ میں نے پوچھا کہ ''آج تو چھٹی کا دن ہے ۔ پھر آپ کاروبار کیوں کرتے ہیں ''؟

دکان دار نے مسکرا کر جواب دیا :

''آج میرے تمام ورکر کام پر ہیں ۔ وہ بلا معاوضہ کام کر رہے ہیں ۔ میں ان کا معاوضہ حساب لگا کر جمع کرونگا اور حکومت کے خزانے میں داخل کردونگا جو رفاہ عام کے لئے ہے ''۔

پھر میں نے سوال کیا :

''آپ کو کیسے یقین ہے کہ جو رقم دی جائیگی ، وہ سب کی سب قومی کام پر صرف ہوگی ''؟

دکاندار نے مجھے غور سے دیکھ کر بے رخی سے جواب دیا :

''یہ سوال روس میں بے معنی سا ہے ۔ یہاں جو کہا جاتا ہے ، وہی کیا جاتا ہے ۔ ہم کو سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ رپے کا نا جائز مصرف نہیں ہوگا ''۔

میں جگہ جگہ گھوم پھر کر پانچ بجے ہوٹل واپس آگیا اور ہوٹل کے باہر ایک بنچ پر آکر بیٹھ گیا ۔ میری فکر میں تلاطم برپا تھا ۔ میں حیران تھا ۔ معاً میرے ذہن میں اپنے قائد اعظم کا یوم پیدائش آگیا ۔ ہم تو پاکستان میں اس دن داد عیش دیتے ہیں ۔ ہمارا ورکر تو چاہتا ہے کہ قائد اعظم تو کیا جو بھی بڑا مرگیا ہے ، اس کا یوم وفات اور یوم ولادت ، دونوں پر چھٹیاں منائیں اور کام ہرگز نہ کریں ۔ اب تو محرم کی بھی تعطیلات دو ہوگئی ہیں ۔ اور اب تو آغا خان کا یوم پیدائش بھی تعطیل میں بدل گیا ہے ۔ دونوں مقامات کے انداز فکر میں کتنا فرق ہے ۔ کیا یہ فرق کمیونزم ، سوشلزم اور اسلام کے مابین پیدا ہوا ہے ، یہ پہلو قابل غور ہے ۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں اور ہماری بے فکریوں اور بے عملیوں کی ہمیں اب زیادہ سزا نہ دیں ۔ ورنہ ہمارا رہا سہا ایمان متزلزل ہوجائیگا ۔

قبروں پر قرآن خوانی

''سمرقند گردی'' سے واپس آتے ہوئے میں ایک پرانے مقبرے میں داخل ہوگیا جو ہوٹل کے عین پیچھے واقع ہے ۔ اندر گیا ۔ آثار بتا رہے تھے کہ کوئی بزرگ دفن ہیں ۔ ان کے آس پاس اور قبریں بھی تھیں ۔ ادھر میں داخل ہو رہا تھا اور ادھر ایک خاندان ، جو باپ ، ماں ، بیٹا ، بیٹی ، پوتا یا نواسہ پر

مشتمل تھا ، داخل ہوا ۔ وھاں دو تاجیکی یا ازبکی نوجوان پہلے سے موجود تھے جو قبروں پر لگے ہوئے کتبے پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ یہاں میں نے ایک بزرگ مجاور کو بھی دیکھا ۔

میں نے بھی وہ کتبے پڑھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا ۔ پھر میں نے تمام اھل قبور کے لئے فرداً فرداً قران خوانی کی ۔ میں اس محویت سے بیدار ھوا تو میں نے دیکھا کہ تاجیکی باپ مجاور بزرگ کے پاس بیٹھا ھے اور قریب ھی اس کی نوخیز بیٹی اکڑوں بیھٹی ھے ۔ سب مل کر فاتحہ خوانی کر رہے تھے ۔ اس منظر کو میں نے بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھا ۔ اس خاندان کے باقی افراد نے فاتحہ خوانی میں حصہ نہیں لیا ۔ باپ نے مجاور کو کچھ نذرانہ دینا چاھا جسے اس نے خاصے تامل سے قبول کیا ۔ اس ''قبول و ایجاب،، کو دو نوجوان ازبکی حیرت سے دیکھ رہے تھے ۔ میرا دراز دست دعا بھی ان کے لئے ضرور وجہ٫ حیرت تھا ۔

حلقۂ دام خیال میں

صبح سے شام تک ''سمرقند گردی،، کر کے میں ہوٹل سمرقند کے باھر بچھی ہوئی ایک بنچ پر آکر بیٹھ گیا ۔ موسم خاصا سرد تھا ۔ اندر عافیت تھی مگر میرا مطالعہ ھنوز پورا نہ ھوا تھا ۔ میں اب ان عورتوں اور مردوں کو دیکھ رہا تھا کہ جو اپنے فرائض ادا کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے ۔ میں نے ان کی چال میں نصرت دیکھی اور ان کے چھروں پر فتح مندی کے آثار تھے ۔ ان کی آپس کی گفت گوؤں میں اطمینان تھا ۔ ان کی فتح و نصرت درحقیقت ان کی تعمیر وطن کی جد و جھد کا نشان تھی ۔ آج چھٹی کے دن وہ تعمیر وطن کے جذبے سے سرشار ھو کر

صبح سے شام تک کام کر کے آئے تھے اور ان کو یہ فخر حاصل تھا کہ انھوں نے اپنے فرائض خلوص و خوبی کے ساتھ انجام دئے تھے اور آج کی اپنی تنخواہ اس سرکاری فنڈ میں دی تھی کہ جس پر ان کو یقین کامل تھا کہ وہ تعمیر و ترقی اور فلاح و خیر کے کاموں پر صرف ھوگی ۔

درحقیقت یہی وہ یقین ھے کہ جو ان کو تعمیر پر ابھارتا ھے اور ترقی اور جد و جھد کے لئے تیار کرتا ھے اور ایثار کا جذبہ عطا کرتا ھے ۔ واقعہ یہ ھے کہ تعمیر وطن کے لئے حقوق و فرائض کے ساتھ دیانت و امانت کا مقام بہت بلند ھے ۔ جس معاشرے میں یہ خوبیاں پیدا ھوجائیں ، اس کی فتح مندی میں شک ھے نہ شبہ ۔

میں سوچ میں غرق تھا ۔ میرے سامنے صبح سے شام تک کی ھر ھر چیز ابھر کر آرھی تھی ۔ میں نے دیکھا کہ ھوٹل کے کارکن اپنے ھوٹل کی تعمیر پر لگے ھوئے ھیں ۔ عورت اور مرد صفائی میں مصروف ھیں اور بعض نازک ھاتھ ھوٹل کے باھر کیاریوں میں نئے پھول لگا رہے ھیں ۔ خود میں نے بھی تو ان کا ھاتھ بٹایا تھا ۔ چکنی مٹی تو میں نے اٹھا اٹھا کر ان کو دی تھی ۔

پھر میرے سامنے جامعہ٫ سمرقند کا نقشہ آگیا ۔ دس ھزار طلبہ اور طالبات اپنی جامعہ کی صفائی اور درستی میں ھمہ تن مصروف تھے ۔ باغات کو سنوار رہے تھے اور نئے پودے لگا رہے تھے ۔ جامعہ سمرقند کی آج ھر ھر چیز صاف ستھری تھی ۔ پھر میں نے جامعہ٫ کراچی کا نقشہ اپنی نگاھوں سے دیکھا کہ یہاں کوئی دیوار بے داغ نہیں ھے اور ھر سلوگن ایک وجہ فکر بنا

ہوا ہے۔ کیسے کیسے سلوگن میں نے وہاں دیکھے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ سگریٹ ساز کمپنیاں جامعۂ کراچی میں اپنی تشہیر کر رہی ہیں۔ طلبہ ہنگاموں میں مصروف ہیں اور ان کے ہنگاموں کی کہانیاں سر افتخار کو جھکا رہی ہیں۔

میں نے دیکھا کہ سمرقند کی ایک فیکٹری میں آج مزدور دو گنا کام کر رہے ہیں۔ وہ دوگنا کام اس لئے کر رہے ہیں کہ تعمیر وطن کے جذبے نے ان کے دل و دماغ کو مسحور کردیا ہے۔ پھر میرے سامنے اچانک حالات وطن آگئے۔ میں نے دیکھا کہ یہاں ہر مزدور تخریب پر لگا ہوا ہے۔ کام کرنا اس کی عادت نہیں رہی ہے۔ فساد و شر اس کی خصلت ہے۔ اس نے اللہ اور رسول کے احکامات کو یکسر نظر انداز کرکے رکھ دیا ہے۔ کام چوری، سینہ زوری اس کا مزاج ہے۔ شاید پاکستان کی ہر فیکٹری کا حال یہی ہے۔ آج بڑے بڑے ادارے دم توڑ رہے ہیں۔ بڑے بڑے صنعت کار اپنی فیکٹریاں فروخت کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے ہنر مند بیکار پڑے ہیں۔ چنانچہ میرا ذہن ملک کی اقتصادی اور معاشی زبوں حالی کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس میں اخلاق و کردار کا کس درجہ فقدان ہے۔ پاکستان آج محتاج ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ وہ اپنے وسائل و ذرائع سے کام نہیں لے سکتا۔

وہ لوگ جو پانچ سال حکومت کر گئے، ان کا مزاج یہ تھا کہ انھوں نے پاکستان کی صنعتی سر بلندی کو سر نگوں کردیا ہے۔ وہ اس پر فخر کرتے تھے۔ اس حکومت کو یہ اطمینان تھا کہ اس نے حکومت کی صحت کو تباہ کردیا ہے۔ اس صورت حال

کے ذمہ دار وہ خود بھی ہیں اور بیرونی طاقتیں بھی، جو پسند نہیں کرتیں کہ پاکستان خوش حال ہو۔ میرے نزدیک جب تک اس صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ نہ لیا جائیگا اور یہاں جزا و سزا کو پوری طاقت سے نافذ نہیں کیا جائیگا، نہ پیداوار بڑھیگی اور نہ ہماری اقتصادی بد حالی خوش حالی میں بدلیگی۔

ایک گھنٹہ ہوٹل کے باہر بنچ پر تنہا بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا۔ سینکڑوں مردوں اور عورتوں کا سامنے سے گزر ہوا۔ بچیوں کے لباس اب اسکرٹ میں بدل رہے تھے۔ بعض بچیاں کچھ شرما رہی تھیں۔ ان کے حیدر آبادی پاجاموں کے پائنچے کم ہو رہے تھے اور پنڈلیاں کھلنے لگی تھیں۔ شاید اب سے پانچ چھ سال بعد سب پاجامے ختم کردیں اور اسکرٹ ان کی جگہ لے لیں۔ بچوں میں ٹائی کا استعمال ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ پرانی عورتوں نے بھی اپنی وضع قطع کو قائم رکھا ہے۔ لمبی قمیضیں، حیدر آبادی پاجامے، سر پر تاجیکی ٹوپی اور اس پر رومال رنگین۔ بعض مرد روئی کا کوٹ اب بھی پہنے ہوئے تھے۔ کوئی جوان اس میں نظر نہیں آیا۔

ایک بچہ شرارت کرتا گزر رہا تھا۔ بارش کا پانی جو جگہ جگہ جمع ہوگیا تھا، وہ اس پر پیر مار مار کر "چھپ چھپ" سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ میں اس سے اس طرح دل چسپی لے رہا تھا جس طرح دور کھڑی ماں اس کی پیاری حرکت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب نے میری محویت کو توڑ دیا۔

”استاد ! آئیے، ذرا سا کھانا کھالیں “۔

میں نے کہا :

”صبح جو ناشتہ کیا ہے ، وہ کل تک کے لئے کافی ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہوائی جہاز میں کھانا اچھا رہیگا“۔

ماسکو کیلئے سفر واپسی

میں تو اپنے کمرے میں سامان صبح ہی تیار کرچکا تھا۔ سب کے ساتھ میرا سامان بھی باہر آ گیا۔ دو موٹروں میں ہمارا باقی قافلہ ہوائی میدان کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سارے انتظامات وی آئی پی (VIP) انداز سے ہوئے۔ جہاز ۷ بج کر ۲۰ منٹ کے بجائے ۷ بج کر ۵۰ منٹ پر روانہ ہوگیا۔ اب پھر ہماری منزل ماسکو تھی۔

ہوائی میدان پر ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب اور ڈاکٹر پروفیسر مرادوف صاحب کو میں نے خدا حافظ کہا۔ میں ان کے خلوص کار اور اظہار محبت سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ ان سے جدائی بڑی شاق گزری۔ وہ بھی دل گرفتہ تھے۔ میں نے جہاز میں بیٹھتے وقت کہا :

”میری شیر خواری نہ بھولئے گا “۔

عبداللہ جان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

ہوائی جہاز میں داخل ہوکر میں نے سوچا کہ ۵ گھنٹے اور ۲۰ منٹ کی پرواز ہے۔ لاؤ، مثانہ خالی کرلوں تاکہ درمیان میں اٹھنا نہ پڑے۔ جہاز کے غسل خانے میں روشنی نہ تھی۔

میں نے اندازے سے پیشاب کرلیا۔ جھکنے پر میری جیب سے میری عینک پھسلی اور گٹر میں جا گری اور پھر ایک ”تڑاخ“ کی آواز آئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ گٹر کے پنکھے نے اسے پاش پاش کردیا ہے۔ عینک کا نقصان زندگی میں پہلا حادثہ تھا۔ ۱۹۳۳ء سے میں عینک پہن رہا ہوں۔ میں نے اپنی عینک آج تک نہیں توڑی۔ جب نمبر بدلتا ہے تو میں صاف بے داغ شیشے اسی عینک ساز کو ہدیہ کردیتا ہوں۔

ہوائی جہاز کے چار پنکھے تھے۔ جب وہ ایک ساتھ چلے تو کانوں میں شور ہوگیا۔ اس شور میں لکھنا تو کیا ہوسکتا تھا، میں نے مسعود مفتی کی کتاب ”ریزے“ نکال لی اور ماسکو تک پہنچتے پہنچتے اسے ختم کردیا۔ مشرقی پاکستان کے حادثے کی بڑی حیرت انگیز افسانوی داستان قلم بند کی گئی ہے۔

جہاز میں کھانا ملا۔ تفصیل قابل غور ہے۔

ایک بوٹی، زیادہ سے زیادہ تین تولے وزن کی۔ ایک مچھلی کا ٹکڑا، زیادہ سے زیادہ دو تولے وزن کا۔ ڈبل روٹی کا آدھا سلائس۔ ایک نان خطائی۔ چاول ابلے ہوئے، بڑی مشکل سے دو تولے۔

اندرون ملک پروازوں میں روسی ہوائی جہاز پر یہ کھانا ملتا ہے۔ اس سادگی پر قربان جائیے۔ تعمیر اذہان اور تعمیر وطن کے انداز یہی ہوسکتے ہیں۔ فضول خرچیاں تعمیر کی راہ میں سم قاتل ہوتی ہیں۔ ہم اسی زہر سے پاکستان میں مر رہے ہیں۔ میں نے گوشت سے پرہیز کیا۔ ڈبل روٹی کا آدھا سلائس اور نان خطائی اور چاول صاف کردئیے۔

رات ماسکو وقت کے مطابق ۱۱ بج کر ۳۰ منٹ پر ہم ۵ گھنٹہ ۳۰ منٹ اڑنے کے بعد اترے۔ سامان آتے آتے کافی دیر ہوئی۔ پھر ہوائی میدان شہر سے ٦٦ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہوٹل پیکنگ پہنچے تو رات کے پونے دو بجے تھے۔ مادام مریم سلگانگ نے ہمارے قیام کا انتظام کیا اور ہمیں کمروں میں بٹھا کر وہ روانہ ہوگئیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ رسولی اور میں قریب قریب کے کمروں میں ٹھہرائے گئے۔ میرا کمرہ نمبر ٦٢٠ تھا۔

مختلف حالات پر غور کرتے رہنے سے نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ لہذا کافی دیر کچھ لکھتا، کچھ پڑھتا رہا۔ صبح کوئی تین بجے سوگیا اور پانچ بجے بیدار ہوگیا۔ یہ ہمیشہ سے میرا معمول رہا ہے کہ خواہ کتنی ہی دیر میں سوؤں، صبح کو مقررہ وقت پر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ نماز فجر ادا کی، وظیفہ پڑھا اور پھر تیار ہوکر میز پر بیٹھ گیا۔ جو کچھ رات کو لکھا تھا، اس پر نظر ثانی کی گئی۔ طبیعت پر کچھ بوجھ سا تھا، کیونکہ ہوائی جہاز کے سفر میں ماحول اچھا نہ تھا۔ روشنی ناکافی تھی۔ ہیڈ لائٹ شاید خراب ہوگئی تھی، جل نہیں رہی تھی۔ چار پنکھے والے انجنوں کا شور تھا۔ اسی لئے جہاز میں اپنی عادت کے مطابق کچھ لکھ نہیں سکا تھا۔ بہر نوع اس کمی کو پورا کرلیا گیا تھا۔

رات ہوائی جہاز میں روسی اخباری ایجنسی کے ایک نمائندے نے انٹرویو کی درخواست کی تھی۔ میں اچھے موڈ میں تھا، حالانکہ عینک کے حادثے کا دل پر اثر تھا، تاہم میں نے ایک اچھا انٹرویو دیدیا۔ نامہ نگار صاحب اپنے ڈھب پر لانے کے

لئے کافی کوشاں رہے مگر میں نے علم و ثقافت، ادب اور سائنس کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اب دیکھئے کہ یہ بزرگ کیا رپورٹنگ کرتے ہیں۔ شاید غیر محتاط نہ ہونگے اور جو باتیں کہی ہیں، وہی لکھیں گے۔

نو بجے صبح محترمہ بیگم سفیر پاکستان، روح افزا بیگم صاحبہ کا ٹیلے فون آیا۔ ویسے صبح ہی پیغام مل گیا تھا کہ آج ایک بجے ان کے ہاں لنچ ہے۔ میں نے محترمہ کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ ضرور آؤنگا۔ انہوں نے بتایا کہ جناب فیض احمد فیض صاحب کو بھی دعوت دیدی گئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک بجے موٹر بھجوائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کا گھر تو میرے پیکنگ ہوٹل سے صرف چار منٹ کے پیدل فاصلے پر ہے، میں خود ہی آجاؤنگا، مگر موٹر کے لئے ان کا اصرار رہا۔

پروفیسر گونکوفسکی کے شاگرد رشید ڈاکٹر سرگے ٹیلے فون کرکے ملنے آئے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں یہ ہی میرے مترجم تھے اور بڑے بھولے۔ ان کا نیا تجربہ تھا، غلطیاں کرتے تھے اور ڈرتے تھے۔ مجھے سرگے سے بیٹے کی طرح محبت ہوگئی۔ سال ڈیڑھ سال بعد سرگے نے مجھے لکھا کہ میں نے ڈاکٹریٹ کرلی ہے۔ میں نے بڑی پرجوش مبارک باد دی۔ سرگے میرے لئے سماوار کا بڑا خوب صورت ننھا سا تحفہ لائے تھے۔ میں نے بہت دیر ان سے باتیں کیں۔ یہ لڑکا بہت پیارا ہے، میں اس سے باتیں کررہا تھا کہ اتنے میں محترمہ مارگریٹا پاؤلانا بھی آگئیں۔ میں نے سرگے کا تعارف کرایا۔ ”یہ میرا بیٹا ہے“۔ وہ بہت ہنسیں۔ واقعی سرگے کو میں بیٹے کی طرح چاہتا ہوں۔

ریٹا سے پتہ چلا کہ جناب فیض صاحب بھی اسی هوٹل کی ساتویں منزل پر مقیم ھیں۔ اطمینان ھوا۔ میں نے اس سفر کی تصاویر ریٹا اور سرگے کو دکھائیں۔ ان میں سے دو تصاویر انھوں نے مجھ سے لے لیں۔ میں نے بہ خوشی ان کو دیدیں۔ میں نے اپنے لکھے ھوئے صفحات تاثرات روس پر صفحات کے نمبر ڈالے تو پتہ چلا کہ اب تک ۱۳۸ صفحات لکھے جاچکے ھیں۔ مجھے خود تعجب ھوا کہ اتنے صفحات کیسے لکھ لئے گئے۔

سوا بارہ بجے ڈاکٹر سرگے چلے گئے۔ میں نے پروفیسر گونکوفسکی کو احترامات ان کی معرفت بھجوائے۔ وہ اس وقت ماسکو میں نہیں ھیں۔ میں نے ان کو یہ پیغام بھی دلوا دیا ھے کہ میں ، سعدیہ اور مسز ڈسلوا کے ساتھ ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کو ماسکو دو دن کے لئے آؤنگا اور ۱۸ اگست کو کسی وقت صوفیہ (بلغاریہ) چلا جاؤنگا۔

روس میں سفیر پاکستان محترم جناب سجاد حیدر صاحب بڑے مخلص انسان ھیں۔ میں اور جناب فیض احمد فیض صاحب ان کی فرستادہ مرسیڈیز میں سفارت خانے پہنچے تو انھوں نے پرجوش خیر مقدم کیا۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں ان سے ملاقات ھوئی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ میں اور جمیل الدین عالی صاحب بے یار و مددگار ماسکو کے ھوائی میدان سے سفارت خانے پہنچے۔ تفصیل تو لکھ چکا ھوں۔ قند مکرر کے طور پر ان واقعات کی یاد تازہ کی جارھی ھے۔ اس وقت رمضان کا مہینہ تھا اور دن تھا ھفتہ کا۔ اسلئے تعطیل تھی۔ ھمارے میزبانوں کو ھماری آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی اور نہ وزارت تعلیم ھی نے سفارت خانے

کو کوئی اطلاع دی تھی۔ ھم دونوں کے پاس تیس تیس ڈالر تھے۔ اب کیا کریں اور کہاں ٹھیریں۔ اس وقت جناب سجاد حیدر صاحب نے سارے انتظامات کردئے تھے۔ ان کا یہ احسان اب تک یاد ھے اور ھمیشہ یاد رھیگا۔ آج ان کے ھاں آیا تو ان کے خلوص کی پچھلی یادیں تازہ ھوگئیں۔ محترمہ بیگم صاحبہ اور ان کی بچی رانی بھی تھیں۔ ھم نے بڑی دلچسپ باتیں کیں اور بڑا مزیدار کھانا کھایا۔

پاکستان کی سیاست بہر حال زیر غور آیا ھی کرتی ھے۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اپنی رائے ظاھر کی۔ خلاصہ یہ ھے:

(۱) جنرل ضیاء الحق صاحب مخلص ھیں اور وہ طاقت میں رہ کر حالات کو واقعی درست کرنا چاھتے ھیں۔

(۲) جنرل صاحب ایک قومی حکومت کی تشکیل بہر حال چاھتے ھیں اور میرا اندازہ یہ ھے کہ وہ ۵ مئی ۱۹۷۸ء تک ایک قومی حکومت کی تشکیل کا کام مکمل کرلینگے۔

(۳) قومی حکومت میں ، میری رائے ھے کہ بیگم نسیم ولی خان شرکت کرینگی۔ (میں نے ان کو صحت کا محکمہ دیدیا ھے) نوابزادہ نصراللہ خان کی پارٹی ، کیا پدی ، کیا پدی کا شوربہ۔ مفتی محمود صاحب کو ، مجھے یقین ھے کہ مولانا کوثر نیازی صاحب رام کرلیں گے اور ان کی یہ شرط نرم ھوجائیگی کہ حکومت میں پیپلز پارٹی کے ساتھ وہ

کام نہیں کرینگے ۔ جماعت اور نورانی میاں موقع کی تلاش میں ھیں ۔ گو پروفیسر غفور صاحب کی راہ میں فاروقی صاحب آئیں گے ۔ خاکساروں کی پروا جنرل صاحب نہیں کرینگے اور ھوسکتا ھے کہ قومی حکومت میں جو پارٹی بھی شرکت سے گریز کرے، اسے نظر انداز کردیا جائے ۔

(۴) میری حتمی رائے یہ ھے کہ آج انتخابات کے لئے حالات ھرگز ساز گار نہیں ھیں اور ان حالات میں انتخابات کرانا غلط ھوگا ۔ اس لئے مجھے جنرل صاحب سے اتفاق رائے ھے ۔ مگر میں قومی حکومت کے حق میں نہیں ھوں ۔ میری رائے میں جنرل ضیاء الحق کو اسلامی شوریٰ قائم کرنی چاھئے ۔

(۵) میری رائے میں فوج میں اندرونی خلفشار سے بچنے کے لئے **ایک** قومی حکومت کی تشکیل میں بڑی عجلت سے کام لیا جائے گا ورنہ تبدیلیٔ قیادت عسکری کے خطرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

چار بجے انجمن مصنفین روس کی جانب سے موٹر آگئی ۔ مترجم مارگریٹا بھی آگئیں ۔ میں ان کے ساتھ ماسکو میں روسی تعمیر و ترقی کی مستقل نمائش دیکھنے گیا ۔ حکومت روس نے انقلاب اکتوبر کے بعد جس جس میدان میں کام کیا ھے اور تعمیری جد و جہد کی ھے ، یہ نمائش اس کی مظہر ھے ۔ یہ اس درجہ بڑی نمائش گاہ مستقل ھے کہ اس کو مکمل طور پر دیکھنے کے لئے مہینہ

بھر درکار ھوگا ۔ میں نے سرسری طور پر **ایک** ھال خلاء سے متعلق دیکھا ۔ اس میں صرف نظر ڈالنے میں دو گھنٹے لگے ۔ افسوس ھے کہ طب و صحت کا ھال زیر ترتیب تھا ۔ اس نمائش گاہ میں درجنوں عظیم ھال ھیں، زراعت، صنعت ، آب رسانی ، خلاء نوردی، الیکٹرونکس، روسی پرندوں کی نمائش، سرکس، تھیئٹر ، تیرنے کے تالاب ۔ غرض ھر وہ کام کہ جو پندرہ ریاستوں میں ھو رھا ھے، اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ھے ۔ میں نے اس نمائش کو بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا اور داد دی کہ اقوام و ملل ، کہ جو اپنی تعمیر و ترقی کو مقصد بناتی ھیں، ان کے جشن ایسے ھی ھوتے ھیں ۔

آج دو گھنٹے ماسکو کے بازاروں میں موٹر میں گھوما ۔ سڑکوں کے نام اپنے قومی رھنماؤں کے نام پر رکھے گئے ھیں ۔ بڑے بڑے میدان کسی نہ کسی شخصیت کے نام معنون ھیں ، خواہ وہ سیاسی ھو یا ادبی ۔ شعراء کے نام پر بہت سے اسکوئر ھیں ۔ میٹرو (ٹیوب) اسٹیشن بھی اکثریت کے ساتھ ادباؑ اور شعراء کے ناموں پر ھیں ۔

میں نے آج پیکنگ ھوٹل کے ریستوراں میں دعوت دی ۔ محترمہ مریم سلگانگ، جناب سبھاش صاحب (متعلقہ ماسکو ریڈیو) اور مارگریٹا مدعو تھیں ۔ انجمن مصنفین نے تیس روبل میری خوراک خرچ کے لئے مارگریٹا کو دئے تھے ۔ دس دن میں بس پانچ روبل ھی خرچ ھوئے ۔ ریٹا نے ۲۵ روبل میرے حوالے کرکے ۳۰ روبل کی رسید پر میرے دستخط کرائے ۔ میں نے واپس کرنے چاھے مگر فیض صاحب کا بھی مشورہ یہی تھا کہ واپس کرنے

مناسب نہیں۔ بارے یہ روبل اور مزید میرے ڈالر زیادہ سامان کا کرایہ دینے میں کام آگئے۔ غالباً ذرا سے زیادہ سامان کے ستر ڈالر لینا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ یہ رقم نہ ہوتی تو شاید فاضل سامان وہیں رہ جاتا اور پھر سفیر پاکستان کی وساطت سے اس کی وصولی ممکن ہوتی۔ غنیمت ہے کہ یہ ناگوار صورت پیدا نہیں ہوئی اور میں سامان ساتھ لے کر کراچی پہنچ گیا۔

اشاریہ

ڈ

ذ

ر

ز

ژ

س

غ

ف

ق

م